پھلاں دے رنگ کالے

فائزہ افتخار



پھلاں دے رنگ کالے

فائزہ افتخار

نام کتاب	....	پھلاں دے رنگ کالے
مصنفہ	....	فائزہ افتخار
ناشر	....	گل فراز احمد علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	....	محمد زاہد ملک
کمپوزنگ	....	عاصم/انیس احمد
سن اشاعت	....	اکتوبر 2011ء
قیمت	....	300/= روپے

......ملنے کے پتے......

ویلکم بک پورٹ
اُردو بازار، کراچی

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

انتساب!

اپنی پیاری بیٹی اسوہ

کے نام!

○

''پھلاں دے رنگ کالے'' میرے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور کی تحریر ہے اور میری پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ اس ناول کے بارے میں ایک دلچسپ بات بتاتی چلوں کہ اس کی کہانی، واقعات، سب بے شک فرضی ہیں مگر کردار تقریباً حقیقی۔ بسم اللہ جان، حضرتی، ڈاکٹر خوشنود، غث شنڈے، رحیم گل، ارباب خٹک...... یہ میرے بچپن کے بہت دیکھے بھالے کردار ہیں، جنہیں میں نے اس یقین کے ساتھ اس کہانی میں مدغم کیا ہے کہ یہ ناول ان کی نظروں سے کبھی گزرے گا ہی نہیں۔ ان میں سے بیشتر آنکھیں اب ابدی نیند سو چکی ہیں۔

دوسری اہم بات جو اس ناول کو میری نظروں میں اہم بناتی ہے، وہ یہ کہ اس سے قبل میں نے کبھی طویل تحریر لکھنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔ میں طبعاً رسکی نہیں ہوں اور کچھ کچھ سہل پسند بھی، لیکن اس کہانی نے خود اپنا آپ مجھ سے لکھوایا اور مجھ میں یہ اعتماد بھی پیدا کیا کہ اگر میں چاہوں تو خود پہ لگا سست اور سہل پسند کا لیبل اتار سکتی ہوں۔

اس ناول میں میرا سب سے پسندیدہ کردار ''مومنہ'' کا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے کردار کی ان تمام خوبیوں یا خصوصیات کو ٹھیک اس انداز میں قارئین تک پہنچا سکوں جس طرح انہوں نے مجھے متاثر کیا اور لکھنے پہ اکسایا۔

مجھ سے کہنے والوں نے اکثر پوچھا ہے کہ میری کہانیوں کا مرکزی کردار زیادہ تر مرد کیوں ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ایسا کبھی ارادتاً نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ میرے تخلیق کردہ کرداروں میں سب سے مضبوط اور تاثر انگیز کردار مردانہ ہوتے ہیں اور ان بہت سے کرداروں میں سے ایک ''عاشر ملک'' ہے۔ ''سارے گلاب لے جانا'' کا عاشر ملک۔

عاشر کوئی ماورائی کردار نہیں ہے، نہ ہی کوئی مثالی مرد۔ وہ اس معاشرے کا ایک عام مرد ہے۔ بہت سی ذہانت، وجاہت، کشش کے ساتھ ساتھ وہی روایتی فیلنگز رکھنے والا ایک مرد جو اپنے سے آگے کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔ بالخصوص کسی عورت کو...... جو رقابت کی آگ میں اپنے سگے رشتوں کو بھی بخشنے پہ تیار نہیں ہوتا۔

ایسا مرد جو عورت کی کسی لغزش کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ایسا مرد جو ''برتی'' ہوئی عورت کے بارے میں وہی فرسودہ نظریہ رکھتا ہے لیکن اس بہت عام سے مرد کے اندر کہیں ایک بہت خاص بات بھی موجود ہے جسے میں نے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

اور یہی عام سے خاص اور خاص تر بننے کا کیمیا ہے۔ یعنی خود احتسابی کا عمل، اس عمل سے گزر کے ہی عاشر ملک میری کہانی کا ہیرو بنا، ورنہ ابتدا سے اختتام سے ذرا پہلے تک اس کا عام ہونا جوں کا توں برقرار رہا۔

آپ کو یہ کردار عام لگتا ہے یا خاص، اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

میرے ناول ''پھلاں دے رنگ کالے'' کا نیا اضافہ شدہ ایڈیشن (بڑے سائز) جناب گل فراز احمد صاحب نے چھاپنے کا ذمہ لیا ہے۔

میرا یہ ناول کتابی شکل میں چھپ کر آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کس کردار کی کن صفات میں اپنی پسندیدگی پاتے ہیں۔

فائزہ افتخار

پھلاں دے رنگ کالے

کنگ ایڈورڈ کالج کی قدیم اور پر شکوہ عمارت کو اس نے حسرت بھری نظروں سے دیکھا......

''کاش...... کاش ان دیواروں سے میرا اپنے پن کا وہی رشتہ ہوتا جو گھر سے ہوتا ہے...... تب یہ دیواریں...... یہ دروازے مجھے روک لیتے...... میرے پیر سے لپٹ کے دہلیز مجھے خود سے پار نہ جانے دیتی...... مگر باقی سب کی طرح یہ در و دیوار بھی مجھ سے غیریت ہی برتتے ہیں...... سالوں کے ساتھ کے بعد بھی یہ عمارت میرے لیے ویسے ہی سرائے کی حیثیت رکھتی ہے جیسے وہ گھر...... وہ گھر جہاں میں جا رہی ہوں۔''

بیگ اٹھا کے بوجھل قدموں سے وہ باہر نکلی۔

ہر سال چھٹیوں میں گھر جاتے ہوئے اس کا دل ایسے ہی افسردہ اور بوجھل ہوتا تھا۔ باقی سب لڑکیوں کی طرح اس کا چہرہ اپنوں سے ملنے کی خوشی سے تمتماتا نہیں تھا۔ اوروں کی طرح گھر کی ٹھنڈی چھاؤں کا تصور کر کے وہ اطمینان بھری انگڑائی نہیں لیتی تھی بلکہ دل تھا کہ کسی ناگوار سے بوجھ کی طرح دبتا...... اور دبتا چلا جاتا۔

☆☆☆

کاش...... کاش...... یہ سفر طویل...... طویل تر ہوتا جائے۔

ڈائیوو کے خنک ماحول میں بیٹھی موٹر وے پر نظریں جمائے وہ چپکے سے دعا کر رہی تھی...... مگر ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر ساڑھے چھ گھنٹے کا ہی رہنا تھا۔

اس سے تو اچھا تھا میں شناور کے ساتھ پچھلے ہفتے ہی چلی جاتی...... کم از کم سفر کی کوفت اکیلے میں تو نہ اٹھانا پڑتی......

اس نے تنگ آ کر سوچا تھا۔ شناور نے تو اسے بہترا کہا تھا کہ چھٹیاں ہو گئی ہیں وہ اس کے ساتھ ہی پشاور چلی چلے...... لیکن وہ جانے کے نام سے ہی ایکدم گھبرا گئی تھی...... یہی سوچ کے رک گئی کہ بیالیس چھٹیوں میں سے جتنے دن بھی وہ اس گھر میں جانے سے بچ سکتی ہے...... بچ جائے۔ شناور اس سے ناراض ہو کے اسے سو سو باتیں سناتی چلی گئی تھی۔ وہ تو ویسے ہی مارے بندھے ہاسٹل میں رہتی تھی اوپر سے لاہور کی گرمی سے عاجز۔ اس لیے مقدس زریاب کی دوستی بھی اسے روک نہ سکی اور مقدس سہمے ہوئے انداز میں ہر روز ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو لوٹتی لڑکیوں کو دیکھتی رہی یہاں تک کہ ہاسٹل خالی ہو گیا اور اسے ڈائیوو کو فون کر کے اگلے دن کی بکنگ کرانی پڑی اور اب وہ جلتے بلتے دل سے یہی سوچ رہی تھی کہ چھ دن بعد بھی آنا تھا تو اسی دن شناور کے ساتھ آ جاتی۔

''چلو...... جو ہوا اچھا ہوا...... تکلیف دہ دنوں میں سے چھ دن تو کم ہوئے۔''

اس نے ایک گہرا سانس لے کر سر سیٹ کی پشت سے ٹکا لیا اور خود کو تسلیاں دے کر بہلانے لگی۔

''شناور کے ساتھ ہوتی تو سفر کی کوفت محسوس نہ ہوتی اور وقت اچھا اور جلدی کٹ جاتا...... اور میں یہی تو نہیں چاہتی کہ یہ سفر...... یہ وقت جلدی کٹے۔ کاش، کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہو کیونکہ اس سفر کے اختتام پر منزل نہیں، امتحان ہے۔''

اس نے ایک بار پھر چپکے سے دعا کی لیکن ہر دعا قبولیت کی معراج نہیں پاتی...... ٹھیک سات منٹ بعد وہ پشاور میں تھی۔

☆☆☆

پچھلے سال چھٹیوں میں وہ جو یادیں لے کر اس گھر سے رخصت ہوئی تھی...... وہی سرد رویے اس بار بھی اس کے استقبال کو موجود تھے۔

وہی بی بی جان کی برفیلی نیزے چبھوتی نگاہیں......

''سلام وعلیکم بی بی جان۔''

اس نے سرد ٹھٹھرتے لہجے میں انہیں سلام کیا...... ان کے سامنے آتے ہی اس کے محسوسات یونہی برف میں تبدیل ہو جایا کرتے تھے۔

''ہوں، وعلیکم۔''

اور وہاں تو صدیوں کے جمے گلیشیر تھے بغیر نظر اٹھائے پتھریلا سا جواب...... یہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے نظر اٹھا کے اپنی پوتی کو نہیں دیکھا تھا ورنہ ان کی نظریں مقدس کی کئی پہر کی بھوک اڑانے کے لیے کافی تھیں۔

نہ مقدس کے قدم ان کی جانب والہانہ انداز میں بڑھے تھے نہ بی بی جان کے بازو اسے دیکھ کے گرم جوشی سے وا ہوئے تھے۔

وہی تائی امی کا لاتعلق سا رویہ......

''کیسی ہیں تائی امی۔''

اس نے کچن کے دروازے پہ کھڑے ہو کر پوچھا تھا وہ خانساماں کو لنچ کے لیے ہدایات دینے میں اتنی مصروف تھیں کہ رک کر جواب دینے یا سوال کرنے والی کو دیکھنے تک کی زحمت تک نہیں کی۔

''باچا جان کے لیے یخنی، ساگودانہ...... بی بی جان کے لیے چنے کا ساگ اور باجرے کی روٹی ضرور بنانا۔ کل سے ان کا بہت جی چاہ رہا ہے اور بس انہی کے لیے بنانا۔ اور کوئی کھانا پسند نہیں کرتا ایسے کھانے...... مردانے کے لیے تیتر بھون لینا...... اور مصالحے والے کباب بھی...... زنانے میں دال گوشت اور کوئی سبزی...... ہاں پلاؤ دونوں جانب کے لیے اکٹھا ہی زیادہ سارا بنا لینا اور وہاں میٹھے میں......''

وہ کچھ دیر کھڑی زنانے اور مردانے کے کھانے کا مینیو سنتی رہی پھر یہ جانے بغیر آگے نکل گئی کہ میٹھے میں کیا کیا بننے والا ہے۔

''اور وہی چچی جان کا دھوپ چھاؤں سا مزاج۔''

''کون سی book پڑھی جا رہی ہے چچی جان۔''

ان کی مسکراہٹ اور شفیق سے انداز میں حال پوچھے جانے پر مقدس کی ہمت بڑھی تھی اور وہ دوستانہ انداز میں سوال کر بیٹھی۔

''ایک تو پتا نہیں یہ لڑکیاں کہاں رہ جاتی ہیں...... میں دیکھوں ذرا جا کے۔''

ماتھے پر بل لیے وہ book پٹخ کے اٹھیں اور وہ چوری بن کے ان کے کمرے سے نکلی۔

وہی کزنز کا گریز۔

اس نے گول کمرے سے جھانک کے دیکھا......سب کی سب خوش گپیوں اور چہلوں میں مصروف تھیں علاوہ شناور کے۔ کسی نے اسے دروازے پہ کھڑا پایا بھی ہوگا تو نوٹس نہ لیا ہوگا۔ اس نے جی بھر کے سب کے ظرف اور اپنے حوصلے کو آزمایا اور پھر اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔

اس بڑے سے گھر کا واحد کونا، جو اس کے لیے اور جس کے لیے وہ اجنبی نہیں تھے۔

☆☆☆

''کب آئی تم؟''

شناور اس سے دیر تک لپٹے رہنے کے بعد سوال کر رہی تھی۔

''شام کو۔''

''اوہ...... میں ذرا صدر تک گئی تھی...... مجھے بتا دیتی تم کہ آج آ رہی ہو تو میں نہ جاتی۔''

''آنا تو میں نے یہیں تھا تمہارے پاس...... تم مارکیٹ جاتی نہ جاتی کیا فرق پڑتا...... مل تو لیتے۔''

اس نے اپنے مخصوص سرد بے تکلف اکل کھرے لہجے میں کہا۔

''اف...... ایک تو یہ تمہاری بے مروتی اور بدلحاظی...... کسی کا دل رکھنے کے لیے ہی کہہ دیا کرو کہ تمہیں اس کا خیال ہے...... اس کی پرواہ ہے...... اس کی فکر ہے۔''

مقدس نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے رخ بدلا اور سوچنے لگی۔

''کون ہے جو میرا دل رکھنے کے لیے ہی مجھے کہتا ہے کہ اسے میرا خیال ہے...... میری پرواہ ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کھانا کھایا۔''

شناور کے سوال پہ وہ اپنے تصور سے نکلی

''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کئی دنوں سے نہیں کھایا، شکل دیکھو ذرا اپنی...... زرد ہو رہی ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے بھی ہیں۔''

وہ بڑی بوڑھیوں یا کسی اماں دادی کی طرح فکر مند ہوتے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے کہہ رہی تھی اور مقدس اپنے کچھ دیر پہلے کے خیالات یاد کر کے شرمندہ ہو رہی تھی۔

''سوری شناور......''

اس نے شناور کے برف ایسے سفید اور ملائم ہاتھ تھام کے شرمندگی اور محبت سے کہا۔

''سوری؟......مگر کس بات پر؟''

''ناشکری اور ناقدری پہ...... کتنی محبت کرتی ہو تم مجھ سے، کتنا خیال رکھتی ہو میرا اور میں ہوں کہ قدر ہی نہیں کرتی۔''

''محبوب ہمیشہ ناقدرا، ہرجائی اور روہ ہوتا ہے۔''

''وہ......''مقدس کی ہنسی بکھر گئی۔

''اور کیا...... وہ کیا کیا شعر ہوتے ہیں محبوباؤں کے نخروں اور کج ادائیوں پہ...... اور تمہیں میں نے کسی محبوبہ کی طرح ہی تو سر چڑھایا ہوا ہے۔

☆☆☆

''کچھ بھی ہے...... آخر ہو تو اس خاندان کا حصہ۔''

وہ اخبار ٹیبل سے اٹھاتے رکی تھی۔ کانوں میں بی بی جان کی نوکیلی آواز گونجی تھی۔

''جی''وہ سہم کر کے ایک جانب ہوگئی۔

''مگر خون میں ہی وفا اور لحاظ نہ ہو تو کوئی کیا کہے۔''

وہ اب بھی حیران تھی یہ سنگ باری کس لیے ہو رہی تھی اس کا پتا لگانے سے بھی قاصر تھی۔

''تم سے اتنا نہیں ہوا کہ صبح سے آئی ہو اپنے باچا جان کی طبیعت کے بارے میں ہی پوچھ لو۔''

وہ مرے مرے قدموں سے باچا جان کے کمرے کی جانب گئی...... بی بی جان کی نظریں اس کی پشت کو سلگا رہی تھیں۔

وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتی، باچا خان کو اسی طرح بستر پہ موت کی آہٹیں سنتے دیکھتی، کوئی نہ کوئی نرس ان کی ڈرپ چیک کر رہی ہوتی اور ان کی کوئی نہ کوئی بہو تبصرہ کر رہی ہوتی۔

''باچا جان اس بار بچتے نہیں لگتے، خدا خیر کرے۔''

اور خدا سالوں سے خیر کرتا آ رہا تھا اور باچا جان فالج...... ہارٹ اٹیک...... کینسر اور شوگر کے ہر ہر حملے کے بعد بچ جاتے تھے اور اگر کبھی طبیعت بہت زیادہ سنبھلی ہوتی تو زبان سے چند ٹوٹے ہوئے لفظ بھی ادا کر لیتے تھے۔ ورنہ فالج نے ان کا نچلا دھڑ تو مفلوج کیا ہی تھا قوت گویائی بھی متاثر کی تھی......

مقدس نے ان کا نحیف ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو کمرے میں ایک محسوس کی جانے والی حدت کے باوجود اسے خنکی کے احساس نے جھرجھری لینے پر مجبور کیا۔

باچا جان کے سپید زردی مائل استخوانی ہاتھوں میں نیلاہٹ اور سبزے کے امتزاج والی رگیں ابھری ہوئی تھیں جن میں سے اکثر سوئیوں کی وجہ سے خار خار تھیں۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں...... جھک کے اس نے باچا جان کے ہاتھ کی پشت پہ ہلکا سا بوسہ دیا۔

جانے کیا جادو کی سی تاثیر والا بوسہ تھا...... باچا جان کی کئی دن سے بند آنکھیں کھلیں۔ ان کے بجھتے دیئے کے سے پتلوں میں قمقمے سے بس

لمحے بھر کے لیے جگمگائے پھر ان کا ہاتھ لرزتا کانپتا مقدس کے سر کی جانب گیا۔

وہ اندر تک شانت ہوگئی۔

☆☆☆

اور یہ اسے گھر آئے تیسرا روز تھا۔ کوئی مانتا ہو یا نہ مانتا..... مگر اسی کے آنے سے..... اسی کے لمس نے باچا جان کو ایک بار زندگی کی طرف پھر سے لوٹا دیا تھا۔ گھر میں مہمانوں کا آنا جانا تھا۔ تایا جان افراسیاب خٹک بھی رات کی فلائیٹ سے اسلام آباد سے آئے تھے۔ ایک عجیب ہلچل اور رونق سی تھی..... جس کا حصہ وہ بہر حال نہیں تھی۔

''آج شاپنگ کے لیے نہیں گئی تم؟''

شناور کو کسلمندی سے بستر پر پڑے ٹانگیں ہلاتے دیکھ کے مقدس نے پوچھا تھا۔

''کس کے ساتھ جاؤں؟ کوئی ہلنے تک کو تیار نہیں۔''

''کیوں؟ کوئی خاص وجہ۔''

''اتنا اہم ایونٹ چھوڑ کے کوئی گھر سے نکلنے کو تیار نہیں ہے..... سسپنس کے مارے دم نکل جائے گا جو اس موقع پہ گھر سے باہر ہوگا۔''

''کوئی اہم میچ ہے کیا؟''

''نہیں..... باچا جان نے وکیل کو بلایا ہے..... اپنی وصیت تیار کروا رہے ہیں۔''

''تو؟'' وہ حیران ہوئی۔

''بس پاگل ہیں سب کے سب..... وہ عمر کے اس حصے اور صحت کے اس مرحلے میں ہیں کہ ان کو وصیت تیار کرانا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے۔''

''ہاں..... اور اس میں سسپنس والی بات کیا ہے۔ جائیداد وغیرہ تو قانونی طریقے سے ہی تقسیم ہوگی..... سب ہی جانتے ہیں شرعی اور قانونی لحاظ سے کس کا کتنا حصہ بنتا ہے اور رہا وہ خاندانی ترکہ تو یہ بھی سب کے علم میں ہے کہ روایت کے لحاظ سے وہ نسل در نسل خاندان کے بڑے بیٹے کو منتقل ہوتا آرہا ہے یعنی اب تایا جان اس کے امین ہیں۔''

''بس..... کیا کریں..... کہا نا..... پاگل ہیں سب کی سب۔''

☆☆☆

خاندان کے سب چیدہ چیدہ لوگ باچا جان کے کمرے میں تھے۔ وکیل وصیت پڑھ کے سنا رہا تھا اور سب کے چہروں کے رنگ بدل رہے تھے۔ آنکھوں میں تحیر اتر رہا تھا..... اور واحد باچا جان وہ تھے جن کے چہرے پہ اطمینان وکیل کے ایک ایک لفظ کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک اطمینان بھرا طویل سانس لیا۔ اپنی اکھڑی سانسوں اور ٹوٹے ہوئے الفاظ کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کیا اور بہت سکون

سے آنکھیں موند لیں۔

بہت دیر سے دھونکنی کی طرح چلتا ان کا سینہ اب ہموار سانسیں لے رہا تھا۔

مگر باقی سب کی سانسیں دھڑکیں سب کچھ اتھل پتھل ہو چکا تھا۔

پورے خٹک ہاؤس میں کہرام مچا تھا۔

☆☆☆

''یہ ایک غیر تحریری آئین تھا بی جان جس پہ ہمارا خاندان برسوں سے عمل کرتا آ رہا تھا۔ باچا جان نے اس کے خلاف جانے کا سوچا بھی کیسے؟''

افراسیاب خٹک بی بی جان کے سامنے پھنکارتے پھر رہے تھے۔ خود بی بی جان تاسف میں غرق تھیں۔ دوسرے کمرے میں دراب بے فکری سے اپنی گن کی صفائی کر رہے تھے اور ان کی نصف بہتران کے دماغ کے کل پرزوں کی صفائی میں مصروف تھیں۔

''بات صرف روپے پیسے کی نہیں ہے، وہ خاندانی ترکہ...... جو بزرگوں کی نشانیوں، نوادرات اور زیورات پر مشتمل ہے ہمیشہ سے خاندان کے بڑے بیٹے کا مقدر بنتا ہے۔ باچا جان نے جائیداد کی تقسیم تو غیر منصفانہ طریقے سے کی ہی ہے مگر یہ ورثہ بھائی صاحب کی بجائے مقدس کے نام کر کے بہت بڑی ناانصافی کی ہے۔''

''ہمارے نام تو کسی بھی صورت میں نہیں ہونا تھا پھر میں کیوں باچا جان کے خلاف جاؤں۔''

دراب خٹک کی بے فکری کا وہی عالم تھا۔

افراسیاب خٹک بی بی جان کے سامنے بھڑاس نکال کے اپنے کمرے میں آئے تو تائی جان سینہ پیٹ پیٹ کے واویلا کرتے ہوئے انہیں نئے سرے سے اشتعال دلانے لگیں۔

''ہماری اولاد کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے خان۔ وہ بھی پوتی ہے اور ہمارے بچوں سے بھی باچا جان کا وہی رشتہ ہے پھر اسے سب سے بڑھ کے کیوں اور وہ بھی ایسی پوتی جس کی حیثیت ہی اس خاندان میں مشکوک سمجھی جاتی ہے ہو کیا گیا ہے باچا جان کو......''

اور مقدس کو جب سے یہ پتا چلا تھا مارے دہشت اور خوف کے وہ کمرے سے ہی نہیں نکلی تھی کہ کہیں وہ سب مل اس کو چیر پھاڑ کے کھا نہ جائیں۔

نفرت، کراہت، گریز اور لاتعلقی کے وار تو وہ بچپن سے سہتی آ رہی تھی اب عداوت بھی اس کے نصیب میں لکھ دی گئی۔

☆☆☆

''واؤ، کتنی پیاری ہے ناں سمانتھا، بالکل سنڈریلا جیسی۔''

فارحہ نے لیٹ ایڈمیشن لینے والی اپنی فرنچ کلاس فیلو کو دیکھ کے کوئی چوتھی بار کہا۔ اس سے قبل وہ اسے دیکھ کے سنو وائٹ اور باربی ڈول کے خطاب بھی دے چکی تھی۔ یہ پشاور کا سب سے مشہور کانونٹ تھا جہاں اکثر ممالک کے سفارت کاروں کے بچے زیر تعلیم تھے۔

''سنڈریلا اتنی موٹی نہیں تھی، تم نے اسٹوری بک میں دیکھا نہیں کیا؟'' ریمانے چاکلیٹ سے چپکتے ہاتھ ٹشو سے پونچھتے ہوئے رشک و حسد کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ انگلش، جرمن، فرنچ فیملیز کے بچوں کو ملنے والی توجہ سے وہ اکثر جیلس رہتی۔

''اور کیا، وائٹ کمپلیکشن ہونے سے ہر کوئی سنو وائٹ نہیں ہو جاتا۔ ہماری مقدس سے زیادہ کیوٹ نہیں ہے وہ سمانتھا۔'' شناور ہمیشہ کی طرح اپنی فیورٹ کزن کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے گفتگو میں کھینچ لائی۔

''لیکن وہ فارنر ہے۔'' فاریہ اپنے پوائنٹ پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

''تو کیا ہوا؟'' شناور چبا چبا کے بولی۔ ''مقدس کی مدر بھی فارنر تھیں۔''

''رئیلی؟'' نوعمر کی بچیوں کا وہ پورا گروپ مارے ایکسائٹمنٹ کے چلا اٹھا۔ جب کہ خود مقدس حیرت سے گنگ بنی شناور اپنی پھوپھی زاد کو تکتی رہی۔ خود اس کی نوسالہ زندگی میں یہ پہلا انکشاف تھا اس کی ماں کے بارے میں۔

''آئی سوئیر، میں نے خود سنا ہے۔'' وہ مقدس کی طرف پلٹی۔

''یاد ہے جب ہم اسلام آباد بڑے ماموں کے ہاں گل ریز کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے گئے تھے، وہاں تناشا آپ کی اسکول فرینڈ بھی آئی تھیں انہوں نے آپی سے کہا کہ ویسے تو تم سبھی کزنز پریٹی ہو مگر اس لٹل گرل کے فیچرز بہت شارپ ہیں اور لک بھی انگلش ہے تب تانی آپی نے کہا کہ اس کی مدر یعنی ہماری آنٹی فارنر تھیں اور مما کہتی ہیں مقدس ہو بہو اپنی مدر جیسی ہے۔''

اور یہ تھا پہلا تعارف اس کا اپنی ماں سے، کتنا عجیب سا لگتا ہے کسی ایسی بچی کے بارے میں یہ سننا، جو آج کے الیکٹرانک دور میں میڈیا کی بدولت اپنی عمر سے دس گنا زیادہ میچور سوچ رکھتی ہو، جو ایک بھرے پرے خوش حال کنبے میں پرورش پا رہی ہو لیکن نو برس کی عمر میں پہلی بار اس نے اپنی ماں کا ذکر سنا ہو، چاہے اس کی ماں مر ہی کیوں نہ گئی ہو۔

شناور اس کی واحد دوست، جس کے قریب آنے کے واحد وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح ماں سے محروم تھی۔ لوریاں سننے کی عمر میں جب شناور اپنی ماں کے بارے میں فرضی قصے گھڑ کے سنایا کرتی کہ کل رات مما پریوں کے سنہری پر لگا کے کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آئیں اور مجھے ڈھیر سا پیار کر کے گئیں تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔

شناور کے پاس اس کا باپ تھا جو جب بیٹی سے ملنے آتا اپنی شریک حیات کی یادیں تازہ کرتا، نانی تھی جو نواسی کو گود میں بٹھا کے بیٹی کے بچپن کی شرارتیں سناتی اور ہنستے ہنستے رو پڑتی، ماں کی تصویر تھی جو اس کے بستر کے سرہانے پہ ایک دعا کی طرح آویزاں تھی۔ جب کہ اس کے پاس کیا تھا، ماں کی ہلکی سی شبیہ بھی نہیں تھی جس کے سہارے وہ اس کا سراپا تراشتی، نہ ہی باپ کی رفاقت جو اس سے اس کی ماں کی باتیں کرتا، نہ ہی ماں کے حوالے سے کوئی اور قریبی رشتے جو نواسی کے نقوش میں بیٹی کی پرچھائیں تلاشتے۔

اور اگر اس گھر کے مکین اس کی ماں کا نام تک نہیں لیتے، اسے مکمل فراموش کر چکے ہیں تو یہ کچھ ایسی حیرت کی بات نہیں۔ وہ ایک زندہ وجود لیے ہوئے بھی عالیشان گھر میں اپنے ہونے کا احساس دلانے میں ناکام ہے تو غیر موجود لوگوں کی بساط ہی کیا۔

مقدس زریاب نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد رشتوں کا ہجوم دیکھا، دل کا نہ سہی مگر خون کے رشتوں کا۔ چچا جان تھے جن کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا ویسے بھی وہ اپنی لاابالی فطرت کے تحت اپنے سگے بچوں تک کے زیادہ قریب نہ تھے، وہ اور ان کی زمینیں، ان کی بڑی بڑی مونچھوں اور لمبی لمبی گن رکھنے والے دوست، تاش اور شکار کی محفلیں، گھر میں وہ کم ہی ٹکتے یا پھر اکثر سوئے ہوئے پائے جاتے۔ ان کی پڑھی لکھی اور گھر کے گھٹے ماحول سے سدا کی بیزار بیگم، چچی جان جو بے حد موڈی سی تھیں، کبھی تو اپنے بچوں کے ہجوم میں اس کا اور شناور کا بے ضرر سا وجود انہیں بے طرح کھلتا، بلاوجہ چڑ جاتیں وہ ان دونوں کی موجودگی سے اور خصوصاً اس کے سامنے تو دبا دبا سا اظہار بھی کر دیتیں کہ اس سے زیادہ کھل کر بد تہذیب ہونے کی ان کی تعلیم اجازت نہیں دیتی تھی البتہ شناور کو بی بی جان یعنی اس کی سگی نانی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کے سامنے وہ محتاط ہی

رہتیں۔ کبھی کبھی محض بی بی جان اور ان کی لاڈلی نواسی کی چڑ میں مقدس پہ خاصی مہربان بھی ہو جاتیں۔ جو بھی تھا بہر حال انہوں نے محبت وشفقت کے نام پہ نہ سہی، انسانیت اور خدا ترسی کے حوالے سے دونوں لڑکیوں کا مقدور بھر خیال ضرور رکھا۔

باچا جان سدا کے بیمار، اس نے ہوش سنبھالتے ہی انہیں بستر سنبھالتے دیکھا کبھی کبھی تو وہ اس قدر بیمار پڑ جاتے کہ سارا خاندان اکٹھا ہو جاتا، کئی اہم تقریبات ملتوی ہو جاتیں، کئی ضروری کام التواء میں ڈال دیئے جاتے اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں خدانخواستہ...... لیکن بڑی سے بڑی تکلیف کے بعد باچا جان بھلے چنگے ہو جاتے، ویسے بھلے چنگے کہنا تو غلط ہو گا یوں کہیں موت کو ٹال کے واپس آ جاتے۔ انہیں اپنے کمرے سے نکلے کئی برس بیت چکے تھے۔ بی بی جان تھیں، باچا جان کی دوسری بیوی، انتہائی طرحدار اور حسین خاتون، نہایت کم عمری میں شادی ہو جانے کی وجہ سے یہ پٹھان زادی، دادی اور نانی بننے کے باوجود اڑتیس، چالیس سے اوپر کی نہ لگتی تھیں۔ جب کہ باچا جان اچھے خاصے ضعیف لگتے، چچی جان کہتیں، بی بی جان اتنی بھی کم عمر نہیں، پچپن کے قریب ہیں۔ بس ویسے ہی عمر نجانے کیوں ان پر ٹھہری گئی ہے۔ بالوں کو سفیدی چھو کے گزر گئی، بس چند تاریں سی جھلملاتیں ان کے بارعب سر پہ، نیلی بلور آنکھوں میں چنگاریاں پھوٹتیں اور باریک سرخ لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست رہتے جیسے کوئی اہم راز اس قید سے باہر نکلنے کو بے تاب ہو اور اسے جبراً سینے میں دبا دیا گیا ہو۔ مقدس کو سامنے پا کے یہ چنگاریاں کچھ اور بھڑک اٹھتیں اور لب زیادہ بھینچ جاتے۔ وہ کم ہی اسے مخاطب کرتیں۔ اس کے لیے ان کے رویے میں یا تو تپش ہوتی جھلستی ہوئی، یا خنکی ہوتی ہڈیوں میں خوف جماتی ہوئی۔

چچا جان اور مرحومہ پھوپھی بی بی جان کی سگی اولاد تھے۔ پھوپھی شادی کے ایک سال بعد ہی شناور کو جنم دیتے ہی مر گئیں وہ اور شناور تقریباً ہم عمر تھیں۔ جب کہ دراب چچا کی انوشہ اور پلوشہ ان سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھیں۔ ان جڑواں بہنوں کے بعد ان کے اوپر تلے کے تین بیٹے تھے۔ اس کے سگے تایا افراسیاب خٹک اور باباجان دونوں بھائی بی بی جان کی مرحومہ سوکن کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے انہیں ماں جیسی ہی عزت دی۔

تایا جان اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد سیٹل تھے وہ کچھ سیاست وغیرہ کا شغل رکھتے تھے مقدس کے ساتھ ان کا رویہ بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ انہوں نے کبھی نظر بھر کے بھی سگے ماں جائے کی اکلوتی اولاد کو نہ دیکھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی وہ بے رغبتی سے منہ پھیر کے دیتے اس کے علاوہ اس کی کبھی ہمت نہ ہوئی ان سے بات کرنے کی۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے ان کی نگاہ اس پر پڑ جاتی تو سرخ وسفید چہرہ دہکنے لگتا۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں لہو رنگ ہو جاتیں اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل جاتے حالانکہ مقدس کو تو انہیں اٹھتے بیٹھتے، بولتے، مسکراتے ہر طرح سے دیکھتے رہنا بے حد پسند تھا۔ کیونکہ ہمیشہ سے اس نے یہ سنا تھا کہ اس کے باچا جان اور تایا جان میں خاصی مشابہت ہے۔ اگرچہ گھر میں اس نے اپنے باپ کی کئی قد آور تصاویر آویزاں دیکھی تھیں لیکن تایا جان کی صورت وہ انہیں مجسم دیکھ کے دل کو تسکین دے دیتی تھی۔ جب کہ ماں، ماں کے حوالے سے وہ کوئی بھی ذکر سنتی تو تسکین کے بجائے عجیب سی وحشت دل کو گھیر لیتی۔

اسے یاد تھا ایک بار جب وہ پلوشہ اور شناور تانی آپی کی منگنی کی باتیں کر رہی تھیں۔

”کتنی خوب صورت لگ رہی تھیں آپی۔ میرون شرارے میں اور ان کی لانبی گردن میں وہ گلوبند کتنا جچ رہا تھا۔“ یہ پلوشہ کی رائے تھی۔

”اتنے میک اپ اور جیولری کے ساتھ تو کوئی بھی خوب صورت لگے گا۔“ شناور کی نتاشہ آپی کے ساتھ کم ہی بنتی تھی۔

''خیر ایسی بات بھی نہیں۔ وہ ویسے بھی خوب صورت ہیں۔ ہماری پوری فیملی میں صرف انہی کی آنکھیں اور بال بلیک ہیں۔ یہ بھی ان کی انفرادیت ہے۔'' مقدس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''واہ ایسے ہی، باقی کیا کم ہیں۔ ان سے تو تانیہ زیادہ اٹریکٹو ہے۔ میری بھی ہائٹ کچھ کم ہے، لیکن خیر ابھی میری ایج بھی تو ففٹین ہے، تھوڑی سی ہائٹ اور بڑھ جائے تو تمہاری تانی آپی کیا لگیں گی میرے آگے۔ تم دونوں بھی اچھی لگو گی، بڑی ہو کے بہت اچھی لگو گی دیکھ لینا اور یہ مقدس تو ہے ہی بیوٹی کوئین۔''

''پتا ہے شانو، مما کہتی ہیں انہوں نے پاپا سے سنا ہے، مقدس کی مما بے حد خوبصورت تھیں، ایسے جیسے کوئی پری، انہوں نے آج تک ایسی حسین عورت نہیں دیکھی، مما کہتی ہیں ایسی تعریفیں سن سن کے ان کا اکثر جی چاہتا ہے کاش انہوں نے بھی تمہاری مما کو دیکھا ہوتا۔

اس نے تائید پانے کے لیے مقدس کی طرف دیکھا جو بے دھیانی میں سیڑھیاں اترتی بی بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ ہلکے انگوری رنگ کے جارجٹ کے شلوار قمیص چکن کی کریم کلر کی بڑی سی چادر اوڑھے وہ کس قدر باوقار لگ رہی تھیں۔ سلیقے سے گندھے بالوں پہ باریک شفون کا دوپٹہ تھا۔ کانوں سے لٹکتی بالیوں کے ساتھ موتیے کی تازہ ادھ کھلی کلیاں اٹکی تھیں۔

ان کی نگاہ اب تک مقدس پہ نہیں پڑی تھی، اس لیے چہرے کے نقوش بگاڑتے ہوئے تلخ تاثرات ناپید تھے۔ اس سے نجانے وہ کیوں اسے بہت اچھی لگیں، شاید اس لیے کہ اس نے کبھی کبھار ہی انہیں نفرت اور بے زاری کے بغیر دیکھا تھا، اسی لیے بے ساختہ کہہ اٹھی۔

''بی بی جان بھی تو کوئی پری ہی لگتی ہیں، اب بھی اتنی حسین ہیں تو پہلے کیا لگتی ہوں گی ہے ناں؟''

''دیکھئے بی بی جان، مقدس کیا کہہ رہی ہے۔'' شانو، سدا کی منہ پھٹ اور جذباتی، چلا اٹھی۔ اس کا مقصد محض بی بی جان کے دل میں کسی طرح اپنی دوست کے لیے جگہ پیدا کرنا تھی۔ وہ ان کے گریز اور سرد مہری کو ہمیشہ سوتیلے پن کی رعایت دیتی تھی۔ مقدس نے اس کا ہاتھ دبا کے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر تب تک وہ بی بی جان کو سیڑھیاں نیچے اتر آنے کی مہلت دیئے بغیر شروع ہو چکی تھی۔

''مقدس کو آپ اتنی پسند ہیں مجھے تو پتا ہی نہ تھا۔ میں تو سمجھتی تھی آپ کو سب سے زیادہ پیار میں کرتی ہوں لیکن یہ کہہ رہی تھی کہ بی بی جان اتنی خوب صورت ہیں اتنی خوب صورت ہیں کہ جتنی اس کی اپنی مما۔ اس کے لیے دونوں ہی......''

بی بی جان کو طیش میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کے اس کی زبان گنگ ہوگئی اور مقدس کسی انجانے جرم کے احساس سے سہمی، لرزتی ٹانگوں پہ کھڑی ہوگئی۔

''چٹاخ......'' اگر محض جسمانی تکلیف کو ہی تشدد کا نام دیا جاتا ہے تو بے شک اس کی پندرہ سالہ زندگی کا یہ پہلا تھپڑ تھا جو اسے ماں کے حوالے سے ملا تھا۔

''تیری اتنی جرات، تو میرا مقابلہ اپنی ماں سے کرے گی۔ ارے میں اصل خاندان کی، عزت دار الحمدللہ پکی مسلمان، ساری عمر اپنے وقار کو سینت سینت کر رکھتے گزر گئی۔ اور یہ...... یہ اس حرافہ کی نشانی، مجھے پل بھر میں دو کوڑی کا کر گئی۔ میرا نام اس ہندنی کے ساتھ لے کر۔ وہ کافر کی اولاد

اور میں اس بدبخت کی نظر میں ایک جیسے ہی، بتا، کہاں دیکھ لی تو نے اس ہندنی (ہندوعورت) کی کالی صورت، جو میرے ساتھ مقابلہ کرنے چلی ہے۔ کس نے پھونک دیا تیرے کانوں میں اس کے حسن کے بارے میں۔

میں بتاتی ہوں تجھے اس کے کالے کرتوت، خود تو کہیں منہ کالا کر رہی ہوگی میرے بیٹے کو ذلت سے دوچار کر کے دربدر کر دیا۔ میرا خان برسوں سے اس کے انتظار میں نہ جی رہا ہے نہ مر رہا ہے۔''

توہین کے احساس سے بھری بی بی جان اس پہ وحشیوں کی مانند پل پڑی تھیں اور پھر باباجان کی حالت پر اونچی اونچی آواز میں روتے ہوئے نڈھال ہو کے ایک جانب پڑ گئیں۔ پورا گھر حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کے گھر کے در و دیوار نے بھی شاید کسی خان زادی کی اتنی بلند آواز اور کوسنے پہلی بار سنے تھے، یوں لگتا تھا جیسے افراد کے ساتھ ساتھ دیواریں بھی سکتے میں آ گئی ہوں اور وہ...... گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھی، نچے ہوئے بال، ادھڑی آستین، سوجے رخساروں اور ہونٹوں سے نکلتے خون سے بے خبر بی جان کا ایک ایک لفظ دہرا رہی تھی۔ پہلی بار اس نے ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر سنا تھا۔ اور وہ بھی اس قدر تفصیل سے، اتنے بھیانک انکشافات کے ساتھ۔ وہ بدن پہ لگی چوٹوں اور ملازموں تک کے سامنے ملنے والی اس ذلت سے بے پرواہ، بس یہ سوچ رہی تھی کہ چلو یہ راز تو کھلا میں یتیم نہیں ہوں، ورنہ زندگی کے کتنے برس اس الجھن کی کھوج میں بیت گئے کہ میری ماں زندہ ہے یا مر گئی یا اس کو طلاق مل گئی، میرا باپ اس دنیا میں کہیں ہے یا...... وہ دونوں اس دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں موجود ہیں۔ اپنے کھوکھلے تعلق کی ایک بدنما یادگار سے یکسر بے خبر، بالکل انجان۔

اور اسی رات اس کے نیل پڑی چوٹوں پہ گرم ٹکور کرتے ہوئے شنا ورمنت کر رہی تھی۔

''مقدس، تو انسان ہے یا پتھر، روتی کیوں نہیں، رو، خدا کے لیے رو لو تھوڑا سا۔

''شانو، کیا میری ماں ہندو تھی...... اور کیا اس کی وجہ سے میں کافر کی اولاد کہلاؤں گی؟'' وہ بولی بھی تو صرف یہ۔

''دیکھو پہلی بات تو یہ کہ تم ماموں زریاب کی اولاد ہو اور مسلمان ہی کہلاؤ گی۔ اور دوسرا یہ کہ میں نہیں مانتی تمہاری مما ہندو تھیں۔ شاید وہ عیسائی ہوں یا پھر یہودی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اہل کتاب سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے۔ تو پھر ضرور مسلمان ہونے کے بعد ہی وہ اس گھر میں آئی ہوں گی، اگر بی جان کے کہنے کے مطابق وہ کافر تھیں ظاہر ہے کسی ہندو سے تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔''

''تو پھر...... پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے باباجان نے ان سے...... نک...... میرا مطلب ہے نکاح ہوا ہی نہ ہو۔'' اس نے کہنے کے ساتھ ہی خود اپنے لب دانتوں سے کاٹ لیے گویا یہ بات تصور کرنا بھی کتنا اذیت ناک تھا اس کے لیے۔

''ناممکن...... اپنے خاندان کی روایات کو جانتی ہو تم اور یہ بھی کہ کس طرح ان کی پاسداری کی جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں تمہاری مما ایک ڈیڑھ سال تک یہاں، اس گھر میں اس خٹک فیملی میں بہو کی حیثیت سے رہی ہیں کیا ہمارے گھر کے مرد اتنی جرات کر سکتے ہیں کہ بغیر کسی نکاح کے، کسی عورت کو یہاں لا کے رکھ سکیں۔ ارے ہم لوگوں کے دادا، پردادا نے چھ چھ، سات سات نکاح کر رکھے تھے لیکن ایسی حرکت...... توبہ توبہ ایسا تو سوچو بھی مت۔'' وہ اس عمر میں بھی خاندانی روایات سے بخوبی آگاہ تھی۔

''تو اگر میری مما مسلمان ہو چکی تھیں تو ان کے پچھلے حوالے کو کیوں یاد رکھا گیا ہے۔ کیوں انہیں ہندنی، کافر کی اولاد جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔'' وہ احتجاجاً بلک اٹھی۔

''اس لیے کیونکہ......'' وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ جواز سوچ رہی تھی کہ چچی جان گرم دودھ کا گلاس لے کر اندر داخل ہوئیں اور اس کی مشکل آسان کی۔

''اس لیے بیٹا، کیونکہ انہوں نے اپنا پچھلا حوالہ کسی کو بھولنے نہیں دیا۔ وہ اس خاندان میں رچ بس جاتیں یہاں کے قاعدے اصول اور روایات اپنا لیتیں تو آج شاید کوئی جان بھی نہ پاتا کہ خان زریاب خٹک کی بیوی کہاں سے آئی تھی۔ لیکن شاید وہ آزاد فضاؤں کی باسی چادر اور چار دیواری کی پابندی برداشت نہیں کر پائی۔ کون جانے اب تک وہ مسلمان رہی بھی ہے یا نہیں۔

تمہارے چچا ان دنوں ہارورڈ یونیورسٹی میں تھے انہیں تمہارے بابا جان نے تصاویر بھیجی تھیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ صحیح طرح نہیں جانتے وہ جرمن تھیں یا انگریز یا فرنچ۔ اپنی شادی کے وقت جب یہاں آئے تو انہیں خبر ہوئی کہ بھائی کی گرہستی اجڑے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ بی بی جان نے بھی تفصیل کسی کو نہیں بتائی۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ تمہارے بابا کے ساتھ نبھا نہ سکیں، نہ ہی مشرقی طور اطوار کے تقاضے پورے کر سکیں، شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی انہوں نے، لالہ زریاب نے انہیں تو غیرت میں آ کے فوراً گھر سے نکال دیا لیکن خود بھی جگ ہنسائی کے خوف سے کہیں روپوش ہو گئے۔ خاندان کی ناموس پہ لگا یہ زخم ہمارے بزرگ بھلا نہیں پا رہے۔''

''لیکن اس سارے قصے میں میرا قصور کہاں نکلتا ہے۔ میرے ساتھ سب کا رویہ نارمل کیوں نہیں؟'' وہ سراپا سوال تھی۔

''میں پھر وہی بات کہوں گی کہ اس بار تمہارے بابا نے یہ سب کسی کو بھولنے نہ دیا۔ وہ خود اگر اس سانحے کو فراموش کر دیتے، تمہارے ساتھ سایہ بن کے رہتے، اپنا گھر بسا لیتے تو لوگ بھی کب کے بھول بھال چکے ہوتے۔ ان کی خود ساختہ جلاوطنی اس زخم پہ کھرنڈ نہیں آنے دیتی۔ ہر زخم کو مرہم چاہیئے۔ جن زخموں کا منہ کھلا رہ جائے وہ ٹیس تو دیتے ہی ہیں۔ تمہارا وجود با چا جان اور بڑے لالہ کو زریاب کی یاد دلاتا رہے گا۔ جو نجانے کہاں ہیں اور کب آئیں گے۔ حیرت کی بات ہے دونوں بھائیوں نے ان کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مگر انہیں یقین ہے وہ ضرور ایک دن لوٹیں گے، چودہ سال سے اوپر ہو رہے ہیں مجھے اس گھر میں آئے۔ میں نے آج تک ان کا کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی اطلاع آتے نہیں دیکھی۔ ایک بار تمہارے چچا سے کہا تھا کہ بڑے لالہ اتنے اثر و رسوخ والے ہیں وہ کیوں نہیں کوشش کرتے بھائی کو کھوجنے کی، تو کہنے لگے اس کی ضرورت نہیں۔ وہ لوٹ آئیں گے بلکہ لوٹنے ہی والے ہیں۔ اللہ کرے ان کا یقین سچ ہی ثابت ہو، اگر ایسا ہو جائے تو تمہارا امتحان بھی ختم ہو جائے گا۔ کون جانے کہ خون کی کشش انہیں کب کھینچ کے لے آئے۔'' انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

''جی نہیں کرتا چچی جان۔'' اس نے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

''یہ پکڑو شانو، اسے پلاؤ اور یہ سمجھاؤ کہ جن کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور جو اسے دنیا میں لانے کی وجہ بننے کے باوجود اسے بھلائے بیٹھے ہیں ان کی خاطر کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ میں اتنی تھی تو گھر میں کیا ہوا، کیسے ہوا کی خبر ہی نہ ہوتی تھی،

اسے اس کی کم عمری کے باوجود میں نے وہ تمام تلخ باتیں اور انکشافات بتا دیئے، جتنے کہ میں جانتی تھی صرف اس لیے کہ اس کے اندر کے کچھ سوال تو خاموش ہوں۔ جو ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اپنی زندگی کی قدر کرو۔ اسے جیو اپنی پہچان خود بناؤ۔''

اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ کنیئرڈ کالج میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے جب وہ پہلی بار داخل ہوئی تو اتنی پر اعتماد ہرگز نہیں تھی جتنے گزرے دنوں نے اسے بنا دیا تھا۔ یہاں کوئی اس پہ، اس کی ذات پر کیچڑ اچھالنے والا نہیں تھا۔ یکسوئی اور ذہنی سکون نے اسے پڑھائی کی جانب راغب کر دیا، ساتھ ہی مخفی صلاحیتیں کھل کے نکھر کے سامنے آ گئیں۔ اب وہ کالج کی ہونہار طالبہ تھی۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کر لینے کے بعد اس نے میڈیکل لائن کو چنا اور کنگ ایڈورڈ میں چلی آئی۔

یہ دو ڈھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا کہ وہ اس کے سوئے درد جگاتا۔

تاوقتیکہ شناور بھی ایف اے کرنے کے بعد اس کے پیچھے پیچھے لاہور چلی آئی۔ اس نے یہ عرصہ بھی نجانے کیسے اس کے بغیر گزارا تھا۔ بی بی جان تو کبھی اسے نہ بھیجتیں مگر اس نے مقدمہ اپنے بابا رحیم گل آفریدی کے آگے پیش کیا جو اکثر و بیشتر اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اگرچہ پھوپھو کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن وہ اس گھر سے اپنا رشتہ ختم نہیں کر سکے تھے کیونکہ بی بی جان کے وہ محض داماد ہی نہیں، سگے بھانجے بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے والد اور باچا جان چچازاد بھی تھے۔ یوں وہ بلا تکلف آتے جاتے رہتے۔ اس بار مقدس بھی وہیں تھی۔

''بابا جانی پلیز بی بی جان کو سمجھائیے ناں، یہاں پورے سرحد میں کوئی آرٹ اسکول نہیں ہے۔ میں فائن آرٹس میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے این سی اے میں ایڈمیشن نہ دلایا گیا تو مزید آگے ہرگز نہیں پڑھوں گی۔''

یہ دھمکی بی بی جان کو کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ اس کی بات بہت پہلے سے افراسیاب خان کے بڑے بیٹے گل ریز خان خٹک سے طے تھی جو لندن میں اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کر رہا تھا۔ جب کہ شانو کو سرے سے پڑھائی کی طرف دلچسپی ہی نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں زمانہ بدل رہا ہے، بچے اپنے بزرگوں کے فیصلوں میں نقص نکالنے کو تیار رہتے ہیں، کہیں تعلیم کی کمی اس رشتے کے ختم ہونے کا جواز نہ بن جائے۔ شاید اپنی مرضی کی تعلیم اسے پڑھنے لکھنے کی جانب راغب کر ہی دے۔

''چلو کم از کم کوئی تو وارث ٹھہرے گا تمہارے ماموں کے رنگوں سے کھیلنے کے شوق کا۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''ماموں؟ کون سے ماموں۔ چھوٹے ماموں تو ہرگز اس طرف مائل نہیں ہو سکتے تو کیا بڑے ماموں مصوری کا شوق رکھتے تھے؟''

''نہیں وہ تمہارے منجھلے ماموں، خان زریاب خٹک، وہ دیوانہ تھا تصویروں کا، رنگوں کا، حسن کا۔'' وہ نجانے کیوں اداس ہو گئے آخر بچپن، لڑکپن ایک ساتھ گزارا تھا۔ شناور ان کے بارے میں اور بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن بی بی جان کے سہمے چہرے اور بابا کے شکستہ تیور دیکھ کر الجھ سی گئی۔ ماحول پہ ایک بوجھل پن سا طاری تھا۔ مقدس عرصے بعد ابھرتے تجسس کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ پھر سے اس کیا، کیوں، کب اور کیسے کے جال میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت مشکل سے اپنے منتشر ذہن کو ایک مقصد کی طرف مائل کیا تھا اس نے کچھ بن جانے کا، اپنی شناخت خود بنانے کا۔

شناور کے لاہور آجانے سے بھی اس کی یکسوئی میں خلل پڑا۔ وہ اکثر انجانے میں اس کے خوابیدہ تجسس کو جگا دیتی۔ ایک دن تو بضد ہوگئی۔

''تم چلو تو ایک بار میرے ہاسٹل، دیکھو تو سہی میں غلط نہیں کہہ رہی۔''

''میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت لیکن میں کیا کروں گی اس عورت سے مل کے۔''

''قسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو بہو تمہاری آنکھیں، یہی ناک، چہرے کا نچلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، ورنہ کیا پتا تم دونوں ہی ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ تمہاری ممانہ ہوں۔ لیکن خیر اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پٹھان ہی ہے بالکل دیہاتی قسم کی، کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ماتھے اور رخسار پر تل گودے ہوئے ہیں، یہ لمبا گھونگھٹ نکالتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بغیر کسی تعلق اور رشتے کے بھی کس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں تم ایک بار اگر دیکھ......''

''لیکن میں کیوں دیکھوں۔ میں نے اپنی آنکھیں ہزار بار دیکھی ہیں، یہ چہرہ دن میں کئی بار آئینے میں دیکھتی ہوں، پھر ایسی ہی آنکھیں، ایسی ہی ناک دیکھنے کے لیے فضول وقت کیوں ضائع کروں۔ خدا کے لیے شانو اب بڑی ہو جاؤ، ایسی ایسی باتیں کرتی ہو کہ خدا کی پناہ، ایک پہاڑی دیہاتی عورت سے خوامخواہ مجھے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو محض اس بناء پہ کہ ہماری آنکھوں کا رنگ ایک ہے۔'' وہ بےزاری سے بولی۔

''مجھے تو حیرت اس بات پہ ہوئی کہ پورے خاندان میں کسی سے تمہارے نقش نہیں ملتے جب کہ ایک بالکل انجان عورت ہمارے ہاسٹل کے کچن میں کام کرنے والی......''

''پلیز شناور جسٹ اسٹاپ اٹ۔ ایک بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ چپ ہوئی۔

''بی بی جان سے بڑی لمبی بحث کے بعد میں نے زریاب ماموں کے اسٹوڈیو کی چابی حاصل کی ہے۔ چلو اٹھو چلتے ہیں۔''

''کیا؟ بابا کے اسٹوڈیو کی چابی؟ مگر بی بی جان تو ان کے دونوں کمرے لاک رکھتی ہیں۔ کسی کو جانے کی اجازت نہیں، پھر تمہیں کیوں جانے دے رہی ہیں۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''بہت مشکل سے سمجھا پائی انہیں اگلی اسائنمنٹ کے لیے مجھے بالکل فریش اور یونیک (منفرد) آئیڈیا چاہیے اس کے لیے ماموں جان کی کچھ پینٹنگ اور فوٹوگرافس دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ کچھ انسپائریشن مل سکے۔''

''تو پھر جاؤ۔'' وہ میگزین لے کر نیم دراز ہوگئی۔ اس کی اطمینان بھری اجازت پہ شناور جل اٹھی۔

''کیوں؟ تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم کیوں نہیں آسکتیں میرے ساتھ؟''

''دیکھو شانو جان، میں چھٹیوں کے چند دن یہاں گزارنے آئی ہوں۔ مجھے سکون سے رہنے دو۔ میں نہیں چاہتی میرے کسی بھی عمل سے بی بی جان کو میرا سال میں چند دن یہاں گزارنا بھی دوبھر لگے تم جانتی ہو میری لاکھ احتیاط کے باوجود بھی میری کوئی بات ان کا پارہ چڑھا دیتی ہے۔ اس کمرے میں جانے کی اجازت صرف تمہیں ملی ہے۔''

''کیوں تمہارے پاس کیا یہ جواز کم ہے کہ وہ تمہارے بابا جان کا کمرہ ہے۔ عجیب بے حس لڑکی ہو تم۔ وہ میرے ماموں ہیں جنہیں میں

نے کبھی دیکھا تک نہیں لیکن آج پہلی بار ان کے کمرے میں جاتے ہوئے میں اس قدر ایکسائٹڈ ہوں۔تم ان کی بیٹی ہو کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم اس کمرے میں جاؤ جہاں انہوں نے پہر بتائے ہوں گے،ان چیزوں کو چھوؤ جو کبھی ان کے استعمال میں رہیں۔ان کی تخلیقات دیکھو۔''اس نے اکسایا تو مقدس اداسی سے مسکرا دی۔

''میں بھی ان ہی کی ایک چیز ہوں جسے کبھی نہ کبھی تو انہوں نے چھوا ہی ہوگا۔میں بھی ان ہی کی ایک تخلیق ہوں جسے دیکھنے کو ان کا کبھی جی نہ چاہا۔''

اور واقعی ایک روز پہلے تک اس کے دل میں کوئی خواہش نہ تھی اپنی ہستی کے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کی۔لیکن باچا جان کی وصیت نے تو گویا ایک دھماکا کر دیا۔ہر ایک انگشت بدنداں تھا۔ہر فرد خصوصاً تایا جان اور چچا جان اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے گزر رہے تھے۔چچی جان نے اسے بی بی جان کے قہر سے بچانے کے لیے کمرے میں بند کر دیا تھا لیکن بی بی جان کی غضب ناک آوازیں اور تائی جان کے بلند کوسنے اسے دیواریں چیر کے دھمکا رہے تھے۔ایک عرصہ ہوا اس نے اپنی ذات اس گھر کے مکینوں سے اس قدر الگ تھلگ کر لی تھی کہ ان کے کسی قسم کے رویے کی دھوپ اس تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

آج برسوں بعد وہ پھر زیرعتاب تھی اور اس بار گرمی کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ پہلے ان کا ہدف اس کی ماں کا مشتبہ حوالہ تھا۔خاندان کو اس کے ماں باپ کی طرف سے ملے نقصانات کا غم و غصہ تھا اور اب کی بار وہ خود انہیں مشتعل کرنے کا باعث بنی تھی۔اس کی خاطر اس کی بے مول و بے وقعت ہستی کی خاطر باچا جان نے صدیوں پرانی روایت توڑ ڈالی تھی۔معتبر بیٹوں کے ہوتے ہوئے اسے خاندانی ورثہ کا امین قرار دیا تھا۔وہ خود نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ ان کے اس فیصلے کے پیچھے کیا مقصد رہا ہوگا۔ترس، ہمدردی، ازالہ یا آخری وقت میں کی گئی کوئی نیکی سمجھ کے وہ اپنی اس نظرانداز کی جانے والی پوتی کو خاندان بھر میں اہم بنانے جا رہے ہیں۔

''لیکن ان کے اس عمل میں میری کون سی بھلائی ہو سکتی ہے۔''وہ سوچتی رہی۔

''یہ لوگ، میرے سرپرست جو تمام تر کدورت کے باوجود میرے نگران کہلاتے ہیں، میری تعلیم، رہائش اور تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں ان ہی لوگوں سے میری دشمنی پیدا کر دینے میں میری کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔کیا تایا جان کبھی معاف کر پائیں گے میرا یہ قصور، کیا ان کی اولاد بھول پائے گی اس بات کو کہ میں ان کا حق انجانے میں ہی سہی مگر ہڑپ کر گئی۔کیا بی بی جان کو گوارا ہوگا وہ بالشت بھر کی لڑکی، جسے مخاطب کرنا بھی وہ اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ان کے گھر اتنا اونچا رتبہ حاصل کر بیٹھے گی۔

باچا جان تو ظلم کر رہے ہیں میرے ساتھ میں پہلے ہی بے سہارا ہوں۔وہ مجھے دشمنوں کے نرغے میں دیے جا رہے ہیں۔مجھے ان سے بات کرنا ہوگی۔انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پہ مجبور کرنا ہوگا۔اگر انہوں نے میری دلجوئی کی خاطر یا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنے منجھلے بیٹے کی غیر موجودگی میں بھی اسے کتنا اہم جانتے ہیں، یہ اقدام کیا ہے تو میں یہ تسلیم کر لوں گی کہ ہاں باچا جان، آپ نے انصاف سے کام لیا۔آج بیس سال بعد میں آپ کو نظر آ ہی گئی۔لیکن بس......بس اتنا ہی......اتنا ہی کافی ہے کہ......میں آپ کی نظر میں آ گئی۔

بس...... مگر مجھے دوسروں کی نگاہ میں تو غاصب مت ٹھہرایئے میں جھلسی ہوئی ہوں، تپتے مزاجوں کی مار سے، انجانے جرموں کی سزا بھگت رہی ہوں، بیس برس سے۔ اب تک مما کی بے وفائی اور بابا کی بے اعتنائی کی سزائیں جھیلتی آ رہی ہوں۔ اب آپ کی ہمدردی کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کی یہ مہربانی بہت مہنگی پڑے گی مجھے باچا جان، جو خاندان میری ماں کا ایک غیر قوم سے ہونا گناہ عظیم قرار دے کے مجھے اپنی مکمل شناخت دینے سے انکاری ہو جب کہ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے لیے باعث افتخار ہے چاہے مجھے جنم اک ایسی عورت نے ہی کیوں نہ دیا ہو جو ان کے لیے باعث شرم ہے۔

یہ لوگ مجھے اپنی اولاد کے برابر کھڑا کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اصل نسل ہیں۔ جب کہ میرے خون میں ملاوٹ ہے ان کی نظر میں، تو پھر اپنی اولاد سے اوپر کیسے دیکھ سکیں گے مجھے۔ مجھے کہیں جائے پناہ نہیں ملے گی۔

اس نے فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے کی ہمت پیدا کرنے میں وہ قطعی ناکام ثابت ہوئی اس کا اندازہ اسے اسی رات ہو گیا جب باچا جان کے کمرے میں اسے کاغذات پہ دستخط کرانے کے لیے طلب کیا گیا۔

اونچی چھتوں والے بڑے سے کمرے میں پہلا قدم دھرتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اور یہ سرد لہر اس قدر ظالم تھی کہ اس کا لمس پاتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی نے اس کے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

باچا جان کا استخوانی وجود، اپنی بچی کھچی دشوار سانسوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وکیل صاحب بڑے غور سے اس دم بدم فق ہوتی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ چچا جان نے جیسے شکار کی مچان سنبھالی ہوئی تھی ان کی نگاہیں مقدس کا نشانہ لے رہی تھیں اور تایا جان اسے راستے سے ہٹانے کے لیے شاید کوئی سیاسی چال چلنے کا سوچ رہے تھے اور...... اور بی بی جان...... ان پر ایک ڈری ڈری سی نظر ڈالنے کے بعد تو اس کی ہمت نے دل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کس حوصلے اور جرات سے اس نے یہ ہمت مجتمع کی اور دل کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیا تھا لیکن اب وہی ہمت ہاتھ چھڑا کے دل سے ایک ایک سیڑھی پھسلتی جا رہی تھی۔

دھڑام......

اس کے گھٹنے بے جان ہو کے مڑ گئے وہ فرش پر گرنے ہی والی تھی کہ نرس نے آگے بڑھ کے اسے سنبھالا، باچا جان کے بستر کی قریبی کرسی پر بٹھاتے ہوئے ایک ہمدردی بھری نظر اس کے ٹھنڈے ٹھار نیلے ہوتے چہرے پر ڈالی اور پھر تاسف سے سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ وہ انجان، بے گانی ملازمہ شاید اس سارے قصے سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھی۔ اسے اپنی کم آگاہی پہ اور بے بسی محسوس ہونے لگی۔

''لو بیٹا، یہاں سائن کر دو۔'' وکیل صاحب نے قلم اور کاغذ اس کے آگے کیا۔

''یہ تحریری ثبوت ہو گا اس بات کا کہ ایک عاقل و بالغ آزاد فرد کی حیثیت سے تمہیں اپنے دادا کی اس وصیت پر کوئی اعتراض نہیں جس کی رو سے تمہیں اس خاندان میں صدیوں سے چلے آ رہے قیمتی نوادرات، زیورات اور اپنے آباؤ اجداد کی دیگر نشانیوں کا وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ تم ان کی حفاظت خلوص نیت سے کرنے کی پابند ہو گی، نیز تمہیں اس کی خرید و فروخت کرنے یا کسی غیر خاندان کے فرد کو انہیں تحفتاً یا قیمتاً دینے کی ممانعت ہے۔''

''ایک منٹ وکیل صاحب۔'' تایا جان بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''باچا جان ایک بار اور سوچ لیجئے، آپ جذباتی ہو کے یہ فیصلہ کر رہے ہیں۔'' لیکن باچا جان نے ان سنی کرتے ہوئے اپنا نیلی ابھری ہوئی، زخمی رگوں والا ہاتھ آگے بڑھا کے وکیل کو کارروائی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس کا گود میں دھرا کپکپاتا ہاتھ جب آگے نہ بڑھا تو وکیل صاحب نے کاغذ اس کے سامنے دھرا اور قلم مزید آگے کر کے اسے تھمانے کی کوشش کی۔ قلم اس کی انگلیوں سے مس ہوا تو ان کی کپکپاہٹ بھی منجمد ہو گئی اور اس کا بھاری ہوتا سر سائیں سائیں کرتا ہوا بے جان سا ہو کے اس کی گردمیں آ گرا۔

''او خدا، یہ بے ہوش ہو چکی ہے، نرس، نرس۔'' وکیل صاحب نے ایمرجنسی بیل دینے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی دیں۔

باچا جان سر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ نرس نے آگے بڑھ کے بلڈ پریشر چیک کیا۔

''او، بی پی بہت لو ہے۔ سر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں میرے پاس اس وقت لو بی پی کی کوئی میڈیسن نہیں میں ٹیبلیٹ لکھ دیتی ہوں آپ منگوا دیجئے۔ ان کے ہوش میں آنے پہ دے دوں گی۔'' وہ ہاتھ پیر سہلاتے ہوئے بولی۔

''یہاں......اسے......اد......ادھر لاؤ۔'' باچا جان ہمت کر کے بولے۔ اس نے فوراً ہی اسے کرسی سے بیڈ پہ ان کے پہلو میں منتقل کر دیا۔

''سر میں ان کے لیے جوس بنواتی ہوں۔'' وہ باہر نکل گئی تو وکیل صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''خان صاحب مجھے اجازت دیجئے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ پھر مجھے طلب کر لیجئے گا خدا حافظ۔

☆☆☆

نیم بے ہوشی کے عالم میں اس نے خود کو چند قد آور گھرے سایوں کے نرغے میں پایا۔ وہ اپنی برف میں لگی انگلیاں ترخ ترخ کی آواز کے ساتھ کھولتے ہوئے قدموں میں پڑا قلم اٹھانا چاہتی ہے لیکن ہر بار اس کا ہاتھ قلم کو چھونے سے پہلے ہی کوئی ٹھوکر مار کے اسے چند قدم اور دور کر دیتا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تو بی بی جان نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پہ جما دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ ہاتھ پیر ہلاتی رہی اور تایا جان، چچا جان اور بی بی جان اس کے سامنے ہی اس کے ایک ہم شکل وجود کے پرخچے اڑا رہے تھے۔ یہ وجود جو خود اس کا تھا۔

''مگر میں......میں تو......بی بی جان نے میرے لبوں پہ ہتھیلی جما رکھی ہے اور......میں خود ہی اپنے آپ کو کیسے بکھرتے دیکھ رہی ہوں''

یہ خیال اس کے بے ہوشی میں ڈوبتے وجود کو ہاتھ تھام کے ہوش کی سرحد پر کھینچ لایا اور اس کے کانوں میں آتی آوازیں اسے یاد دلانے لگیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔

''آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں باچا جان۔''

تایا جان کی آواز میں برہمی تھی، غصہ تھا اور جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ اتنا اثر و رسوخ، رعب و دبدبہ رکھتے ہوئے بھی اس نحیف وجود کے سامنے بے بس تھے۔ ان کا ادب، ان کا لحاظ بہت کچھ سہنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

''ہمارا خاندان سرحد کے چند ممتاز اور قابل احترام خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اور ایک زمانہ مجھے خٹک فیملی کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے

جانتا ہے، یہ حقیقت بھی سب پہ عیاں ہے کہ ہمارے ہاں باپ اپنے بڑے بیٹے کو خاندانی پشت در پشت چلے آرہے قیمتی ورثے کی چابی دے کر اس کی جانشینی کا اعلان کرتا ہے۔ جب کہ آپ کا یہ قدم میری حیثیت مشکوک کر دے گا۔''

''تمہاری......حیثیت پر......کک......کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' باچا جان نے اطمینان دلانا چاہا۔

''کیسے نہیں پڑے گا۔ بلکہ میری سیاسی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی، آپ کا حوالہ میرے لیے محترم سہی مگر میں نے خود اپنی شناخت ایک لمبی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے۔ ملک کے سیاسی افق پہ اس وقت میرا نام ایک بے داغ شخصیت رکھنے والے سیاست دان کا ہے۔ لیکن اب لوگ میرے بارے میں چہ میگوئیاں کریں گے۔ جسے اس کے خاندان والے، اس کا باپ قابل اعتبار نہ جانیں، عوام کیسے اس کی ذات پہ بھروسہ کرلے گی۔ اگر آپ نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو اس بار الیکشن میں میرا جیتنا ناممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں ہماری پختون برادری کی ذہنیت کو وہ لوگ خاندانی ناموس کو اول جانتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے فیصلے میں ترمیم کیجیے۔'' وہ منت پہ اُتر آئے۔

''میرا فیصلہ......اٹل......ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' وہ جیبوں میں ہاتھ ٹھونستے کھڑے ہو گئے۔

''میں اپنا حق وصولنا بخوبی جانتا ہوں۔ اپنی برسوں کی محنت سے حاصل کیا گیا یہ مقام ہر حال میں بچاؤں گا۔ اپنے بل بوتے پہ بنائے اپنے سیاسی کیریئر کو میں آپ کی بلاوجہ کی ضد پہ ہرگز قربان نہیں کروں گا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تو اب تک خاموش بیٹھے چچا جان اور بی بی جان بھی چونک اٹھیں آخر دراب چچا نے بولنے میں پہل کی۔

''وہ ہمارے پاس زریاب لالہ کی امانت ہے بڑے لالہ۔ یہ بات آپ کو یاد رکھنی چاہیے۔''

''جانتا ہوں، اسی لیے تو......اس لیے تو۔'' وہ مٹھیاں بھینچنے لگے۔

''ورنہ اس کی صورت مجھے اس نامراد، بدبخت عورت کی یاد دلا دیتی ہے۔ بھائی کی یاد نے ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے منت کی تھی میری کہ یہ لڑکی اس خاندان میں ہی رہنی چاہیے۔ اس کی ماں کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اس پہ۔''

''اور ہمیں یہ عہد نبھانا ہی ہے۔'' دراب خٹک نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''خاص طور پر اس لیے کہ اب زریاب لالہ کے آنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ میرا تو خیال ہے باچا جان کہ آپ کچھ عرصہ مزید انتظار کرلیں۔ لالہ کے آنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ لیجیے گا۔'' ان کی باوثوق پیشن گوئی سن کر مقدس پوری طرح حواسوں میں آگئی، اب اسے اپنا آنکھیں موندے رکھنا دشوار لگنے لگا۔

''کہاں ہیں میرے بابا؟''

''کب آنے والے ہیں وہ؟''

''کیوں اتنے عرصے سے غائب ہیں وہ؟''

ان سب سوالوں کے جواب وہ کمرے میں موجود نفوس کے چہروں سے کھرچ کر پڑھنا چاہتی تھی۔

''اور کیا پتا وہ بھی اس بدبخت کی صورت دیکھنا چاہے گا یا نہیں۔'' بی بی جان کے سفاک تبصرے نے اسے آنکھیں کھولنے سے پھر روک دیا۔

''اسی لیے...... اسی لیے تو...... میں یہ...... یہ کررہا ہوں اتنے سالوں سے وہ ہم سب کی وجہ...... کم ازکم اب تو...... اسے اولاد کا سکھ، اس کے دل کو صاف کرنا ہے۔'' باچا جان کی دشوار کھڑی سانسوں میں مدھم فقروں سے چند الفاظ بے ربط سے انداز میں اس کے کانوں میں پڑے۔

''بے وفائی کے داغ یونہی نہیں صاف ہوجاتے دلوں سے۔'' دراب چچا تلخی سے بولے۔''نجانے کیا دھن سوار ہوگئی ہے آپ کو باچا جان، بھلا جائیداد میں اس لڑکی کو حصہ دار بنانے سے ان ساری باتوں کا کیا تعلق ہے۔ کیا مل جائے گا اس سارے بکھیڑے سے۔''

''تلافی۔'' باچا جان کے لبوں سے کراہ کی صورت ایک لفظ نکل کر فضا میں ٹھہر گیا۔ لمحہ بھر کو سب ساکت ہوگئے۔ تایا جان اور چچا جان کی خاموشی میں استعجاب تھا اور بی بی جان کے سکوت میں کسی انہونی کا خدشہ۔

''کیسی تلافی کیا ظلم ٹوٹے ہیں یہاں اس پہ۔'' کچھ دیر بعد تایا جان گویا ہوئے۔

''کیا اس کی تعلیم یا تربیت میں کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔ رہی بات لاڈ پیار جتانے کی تو یہ دلوں کے معاملے ہیں اور خٹک خاندان میں کوئی منافق نہیں۔ جو جو آپ کے کھرنڈ کھرچتا رہے اسے آپ سر آنکھوں پہ تو نہیں بٹھا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اس عورت کی بیٹی ہونے کے باوجود اس چھت تلے رہتی آئی ہے۔ پھر بھی...... پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں اس کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے اور اس کا احساس آپ کے دل پر بوجھ بڑھا رہا ہے تو اس کی تلافی کا کوئی اور طریقہ بھی تو ممکن ہوگا۔'' تایا جان ہر صورت وہ فیصلہ بدلنا چاہتے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں ان کے بے تابانہ گھومتے قدموں کی دھمک اسے بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

''ہاں ہے...... تم میں سے کون اسے اپنے بیٹے کے لیے عزت دے گا۔'' اس پیش کش پہ صرف بی بی جان چونکیں، تایا جان اور چچا جان محض ایک دوسرے کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ کے رہ گئے اور خود مقدس...... وہ تو متوقع انکشافات سے لرز رہی تھی۔

''لیکن افراسیاب کا ایک ہی بیٹا ہے اور سب جانتے ہیں وہ شناور سے منسوب ہے۔'' بی بی جان نے خفگی بھرے انداز میں جتایا۔''اور دراب کے دونوں لڑکے۔'' انہوں نے کچھ کہنے سے قبل بیٹے کی طرف دیکھا وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئے۔ ان کا تعلق اپنی اولاد سے ایسے ہی تھا۔

''نہیں بی بی جان وہ دونوں ہی اس سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں۔ کیوں باچا جان۔'' تایا جان نے کہا۔

''ہاں...... اتنا فرق...... یہ تو ظلم ہوگا اس پہ...... ایک اور ظلم۔''

''کیوں خان!'' بی بی جان نے دکھ بھرے انداز میں پوچھا۔''میری بیٹی کے لیے کسی کو بارہ سال کا فرق نظر نہ آیا۔ اس بدنصیب پہ کس نے یہ ظلم توڑا۔ کبھی اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ کی گئی ناانصافی کی تلافی کا خیال آیا آپ کو۔'' تایا جان کے جھریوں بھرے، چہرے پہ دو آنسو پھیل گئے۔ ان کی سانسوں کا زیروبم پھر پریشان ہونے لگا۔

''خدا کے لیے بی بی جان۔ اس قسم کے مسئلے مت چھیڑیں۔ ان کی حالت دیکھیں آپ۔'' کب سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھے دراب

خٹک نے لیک کے باپ کو سنبھالا اوران کا سینہ سہلانے لگا۔افراسیاب خٹک نے نرس کو کال دے دی۔

"بی بی جان، خود کو سنبھالیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ باچا جان بھی ٹھیک کہتے ہیں اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ بہر حال دراب کی بات میں بھی وزن ہے زریاب کے آنے میں چند ماہ ہی رہ گئے ہیں تب تک کے لیے اس مسئلے کو اٹھا کے رکھ دیں۔ جو فیصلہ وہ کرے گا مجھے اور دراب کو اعتراض نہیں ہوگا۔ نہ تو اس خاندان میں دو بیویاں رکھنے کا یہ پہلا واقعہ ہوگا اور نہ ہی عمروں کا فرق کوئی انہونی چیز ہے یہاں سب ہوتا چلا آیا ہے۔" افراسیاب خٹک نے تسلی دی۔

باچا جان کو آکسیجن لگانے کے بعد نرس اسکی طرف متوجہ ہوئی۔

"اٹھو، بے بی کیا تم سن رہی ہو...... ہیلو۔" اس کے گال تھپتھپانے کے ساتھ ساتھ وہ اس پہ پانی کے چھینٹے بھی دیتی گئی۔اب مقدس کے لیے بے سدھ پڑے رہنے کی ایکٹنگ کرنا دشوار ہو گیا۔ وہ ہلکا سا کسمسائی۔اسے اٹھتا دیکھ کر وہ تینوں یوں چونکے جیسے اب تک اس کی موجودگی سے لاعلم ہوں۔ کمرے میں ایک بار پھر سکون چھا گیا۔ وہ نرس کا سہارا لیے دھیرے دھیرے چلتی کمرے سے نکل گئی۔اس نے نجانے کون سی ٹیبلٹ کھلائی تھی کہ سر بھاری ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں نیند سے بوجھل۔

☆☆☆

''ہیلو سویٹ کزن، کمال ہوگیا آج تو، اتنی لمبی نیند؟'' آنکھ کھولتے ہی خود پہ شناور کو جھکے پایا۔ وہ تکیہ اونچا کر کے ذرا سا اٹھ بیٹھی۔ دماغ ابھی بھی نیم خوابیدہ تھا لیکن پورا وجود سبک سا ہو رہا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے ہونے کے اس احساس کو سرٹیک کر پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ سے آنکھ بند کرتے ہی باچا جان کے کمرے میں ہونے والی کارروائی کی بازگشت سنائی دینے لگی وہ ایک جھٹکے سے بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟ ابھی طبیعت نہیں سنبھلی کیا؟'' شناور تشویش سے بولی۔

''نہیں اب ٹھیک ہوں میں، پہلے سے بہت بہتر۔''

مقدس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ ''شانو...... تمہارے پاس بابا جان کی اسٹوڈیو کی چابی ہے ناں؟''

''ہاں...... ابھی تک میرے ہی پاس ہے، کچھ فوٹو گرافس ہیں، ماموں جان کے کھینچے ہوئے جن سے میں لینڈ اسکیپ کے آئیڈیاز لینا چاہتی ہوں، لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔'' وہ حیران تھی کل تک تو وہ کوئی دلچسپی نہیں لینا چاہتی تھی۔

''آج رات کو وہ چابی مجھے دے دینا۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''ابھی لو، رات تو ہو چکی، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ جناب، آپ پورے پانچ گھنٹے سوئی ہیں۔'' اس نے گچھا اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''لیکن نہیں، پہلے تم کچھ کھا لو، وگمہ سے کھانا منگواتی ہوں، وگمہ...... وگمہ۔'' وہ کمرے کے دروازے سے جھانک کر ملازمہ کو بلانے لگی۔

''سنو شانو، مجھے کافی کے ساتھ بسکٹس یا ایک آدھ سینڈوچ منگوا دو، بس اور کچھ نہیں۔'' کافی آنے کے بعد وہ جلدی جلدی سینڈوچ نگلنے لگی۔ گرم گرم کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی نظریں بے تابی کے ساتھ لمبی نقرئی چابیوں والے اس گچھے پہ پھسلتی رہیں۔

''میں چلوں تمہارے ساتھ۔'' اسے گرم شال لپیٹتے دیکھ کے شناور نے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے آواز قدموں کے ساتھ لمبی راہداری میں مڑ گئی۔ راہداری کے اس طرف سب لڑکیوں کے کمرے تھے اور سامنے کی لائن میں دو اسٹور رومز کے درمیان بی بی جان کا بڑا کمرہ تھا جس میں سارا دن ملازماؤں اور مہمان خواتین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد کوئی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ انہیں جلد سو جانے کی عادت تھی۔ مقدس کو ان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل واپس کمرے میں پہنچنا تھا۔ راہداری کا موڑ کاٹ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ گولائی میں، نیچے لاؤنج میں نیم تاریکی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ بائیں جانب باچا جان کے کمرے میں موجود نرس اور اٹینڈنٹ ساری رات چوکس رہتے ہیں، سامنے کھانے والے کمرے اور ڈرائنگ روم کی لائٹس بھی آف تھیں لیکن ان کے پیچھے وسیع کچن میں اس وقت تمام ملازمائیں ہلکی پھلکی گپ شپ کے ساتھ سارے دن کا پھیلاوا اسمیٹ رہی ہوں گی اور دائیں جانب دراب چچا کے حصے میں بھی زندگی جاگ رہی ہوگی۔

انوشہ اور پلوشہ کے کمرے تو اُوپر والے پورشن میں اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھے لیکن ان کے بھائیوں کے کمرے والدین کے ساتھ ہی متصل تھے۔ دراب چچا کی راتیں جاگتی تھیں اب بھی مردانے میں، جسے ان کے ہاں ''حجرہ'' کہا جاتا ہے۔ ان کے دوستوں کی محفل عروج پہ ہوگی۔ اگرچہ حجرہ اس عمارت سے باہر لان کے دائیں طرف بالکل الگ تھلگ ہے لیکن مقدس جانتی تھی کہ چچی جان دراب چچا کی غیر موجودگی میں سوئی جاگتی

کیفیت میں رہتی ہیں اور رات بھر اُٹھ اُٹھ کر کچن میں جا کر ملازماؤں کے ہاتھ کبھی چائے، کبھی قہوہ خشک میوہ جات کے ساتھ بھجواتی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ نہایت احتیاط سے چلتی ہوئی اوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس نے سیڑھیوں کی لائٹ بھی آن نہیں کی۔ حتیٰ کہ ہاتھ میں دبی ٹارچ کی مدد بھی نہ لی۔ اوپر آ کے اس نے اندھیرے میں آنکھیں پوری کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔

سامنے کی طرف ٹیرس سے لان میں جلتی لائٹس کی روشنی اندر تک آ رہی تھی، ساتھ ہی رات کے اس پہر کی ٹھنڈک تمام تر سفاکی کے ساتھ ہڈیوں میں اُترتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس پورشن میں پہلی بار آئی تھی۔ یہاں بابا جان کا بیڈ روم، ان کی اسٹڈی اور اسٹوڈیو تھا۔ اس نے سب سے پہلے دروازے میں ایک ایک کر کے چابیاں لگانا شروع کر دیں۔ اگرچہ شناور نے اسے چابیوں کے نمبر بتا دیئے تھے لیکن تاریکی کی وجہ سے وہ نمبر پڑھنے سے قاصر تھی اور کمرے میں جانے سے پہلے لائٹ جلانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آخر کار چوتھی چابی ڈالتے ہی لاک ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

اس نے ہینڈل گھما کے دروازہ دھکیلا، کم استعمال ہونے کی وجہ سے دروازے میں چرچراہٹ سی پیدا ہوئی اس نے سہم کے خود کو ساکت کر لیا اور دم سادھ کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے دروازہ مزید کھولنے کی بجائے ترچھا ہو کے سرکتے ہوئے اندر آنا زیادہ بہتر جانا۔ اندر کی خنک تاریکی میں اس کے جسم پہ ایک عجیب سا لرزہ طاری ہو گیا۔ کئی منٹ لگا کے آہستہ آہستہ رک رک کے اس نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ اس سے پہلے وہ اس کمرے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اس لیے اندازے کے ساتھ ٹٹولتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی اور پردے برابر کرنے کا اطمینان کیا تا کہ اندر کی روشنی باہر نہ جائے۔ پہلے اس نے ٹارچ آن کی، ہلکی زرد روشنی میں سفید سفید لمبے چوڑے سائے اسے خوفزدہ کر گئے۔ جلدی سے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کے اکٹھے دو تین بٹن نیچے کر دیئے۔ ٹیوب لائٹ کے ساتھ ایک لیمپ اور پنکھا بھی آن ہو گیا۔ وہ لمبے سفید سائے دراصل جہازی سائز کے صوفوں اور بیڈ پہ ڈھکی سفید چادروں کے تھے۔ پنکھے کی تیز ہوا نے اس کے دانت کڑکڑا دیئے۔ پھر سے پنکھے اور ٹیوب لائٹس کے بٹن آف کرتے ہوئے وہ لیمپ کی خوابناک روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

شناور نے پہلے ہی بتایا تھا کہ اس کمرے میں اس کے بابا جان اور مما کی کوئی تصویر موجود نہیں، پھر بھی اس نے ڈریسنگ ٹیبل اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبلز کی ایک ایک دراز کو کھنگال لیا۔ ان میں پرانے اخبار، چند ایک کاروباری نوعیت کی بوسیدہ فائلز اور رسالے موجود تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر کنگھی، چاندی کا جیولری باکس موجود تھا۔ درازوں میں ڈھیروں پراندے اور سوکھے گجرے پڑے تھے، لیکن کہیں اس کے ماں باپ کی کوئی تصویر موجود نہ تھی۔ شاید کسی نے پورا کمرہ جوں کا توں چھوڑتے ہوئے صرف اس جگہ سے اس کی ماں کی موجودگی کے اثرات کو غائب کیا تھا وہ بغلی دروازہ کھول کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ دیواروں پہ کئی قدرتی مناظر مہارت سے پینٹ کیے ہوئے تھے۔ زمین پہ رنگوں کے ڈبوں اور ٹیوبز کا خشک ہوا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ گرد سے اٹا پڑا تھا شاید صفائی کرنے والے نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

لان میں کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ شاید نیچے کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس درز سے آتی ٹھنڈی ہوا اسے کپکپائے دے رہی تھی۔ شیلف میں ڈھیروں البمز اور نگیٹو پڑے تھے۔ اس ایک آدھ گھنٹے کے دوران اسے ان تصویروں میں سے کچھ ایسے اسرار ہر قیمت پہ حاصل کرنے تھے جو اس گتھی کو سلجھا سکیں۔

''لیکن اس سے پہلے کیوں نہ میں اسٹڈی میں بھی ایک نظر ڈال ہی لوں۔'' اس نے سوچا اور اسٹڈی کے دروازے میں چابی گھمائی۔ اگر چہ شناور پہلے ہی اسے آگاہ کر چکی تھی کہ اسٹڈی کی تمام بکس وہ دیکھ چکی ہے اور ان میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو اس کی الجھن ختم کر سکے۔ پھر بھی وہ طائرانہ نظروں سے تمام شیلفوں اور الماریوں کا جائزہ لینے لگی۔ بلاشبہ کتابوں کی یہ کولیکشن اس کے بابا جان یا مما کے ذوق کی عکاسی کر رہی تھی کہیں کلاسک انگلش لٹریچر کا خزانہ تھا تو کہیں جدید اردو شاعری کا ذخیرہ، سیاست، تاریخ اور مذہب پہ بھی لٹریچر موجود تھا۔ ایک بند الماری کے آگے وہ رک کے کھڑی ہو گئی۔ شیشے میں سے نظر آتی سیاہ مخملیں جلد والی وہ موٹی موٹی کتابیں، جن پہ کوئی نام نہیں لکھا تھا، البمز بھی ہو سکتی تھیں اور ڈائریاں بھی۔ اس نے بے تابی سے تمام چابیاں ایک ایک کر کے اس میں گھمانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ جھنجھلاہٹ سے اس نے ہنڈل کو کئی جھٹکے دیئے پھر مزید وقت ضائع نہ کرتے ہوئے دوبارہ اسٹوڈیو آ گئی۔

ایک کے بعد ایک البم کھولتے ہوئے وہ حیران ہوتی گئی۔ سوئٹزر لینڈ، فرانس، اسکاٹ لینڈ سے لے کر اہرام مصر، خانہ کعبہ تک کے مناظر عکس بند کیے گئے تھے۔ تاج محل سے لے کر نیا گرا فال کی رفتار تک کیمرے کی زد میں تھی۔ وہ دس بارہ البمز کھنگال بیٹھی لیکن اس سے سوائے اس راز کے اور کچھ ثابت نہ ہوا کہ اس کے بابا جان نہ صرف ایک حساس مصور ہیں ایک ماہر فوٹو گرافر ہیں بلکہ ایک سیلانی سیاح بھی رہ چکے ہیں۔ اس نے وقت کی کمی کے پیش نظر باقی البمز دیکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بی بی جان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی اس لیے تمام البمز ترتیب سے رکھیں۔ ایک کونے میں ایک میلا کچیلا سا تولیہ کسی کھونٹی پہ لگا تھا۔ تولیے کا ایک کونا چند البمز کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ تجسس سے بے قرار ہو کے وہ جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس طرف بڑھی۔ شاید کسی نے ارادتاً ان البمز کو ڈھک کے رکھا ہو۔ اس نے تولیہ کھینچا اور ان البمز کا جائزہ لیا، ایک تو پھولوں کی کسی نمائش کی تھی اور دوسرے کے ٹو کو سر کرنے والے کوہ پیماؤں کے کسی گروپ کی۔

اس نے سخت مایوسی کا شکار ہوتے ہوئے دھول میں اٹے اس اکڑے ہوئے بدرنگ تولیے کو دوبارہ کھونٹی سے لٹکانا چاہا تو وہاں جھولتی ایک سنہری چابی پہ اس کی نظر جم گئی۔ ایک زنجیر کے ساتھ دوسرے کونے پہ دل نما کوئی چیز جھول رہی تھی اس نے چابی اتار لی اور میکانکی انداز میں اسٹڈی میں گھس گئی، مقفل الماری میں وہ سونے کی چابی گھماتے ہی کلک کی آواز آئی اور مقدس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ بابا جان کو مصوری، سیاحت اور فوٹو گرافی کے ساتھ ساتھ ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک ترتیب کے ساتھ سال بہ سال لکھی سیاہ کور والی ڈائریاں اپنے اندر اس کے ہمہ صفت باپ کے کتنے راز چھپائے پڑی تھیں۔ چوہتر، پچھتر، چھہتر سے ہوتے اس کے ہاتھ انیس سو اسی کی ڈائری پہ رک گئے۔ یہ اس کی پیدائش سے ایک سال پہلے کا سن تھا اور یہی یہاں موجود آخری ڈائری تھی۔ اس نے شال کے اندر اسے کسی متاع عزیز کی طرح چھپایا اور جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

''خیریت تو ہے بہت دیر لگا دی۔'' شناور حسب توقع اس کے انتظار میں دروازے پہ ہی تھی۔

''ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا۔'' اس نے شال ایک طرف پھینکی۔ وہ جس طرح ٹھٹھرتی ہوئی گئی تھی، اب اتنی ہی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

''کچھ ملا؟''اس نے پانی کا گلاس اسے تھمایا جسے مشکور نظروں سے تھماتے ہوئے وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

''یہ ڈائری''اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری لہراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔شناور نے کچھ اور کہنا فی الحال مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنے رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی اسے نوٹس مکمل کرنا تھا۔

لحاف میں دبک کر کانپتی انگلیوں،دھڑ دھڑ کرتے دل اور پیاسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ڈائری کھولی۔

۱۲ مئی ۱۹۸۰ء

تھکاوٹ سے جسم ٹوٹ رہا ہے اور یہ تھکاوٹ پورا ایک مہینہ گھر گزارنے کی ہے۔ پیر کے چکر کہیں ٹک کے بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ایک مدت ہوئی گھر میں اتنا وقت گزارے ہوئے لیکن زرسانگہ باجی کی شادی،اتنے ڈھیروں کام۔اتنی ذمہ داریاں...... بڑے لالہ کا پہلا پہلا الیکشن تھا تو دراب کا لاسٹ سمسٹر دونوں کی تمام تر توجہ اسی جانب پا کے باچا جان نے مجھ پہ نظریں لگائیں تو میں نے بھی اپنی سیلانی فطرت کو کچھ روز کے لیے تھپک کے سلا دیا اور اپنی اکلوتی بڑی بہن کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔بے جی،میری اپنی ماں بھی انہیں سگی بیٹیوں جیسا پیار ہی کرتی تھیں حالانکہ بی بی جان سے ان کی کم ہی بنتی تھی۔افراسیاب لالہ کے بعد ان کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں تو مگر زیادہ دن جی نہ سکیں اور جب بی بی جان کے پہلوٹھی کی بیٹی ہوئی تو بے جی نے کتنی خواہش کی تھی کہ اب ان کے ہاں بھی ایک بیٹی ہو۔زرسانگہ جیسی پیاری پیاری سی،لیکن میں آ گیا ان کا دوسرا بیٹا۔ پھر وہ جتنا عرصہ زندہ رہیں بیٹی کے حصے کی ممتا انہی پہ لٹاتی رہیں۔اسی لیے زرسانگہ باجی سے میرا تعلق اور گہرا ہو جاتا ہے ان میں مجھے بے جی کی خواہش کا عکس جھلملاتا نظر آتا ہے۔ کتنے پریشان رہتے تھے سب ان کے لیے وہ خاندان جس میں سولہ سترہ سالہ لڑکی کا بن بیاہے رکھنا ہی ممنوعہ ہو وہاں میری بہن تیسواں سال شروع ہونے تک بھی...... خیر...... شکر ہے رب العزت کا جس نے آفریدی خاندان کی نظر اس پہ ٹھہرا دی۔اس خاندان سے ہمارے اور بھی رشتے نکلتے ہیں اس حوالے سے یہ لوگ ہمارے لیے اجنبی بھی نہیں۔اپنے ہی اپنوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں یہ بات بی بی جان اکثر کہا کرتی ہیں۔

رحیم گل آفریدی عمر میں زرسانگہ باجی سے چند برس چھوٹا ضرور ہے لیکن آفریدی اور خٹک خاندان میں اتنا کچھ ہوتا چلا آیا ہے کہ اب کچھ بھی انہونی بات نہیں لگتی۔اب باچا جان کو ہی لیجیے۔ان کے والد اور والدہ دونوں اپنے اپنے بھائیوں کی بیٹیاں لانا چاہتے تھے،باچا جان نے میری بے جی یعنی اپنی چچا زاد سے شادی کے ڈیڑھ برس بعد ہی بی بی جان یعنی اپنے ماموں زاد سے بھی نکاح کر لیا اور اس کے علاوہ......اب کیا کیا لکھوں۔ رشتوں کی ڈور میں اتنے بل ہیں کہ ایک کا ذکر چھیڑو تو دوسرا قصہ نکلتا چلا آئے اسی لیے تو میں سارے ماحول سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ہر وقت خاندانی مسائل،جائیداد کی تقسیم کے تنازعے،وراثتی جھگڑے،وٹہ سٹہ،وغیرہ وغیرہ۔میں تو بس منہ کا ذائقہ بدلنے سال میں دو تین بار ایک آدھ ہفتہ یہاں رہنے چلا آتا ہوں۔اس بار بھی کچھ زیادہ دن لگ گئے۔کل ہی شادی کے ہنگامے ختم ہوئے ہیں اور میں سخت بوریت محسوس کر رہا ہوں۔آج رات سونے سے پہلے یہ فیصلہ کر کے رہوں گا کہ میرا اگلا پڑاؤ کون سا ہوگا۔

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

کل رات جب میں اپنے متوقع سفر کی بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مصر، لبنان اور شام سے لے کر چین، ملائیشا، نیپال تک اور فرانس، امریکہ سے لے کر سوئٹزرلینڈ اور جاپان تک میں آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکا تھا اور ان ہی جگہوں پہ دوبارہ جانے کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا۔ میری آنکھ کیمرے کی آنکھ ہے۔ ایک بار جو منظر دیکھ لوں ذہن کی سلیٹ پہ نقش ہو جاتا ہے اور میں ہو بہو اسے کینوس پہ آنکھ بند کر کے بھی اتار سکتا ہوں اس لیے کئی بار کی دیکھی جگہیں میرے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ اسی ذہنی کشمکش میں مجھے فیروز خان وردگ کی آفر یاد آئی۔

پچھلی سردیوں میں جب باچا جان کے ساتھ ان کے دوست بسم اللہ جان کی شکار کی دعوت پہ سوات گیا تھا تو وہیں فیروز سے ملاقات ہوئی تھی۔ بسم اللہ جان والی سوات کے خاندان سے ہیں۔ سوات کے آخری ولی عہد کیپٹن میاں گل اورنگ زیب خان ان کے والد کے قریبی عزیز تھے۔ اسی حوالے سے پورے سرحد اور خصوصاً آزاد قبائل کے چیدہ خاندانوں کے خان مدعو تھے ان میں یوسف زئی بھی تھے، شنواری اور خٹک بھی اور وردگ بھی بعض ٹیپکل خان حضرات تھے بعض اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش میں مصروف ان ہی میں فیروز خان وردگ مجھے چونکا گیا۔

غضب کا ذہن پایا ہے اس شخص نے تعلیم اگرچہ اس کی رسمی سی ہے لیکن اس کی ذہنی اپروچ اور پختون تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات قابل رشک ہیں۔ بہت کم وقت میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی، میری اس سے۔

میرے سیاحت کے شوق کے بارے میں جان کے اس نے مجھے آفر کی تھی کافرستان وادی کیلاش کے دورے کی، اس کی زبانی وہاں کے واقعات سن سن کر میں تو تب ہی ارادہ کر چکا تھا جانے کا لیکن فیروز نے منع کر دیا کہ سردیوں میں برف باری وہاں تک کے تمام رستے مسدود کر دیتی ہے، ان علاقوں میں جانے کا آئیڈیل وقت مئی سے ستمبر تک کا ہے۔ اس سے کیا وعدہ یاد آنے پر میں نے فوراً ہی وہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ کل ہی صبح فجر کے بعد میں پشاور سے سوات کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ انشاءاللہ

۱۴ مئی ۱۹۸۰ء

اس وقت میں فیروز خان کی سفید اینٹوں سے بنی حویلی کے مردان خانے کے منقش جالی کے پاس بڑے سے گیس لیمپ کے نیچے بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ رات گئے تک فیروز کے دوستوں کی محفل جمی رہی میری آمد کی خوشی میں اور اب وہ مجھے گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کی تاکید کرتے ہوئے گیا ہے تاکہ صبح کا اُجالا پھیلتے ہی سفر پہ نکل جائے لیکن میں بھلا ڈائری لکھے بغیر سو سکتا ہوں۔

یوں تو میں سات آٹھ بجے کے درمیان ہی سوات پہنچ گیا تھا لیکن فیروز کے گھر شام کو آیا۔ اس کی رہائش سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں ہے وہاں تک پہنچ کے اس کی حویلی جاتے ہوئے عجیب سی جھجک نے مجھے آن گھیرا درمیانی عرصے میں، میں نے اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا اور اب اچانک اسے میزبان کا شرف بخشنے پہنچ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کسی ہوٹل کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیزن ہونے کی وجہ سے سرینا، مرغزار اور پی ٹی ڈی سی جیسے پائے کے تمام ہوٹل بک تھے۔ میں نے نسبتاً درمیانے درجے کے ''ریلم'' میں کمرہ بک کروایا اور وہاں پہنچ کے فیروز سے رابطہ کیا لیکن وہ گرم جوش پٹھان زادہ میری آواز سنتے ہی دیوانہ ہو گیا اور چند منٹ کے اندر اندر مجھے لینے آ گیا۔

سوات کے پر رونق بازار گھماتا ہوا وہ مجھے اپنی حویلی لے کے آیا۔ پر تکلف پکوانوں، خوشبودار قہووں کے درمیان گپ شپ لگاتے کب رات بیت گئی پتا ہی نہیں چلا، اب مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کچھ دیر کمر سیدھی کر ہی لی جائے۔

۱۵ مئی ۱۹۸۰ء

اور اس وقت میں گویا جنت کے ایک قطعے پہ بیٹھا خود کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ میں واقعی اس منظر کا ایک حصہ ہوں۔ مجھے حیرانی ہے کہ پشاور میں رہنے کے باوجود میں اپنے اس قدر قریب واقع ان حسین وادیوں سے اب تک انجان کیسے رہا، دنیا بھر سے لوگ نجانے کتنا کتنا لمبا سفر طے کر کے یہ جنت نظیر مقام دیکھنے آتے ہیں۔ فیروز نے بتایا۔

''سوچیان، فاھان، سانگ یون، ھیون سانگ اور اوگیان پا کے سفرنامے کیلاش کے چپے چپے کے قصیدوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ بدھ مت کا متبرک مقام بھی ہے۔ دنیا بھر سے بدھ مت کے ماننے والے یہاں اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ سوات کا ایک سابق بادشاہ ''اجی تابا'' بدھ مت کا مذہبی رہنما بھی تھا اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور واپس لوٹے گا وہ دن بدھ کا اور تاریخ ۲۶ ہو گی۔''

اس کے علاوہ بھی اس نے ان اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی سیاحوں کے اقتباسات سنائے جو سوات اور کیلاش سے مسحور ہو کے رہ گئے تھے۔ حقیقتاً میں بھی اس وقت دنگ رہ گیا تھا جب سیدو شریف سے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پہ واقع مشہور چوٹی ''فلک سیر'' میری نگاہوں کے سامنے آئی۔ میرا تو دل ہی نہ چاہتا تھا اتنی جلدی وہاں سے کوچ کرنے کو لیکن سفر طویل بھی تھا اور پر پیچ و دشوار گزار بھی۔

''تم کہاں رکو گے۔ یہاں سے ایوان تک کا راستہ یوں پھولوں سے لدا اور کہساروں، آبشاروں سے بھرا پڑا ہے لیکن اب ہمیں ایوان تک بغیر رکے سفر کرنا ہے۔'' فیروز نے تنبیہ کی۔

''ایوان؟'' میں اپنی لاعلمی پہ خاصا شرمندہ تھا۔

''ہاں چترال سے آگے یہ سرسبز گاؤں کافرستان کا دروازہ کہلاتا ہے۔ یہاں سے ہی کیلاش کی وادیوں کو راستے نکلتے ہیں۔''

''کیا یہ کوئی ایک وادی نہیں ہے۔''

''نہیں وادی کیلاش بمبوریت، بریر اور رمبو نامی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ تینوں کا قدیم مذہب آتش پرستی اور ناگ پرستی ہے لیکن یہ لوگ تین قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں بظاہر ان کا بود و باش ایک سا ہے لیکن بمبوریت نسبتاً ترقی یافتہ کہلایا جا سکتا ہے۔'' ایوان پہنچ کر فیروز نے جیپ اپنے ایک جاننے والے مقامی شخص کے حوالے کی۔ ''ان راستوں پہ ڈرائیونگ صرف یہاں کے ماہر ڈرائیور ہی کر سکتے ہیں۔''

''تو اب ڈرائیور کہاں سے لیا جائے۔'' اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے میں فکر مند تھا۔

''چلو اڈے چلتے ہیں، وہاں دن میں ایک دو بار ویگن آتی ہے اور مسافر بھر کے ''دو باش'' لے جاتی ہے۔'' اڈے پہ کئی سیاح گروپ بنائے کھڑے تھے، کچھ ہی دیر میں ایک بس آئی اور سب لوگ کرایہ ملا کے ڈرائیور کو دینے کے بعد اپنے اپنے سامان سمیت اس پہ سوار ہو گئے۔ فیروز کا کہنا درست تھا واقعی اس پر خطر پہاڑی راستے پہ ڈرائیونگ کرنا، اناڑی شخص کے لیے رسکی تھا۔ دو باش کے مقام پہ فیروز کا ایک مقامی دوست ژان

خان جیپ لیے کھڑا تھا۔ منحنی سا وجود، سرخ وسفید رنگت، بادامی شلوار سوٹ پہ براؤن جیکٹ سیپوں سے بھری ہوئی قلعی والی روایتی ٹوپی کے ساتھ وہ خوش مزاج شخص، حد سے زیادہ مہمان نواز لگ رہا تھا۔ راستے میں میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''یار افیروز خاناں، یہ بندہ ژان خاں کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ژان بھی اور خان بھی۔ ژان تو بدھسٹ نام ہے تو پھر یہ خان؟'' وہ زور سے ہنس پڑا۔

''آگے آگے دیکھو، ہوتا ہے کیا۔ یہاں ایسے ایسے نام سننے کو ملیں گے کہ بس۔ یہ لوگ پکارنے کے لیے کوئی بھی نام رکھ لیتے ہیں۔ نہ مطلب کھنگالنے کی فکر، نہ مذہب وقوم کا خیال۔ یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں کے نام پہ بھی یہ اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ ویسے ژان خان شیعہ مسلم ہے۔ یہ کیلاش کے قصبے کا رہنے والا ہے، بمبوریت کی کافر آبادی سے نہیں میں نے کہا ناں یہاں دو تہذیبوں کا میل ہے۔

قصباتی لوگ اکثر تو مسلمان ہی ہیں، سکھ اور اکا دکا ہندو بھی نظر آجاتے ہیں۔ انکی زبانیں پشتو کے علاوہ گوجری، کوہستانی اور کشمیری بھی ہیں۔ صدیوں سے چلی آرہی اپنی تہذیب وتمدن اور مذہب میں یہ رتی بھر تبدیلی کرنے پہ تیار نہیں۔ یہ اپنا مخصوص لباس پہنتے ہیں، اشوجی اور گاروی زبان بولتے ہیں اور اپنی قوم میں کسی انقلاب اور جدت کے سخت خلاف ہیں۔ ہاں ناموں کے سلسلے میں یہ اُصول کچھ کمزور ہیں۔ یہاں کوئی ڈیوڈ ہے کوئی رام لعل، کوئی پھول خان ہے تو کوئی گو بھی خان، کوئی سکندر ہے تو کوئی بندر۔''

''ڈونٹ ٹیل می یار۔'' میں ہنسنے لگا۔

''ابھی دیکھنا ذرا تم'' اس نے گیٹ پہ بیٹھے چوکیدار کو پشتو میں مخاطب کیا۔

''سنگے ایران چاچا؟'' (کیسے ہو ایران چاچا؟'')

''سخیر راغلے سخیر راغلے۔'' (خوش آمدید، خوش آمدید) وہ اس کے ہاتھ چومتا ہوا مزاج پرسی کرنے لگا۔

''یہ کمانڈر خان ہے اور یہ اس کا بھائی جرنیل خان۔'' اس نے آٹھ سال کی عمر کے دو جڑواں لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ژان کے بھائی پان خان کے بیٹے ہیں اور یہ ہے مجرے کا نائی، غضب کا فنکار ہاتھ ہے اس کا، انجیر نام ہے اور یہ مسٹر جناح بڑے کمال کے ڈرائیور ہیں، یہی ہمارے گائیڈ کا کام بھی کریں گے۔''

اس نے فرداً فرداً ان سب دلچسپ ناموں والی ہستیوں کا تعارف کرایا اور پھر ہم حجرے میں چلے آئے۔

رات کے سائے پھیل رہے تھے لیکن تاریکی اس حسن کو میری نظر سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتی جو صبح کے پہلے اجالے کے ساتھ میرے حواسوں پہ چھانے والا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۰ء

وادی کیلاش میں آج صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہونے والا میں پہلا شخص تھا یا شاید میں تو سورج کے طلوع ہونے سے بھی پہلے ہی حجرے کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ نیلگوں تاریکی میں پو پھٹنے تک میں حجرے کے احاطے میں موجود مخملیں گھاس پہ ہی ٹہل کر وہاں کی فرحت افزا

اور خوشبوؤں بھری فضا کی تازگی اپنے اندر اتارتا رہا۔

فیروز کے سونے کے انداز سے تو ظاہر ہوتا تھا وہ اور دو تین گھنٹے تک جاگنے کے موڈ میں نہیں۔ میں اسے جگاتے جگاتے رہ گیا۔ یہی کم تھا کہ وہ دوستی اور میزبانی کے تقاضے نبھاتے ہوئے میرے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ اپنے کاروبار اور بیوی بچے کو چھوڑ کر، مجھ جیسے ہر ذمہ داری سے آزاد، بے فکرے سیاح کا ساتھ دینے کے لیے۔ اتنی صبح صبح اس کی نیند خراب کرنے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ ایران چاچا بھی شاید رات بھر کی چوکیداری کے بعد اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔

مرغ کی کڑک دار بانگیں پرسکون فضا کا سینہ چیرے دے رہی تھیں۔ مرغ کی آواز کے ساتھ ہی مجھے سیدو شریف میں گزاری رات یاد آ گئی۔ جب فیروز خود بھی حلق تک بھنی مرغی ٹھونس رہا تھا اور مجھے بھی بے تحاشا کھانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے ٹوکا کہ ''کیا آج سے پہلے کبھی مرغی نہیں دیکھی، یا آج کے بعد دیکھنے کو نہیں ملے گی کیا، جو دیگر پکوان چھوڑ کر بے چاری مرغی کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو'' تو اس نے ایک دلچسپ انکشاف کیا تھا۔

''کیلاش میں باورچی، نائی اور چوکیدار وہاں کی مقامی آبادی کے ہوتے ہیں اور کافرستان کے مذہب میں مرغ حرام ہے۔ اس لیے کسی کیلاش باورچی کے ہاتھ میں مرغ پکانے کے لیے دینا گویا اس کی مذہبی عقیدت پہ وار کرنا ہے اس لیے خوچہ جتنی مرغی کھانی ہے آج ہی کھا لو نجانے اور کتنے ہفتے دنبے اور بطخیں کھانی پڑیں۔''

اس کا ندیدے پن سے مرغی پہ مرغی اڑانا یاد کر کے میرے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ دور کہیں سے فجر کی اذان سنائی دینے پر میں لکڑی کا پھاٹک کھول کے سرمئی پتھروں والی گلی میں آ نکلا۔

سامنے ڈھلان کی جانب سے ایک سیاہ پوش وجود بغل میں گھڑونچی دبائے قدم بہ قدم ابھر رہا تھا۔ ٹی وی یا میگزینز میں کلام کے اس روایتی لباس اور زیور کے ساتھ کئی بار وہاں کی دوشیزاؤں کو دیکھ رکھا تھا لیکن...... پہلی بار ایک کلاش دوشیزہ کو آتے دیکھ کے میرے قدم خود بخود رک گئے۔ وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ملگجے سے اجالے اور ہلکی ہلکی دھند میں اس کے نقوش واضح نہ تھے۔ لیکن قد آور سراپا مکمل خود اعتمادی کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ اس کے لبوں سے چند ناقابل فہم الفاظ والا ایک جملہ نکلا تھا شاید اس نے اپنی مقامی زبان میں گھڑونچی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ میں احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ لڑکی سمجھدار تھی، میرے کچھ کہے بغیر ہی سمجھ گئی اور اب کے پشتو میں مخاطب ہوئی۔

''بکری کا تازہ دودھ ہے صیب، کتنا لو گے؟'' اپنی مادری زبان میں اسے بولتے دیکھ کے مجھے عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔ پوری دنیا گھوم چکا تھا میں، مختلف ممالک میں بھانت بھانت کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا مجھے بھنورا صفت یا رنگین مزاج کہنا تو کس طور جائز نہ ہوگا۔ بہر حال صنف نازک سے قطعی پرہیز مجھے بھی نہیں رہا۔ اٹلی کی سلویا اور قاہرہ کی نجوا سے میری اچھی خاصی دوستی رہی، لیکن کیا کیا جائے رگوں میں ابلتے اس خون کی تاثیر کا۔ میرے اندر کا پختون زادہ اپنی فضاؤں میں آ کے پورے کروفر سے سر اٹھا لیتا تھا۔ اپنی برادری اور خطے کی خواتین کو سامنے پا کے میں کبھی بھی بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے خاندان میں فرسٹ کزنز سے بھی عمر کے ایک حصے میں آ کے پردہ کر لیا جاتا ہے۔ حویلی کے زنانہ اور مردانہ حصوں کے ملازمین تک کے سلسلے میں احتیاط کی جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے زنان خانے میں مرد ملازم کا جانا محال ہے اسی طرح بی بی جان مردان خانے اور حجرے میں گھریلو ملازماؤں کا جانا بھی پسند نہیں کرتیں اور اب سحر کی اس اولین ساعت میں، دور دور تک پھیلے سناٹے اور تنہائی میں ایک لڑکی کو خود سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پہ اپنی مادری زبان میں خود سے مخاطب پا کے میں ایک لمحے کے لیے بھول ہی گیا کہ وہ ایک غیر قوم، غیر مذہب لڑکی ہے۔ قصداً ذرا سا ایک جانب ہو کے میں نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اندر جا کے گھر کی خواتین سے پوچھ لو۔'' اس نے گھڑونچی سنبھالتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھایا اور ایک ٹٹولتی ہوئی مگر سرسری سی نظر مجھ پہ ڈالی۔ غضب کا اعتماد تھا اس کی بے پرواہ چال میں۔ میں آگے بستی کی طرف بڑھ گیا۔ دو گلیاں پرے ایک کچی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور ٹہلتا ہوا واپس آ گیا۔

ناشتا ژان خان کے گھر کے اندرونی حصے میں ہوا۔ میں گھریلو خواتین کی موجودگی میں کچھ ان ایزی فیل کرتا رہا، لیکن شاید ژان کی ماں، بہنیں وغیرہ سب فیروز سے خاصی بے تکلف تھیں۔ وہ پشتو نہیں جانتی تھیں اور میں ان کی زبان سے نابلد، البتہ فیروز ٹوٹے پھوٹے الفاظ، کچھ ہاتھ کے اشاروں کے ذریعے اور کچھ ژان کے بھتیجوں کمانڈر اور جرنیل کی مدد سے مسلسل شامل گفتگو رہا۔ ناشتے کے دوران کیلاش ملازمائیں اندر آتی جاتی رہیں کوئی دسترخوان بچھانے، کوئی گرم روٹی پیش کرنے۔ ایک وہیں بیٹھی پھل کاٹ رہی تھی۔ اور دو چار نوعمر لڑکیاں کونے میں لگیں کھسر پھسر اور کھی کھی کر رہی تھیں اور فیروز کے فقروں پہ کھلکھلاتی رہی تھیں۔ اس نے میرا گریز بھانپ کے مجھے گفتگو میں شریک کرنا چاہا۔

''یار ازریاب تو ان کے نام نہیں پوچھے گا۔ ذرا دیکھ تو سہی حسن و شباب کے ان شاہکاروں پہ لیبل کیا کیا لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے مسکرا کے ٹالنا چاہا، مجھے خواتین کو یوں تحقیر بھرے انداز میں موضوع گفتگو بنانا پسند نہ تھا پھر چاہے وہ کوئی ان پڑھ، گھریلو ملازمہ یا کافر پہاڑن ہی کیوں نہ ہو، لیکن شاید وہ لوگ بھی ان دوشیزاؤں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے عادی تھے اور وہ بھی ان صاحب لوگوں کے ساتھ خاصی کھلی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''یہ دیکھو سب سے پہلے تمہارا تعارف ''غٹ شنڈے'' سے کراتا ہوں۔'' اس نام پہ میں نے بے ساختہ سر اٹھا کے سامنے دیکھا اور اس مسکراتی ہوئی اجڈ سی لڑکی کو دیکھ کے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا۔ جس نے بھی یہ نام رکھا تھا بڑا ہی ''برجستہ'' رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی چیز اگر نمایاں تھی تو وہ عنابی رنگ کے خاصے بڑے بڑے ہونٹ تھے جو پیلے دانتوں کو خاصی حد تک ڈھانپے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بلاشبہ بے حد شفاف اور معصوم سی تھیں لیکن لمبے لمبے پیلے دانتوں اور موٹے لٹکے ہوئے ہونٹوں کا کمبی نیشن اس کی آنکھوں کا حسن غارت کر رہا تھا۔ ''غٹ'' پشتو میں بڑا کو اور ''شنڈے'' ہونٹ کو کہا جاتا ہے یقیناً کسی پشتو دان نے اسے یہ نام دیا ہوگا اور اس کے ماں باپ نے بغیر مطلب جانے اسے تمغے کی طرح اس بے چاری پہ سجا دیا۔

''اور یہ ہیں مس لندن۔'' اس نے بارہ تیرہ برس کی دبلی پتلی سی شرمیلی بچی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور ایک مس پیرس بھی ہوتی ہیں وہ آج اتفاقاً غیر حاضر ہیں۔ یہ نام آنے والے غیر ملکی سیاحوں سے متاثر ہو کر رکھے گئے ہوں گے۔ بے تکلف ہونے میں تو یہ قوم کمال رکھتی ہے۔ بنا زبان

سمجھے جانے یہ ہر ملک سے آنے والے لوگوں سے گھل مل جاتے ہیں۔ انہیں اپنی تقریبات میں مدعو کرتے ہیں اور بدلے میں اور کچھ نہیں تو ان کے دیے نام تو مل ہی جاتے ہیں اور یہ...... یہ دیکھو۔''

اس نے موٹی موٹی غلافی آنکھوں، بھرے بھرے گالوں اور سونے کی سی رنگت والی ایک دو سالہ بچی کی انگلی تھام کے آگے کیا۔

''کیا اسے دیکھ کر قدرت کی فیاضی پہ ایمان لانے کو جی نہیں چاہتا؟ لیکن جانتے ہو اس کا نام کیا ہے؟ غریبی'' میں نے نظر بھر کے اس بچی کو دیکھا۔ کون سا رنگ تھا فطرت کا جو خدا نے اس کے چہرے پہ سجا نہیں دیا تھا۔ سبز آنکھیں، گلابی ڈورے، سرخ گال، مرمریں ہونٹ، بھورے بال، سنہری جلد اور نام غریبی میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کے بچی کے مٹی سے سنے ہاتھ میں تھمایا اور کہا۔

''اس کا نام ''انمول'' ہے۔ اس کی ماں سے کہہ دینا۔'' اور اُٹھ کے باہر نکل آیا۔ کنویں کے پاس ''کچے'' میں ایک اور سیاہ پوش لڑکی پتیل کی گھڑونچی کھنگال رہی تھی مجھے یونہی شبہ سا ہوا کہ یہ وہی صبح والی لڑکی ہے۔ ذرا قریب جا کے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اگرچہ صبح کے دھند لکے میں اس کے نقوش نہیں دیکھ پایا تھا لیکن مدھم سروں میں گنگناتی اس کی آواز میں فوراً پہچان گیا۔ میرا ارادہ احاطے سے گزر کر سامنے ایران چاچا کے پاس جا کے گپ شپ لگانے کا تھا کہ وہ واحد ملازم تھے جو پشتو بول سکتے تھے لیکن نجانے کیوں میرے قدم اس کے قریب آ کے رک گئے۔

''اور تمہارا نام کیا ہے؟'' اچانک میں نے اپنی آواز سنی۔ اس نے ذرا سا سر اونچا کر کے نظر مجھ پہ ڈالی۔ گھڑونچی سے پانی جھاڑا، گیلے ہاتھ اپنے گھیر دار کرتے سے پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مومنہ علی'' پُراعتماد لہجے میں جواب دیتی ہوئی وہ آگے کو قدم بڑھا گئی اور میں جو کسی عجیب وغریب نام کا منتظر تھا۔ مومنہ علی سن کے دنگ رہ گیا اور جہاں کا تہاں کھڑا اس نام پہ غور کرتا رہا۔

''کیا ہوا؟ کہاں گم ہو؟'' فیروز میرے نزدیک چلا آیا۔

''کچھ نہیں، یار مذاق سے قطع نظر یہ لوگ واقعی نام رکھنے کے سلسلے میں بہت لاپرواہ لگتے ہیں۔'' میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

''مومنہ علی۔''

مقدس کی نظریں پھر سے دو سطریں اوپر پھسل کر ''مومنہ علی'' پہ ٹھہر گئیں۔ اس نے زیر لب یہ نام دہرایا۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔''

فجر کی اذان کی آواز ماحول کے ہر احساس پہ حاوی ہو گئی۔

اسے شروع ہی سے صبح صادق کے ملگجے اجالے میں اذان سننا بے حد اچھا لگتا تھا۔ بابا جان کو بھی تو...... مومنہ علی فجر کی اذان کے سے...... اور اب مجھے بھی، اس وقت اس کی ذہنی رو بھٹک کر پھر وہیں چلی گئی تو سر جھٹک کے وضو کرنے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کر کے اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ آج سے پہلے اس نے خود کو کبھی اتنا تہی دست نہ محسوس کیا تھا یہاں تک کہ دعا مانگنے کے لیے اس کے کشکول میں الفاظ کے سکے بھی

نہ تھے۔ وہ کیا مانگتی۔

ماں باپ کی سلامتی اور ان کی لمبی عمر کی دعا۔

یا۔

پھر ان کی مغفرت کے لیے۔

''نہیں نہیں۔'' وہ لرز گئی۔ ''یا اللہ میں نہیں جانتی میرے ماں باپ کہاں ہیں اور کیوں ہیں، وہ کیا وجہ ہے۔ جس نے انہیں مجھ سے غافل ہو کر اپنی زندگی الگ الگ گزارنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ مجھے ان سے لاعلم رکھنے میں تیری کیا مصلحت ہو سکتی ہے لیکن یا مسبب الاسباب مجھے ایک بار صرف ایک بار ان سے ملوا دے۔ میں ایک بار...... زندگی میں صرف ایک بار ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتی ہوں، ایک بار ماں کی آغوش کی گرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں، ایک بار اپنے سر پہ باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔

میں جاننا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہو گی جوان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہو گی جو ماں کی پھیلی ہوئی بانہوں کی پناہ میں ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہو گا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ یا اللہ تو تو سب جانتا ہے...... کیا میرے ماتھے کے نصیب میں وہ بوسہ ہے؟ یا اللہ رحیم وکریم پروردگار بس ایک بوسہ ذرا سی گرمی تھوڑی سی چھاؤں میرے نصیب میں بھی۔''

رات بھر کی جاگی آنکھیں خدا کے حضور گریہ زاری کے بعد اتنی متورم ہو گئیں کہ اسے انہیں مزید چند سیکنڈ کھولے رکھنا بھی دشوار ہو گیا۔ دل میں برسوں سے دبی خواہشوں کو جب دعا کے ذریعے رستہ ملا تو روح تک شانت ہو گئی۔ اس نے مندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش نہ کی اور جائے نماز کا ایک کونا موڑ کے اس پہ بے سدھ ہو گئی۔

''ہیلو...... ہیلو کزن ویک اپ......''

شناور نجانے کب سے اسے آوازیں دے رہی تھی۔ اس نے پلکیں کھولنے کی کوشش کی۔ سوجی سوجی آنکھوں سے گھٹنوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھی شناور کو خود پہ تشویش سے جھکے پایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے نیم غنودگی کے عالم میں تکتی کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''اٹھیے محترمہ، گیارہ بج رہے ہیں...... بہت سو لیا۔ اس طرح راتیں جاگ جاگ کے اور دوپہر چڑھے تک سونے کی عادتیں پکی کر لیں تو بڑی پرابلم ہو جائے گی۔ واپس تو ہاسٹل میں جانا ہے ناں، اب چھٹیاں ہی کتنی باقی رہ گئی ہیں۔''

اس کے اتنا کہنے پہ مقدس کو یہ یاد آیا کہ وہ ہاسٹل کے کمرے میں نہیں بلکہ پشاور میں موجود ہے۔ اس نے بازوؤں پر رکھا سر اٹھا کے اٹھنے کی کوشش کی تو کراہ نکل گئی۔ کئی گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں سونے کی وجہ سے گردن اور شانے کے پٹھے کھنچ سے گئے تھے اور کلائیوں تک ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ نماز کی چادر اسی طرح سر کے گرد لپٹی تھی اور یہ کمبل...... یہ یقیناً شانو نے ہی اوڑھایا ہو گا۔ وہ مسکرائی۔

''سنو، کچھ خاص بات پتا چلی ڈائری سے۔'' اسے کھڑکی کے پاس روشن دھوپ میں قدرے ہشاش انداز میں کھڑا دیکھ کر شناور نے پوچھا۔

''ابھی تک تونہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی۔''میرا خیال ہے میں نے فضول اتنے گھنٹے برباد کیے۔ یہ تو ڈائری کم اور کوئی سفرنامہ زیادہ لگ رہا ہے۔''

''وہاں اور بھی تو ڈائریاں ہوں گی۔''

''ہاں لیکن مجھے یہ اس لیے متوجہ کر گئی کہ ایک تو یہ میری پیدائش سے ایک ڈیڑھ سال ہی پرانی ہے۔ یعنی تقریباً اس دور کی جب بابا جان نے میری مما سے شادی کی ہو گی یا کرنے والے ہوں گے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ان کے ہاتھ کی لکھی اب تک کی آخری ڈائری ہے اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اس میں لکھے حالات و واقعات ضرور ان حقائق سے پردہ اٹھا دیں گے جو اب تک میری نظر سے مخفی ہیں، یا رکھے گئے ہیں لیکن......''

اس نے ڈائری کے اوراق بے دلی سے پلٹے۔

''اس میں تو سوات، کالام اور نجانے کن کن وادیوں کے قصیدے لکھے ہوئے ہیں۔ کہساروں، آبشاروں، ندی نالوں کے تذکرے وغیرہ وغیرہ۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی جسے جھٹک کے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

''ویسے ایک بات ہے یار...... بابا جان میں ایک اچھا رائٹر بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو بات میں جاننا چاہتی تھی اس کا اس ساری تحریر سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود میں کس طرح گھنٹوں اس کے مطالعے میں مصروف رہی یہ میں بھی نہیں جانتی۔ انہیں تو مصور ہونے کے بجائے مصنف ہونا چاہیے تھا۔''

''تمہارے بابا جان آرٹسٹ ہیں اور آرٹ کے کسی بھی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے فنون لطیفہ سے نابلد نہیں رہ سکتا۔ میں نے ماموں کے پینٹ کیے ہوئے لینڈ اسکیپ بھی دیکھے ہیں اور وہ خوب صورت لمحات بھی جو انہوں نے کیمرے کی آنکھ سے قید کیے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں خوب صورتی اور وہ بھی فطری خوب صورتی بہت اٹریکٹ کرتی ہے۔ لازمی سی بات ہے کہ اس کا اظہار ان کی تحریر میں بھی ہوتا ہو گا۔ جس خوب صورتی کو وہ موقلم کے ذریعے نہ ابھار سکتے ہوں گے اسے قلم کے ذریعے خراج تحسین پیش کرتے ہوں گے لیکن تم یہ باتیں کیا جانو...... اک آرٹسٹ کی فیلنگز دوسرا آرٹسٹ ہی جان سکتا ہے۔'' اس نے شوخی دکھائی۔

''اچھا اب یہ فن اور فنکاری چھوڑو اور میرے لیے کچھ ناشتے کا بندوبست کرو۔ سخت بھوک لگی ہے۔''

''بہت اچھے...... مقدس خانم بہت اچھے...... مجھے کیا اپنی کنیز خاص سمجھ رکھا ہے۔ رات کو تمہاری دگرگوں حالت پہ رحم کرتے ہوئے کافی کا کپ کیا لا تھمایا اور صبح یہاں کارپٹ پہ سکڑے سمٹے دیکھ کر کمبل کیا اوڑھا دیا تم نے مجھے اپنی خادمہ ہی تصور کر لیا۔ چلو اٹھو خانم...... اور اپنی پیٹ پوجا کا انتظام خود کرو۔ مجھے آج یہ نوٹس مکمل کرنے ہیں۔'' وہ اسے جھاڑتی پھر سے فائل پھیلا کے بیٹھ گئی۔ اسے جب ہی مقدس کو تاؤ دلانا ہوتا وہ اسے ''خانم'' کہہ کے چھیڑتی لیکن آج چڑنے کے بجائے وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تو شنا اور نے مڑ کے اسے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ رات وہ جس حالت میں کمرے میں آئی تھی وہ حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ اس کے سنبھلنے میں اتنا کم وقت لگتا۔

''لیکن اگر وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے اتنی فریش نظر آ رہی ہے تو مجھے بھی اپنے تجسس کو فی الحال جھٹک دینا چاہیے۔ کیا پتا میرے

استفسار پہ وہ پھر سے بکھر جائے اور ویسے بھی جب تک وہ خود نہ بتانا چاہے گی میرے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کل باچا جان کے کمرے میں کیا ہوا۔'' اس نے رات سے وسوسوں، اندیشوں اور سوالوں سے گھرے دل کو اسے چھیڑنے سے باز رکھا۔

ناشتے کی ٹرے لے کے کچن سے نکلتے ہوئے اس کی نظر باچا خان کے کمرے کی طرف اٹھی اور اس کے قدم تھم گئے۔ ذہن پھر سے اس بند کمرے میں ہونے والی پرپیچ گفتگو کی طرف چلا گیا۔ اسی لیے وہ نیچے آنے سے کترا رہی تھی۔ وہ کم از کم آج کے دن پھر سے اپنے دل و دماغ کو اس پہیلی میں نہیں اُلجھانا چاہتی تھی۔ وہ دل و دماغ جو خدا کے حضور اپنا مقدمہ پیش کر کے سبک سے تھے۔ اس نے بدقت قدم اٹھائے اور سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

''آپ کچھ بھی کہیں بی بی جان، باچا جان، اچھا نہیں کر رہے۔ انہیں اور کچھ نہیں تو دراب کی کم از کم یہ بات تو مان لینا چاہیے کہ وہ زریاب کے آنے تک اپنا فیصلہ ملتوی کر دیں۔ اب تو وہ آنے ہی والے ہوں گے، نطاشہ کے بابا کا تو یہی کہنا ہے۔'' چچی جان کے کمرے سے آتی تائی جان کی دبنگ مگر جھنجلائی آواز نے اسے پھر سے رک جانے پر مجبور کیا۔

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو...... زریاب بچہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر لوٹے اور...... اور...... سب ٹھیک ہو جائے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو ہی جائے گا...... سب ٹھیک جائے گا۔'' بی بی جان کی متفکر آواز سنائی دی۔

''اللہ کرے......'' تائی جان نے تائید بھرا ہنکارا لیا پھر دبے لفظوں میں کہنے لگیں۔

''ویسے میں نے سنا ہے مردوں سے کہ زریاب کو یہاں آنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے، وہ سو سال بعد بھی آئے تو فیروز خان کے لوگ اسے زندہ تو چھوڑیں گے نہیں۔''

''اللہ نہ کرے...... خیر کی بات کرو گل بی بی...... خیر مانگو خدا سے۔'' بی بی جان نے دہل کے انہیں گھر کا اور وہ جو خود کو ان سب مذاکرات سے بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھنے پہ آمادہ کر رہی تھی۔ فیروز خان کے نام پہ سرتاپا ہل کے رہ گئی۔

فیرزہ خان...... فیروز خان وردگ...... یہ تو وہی بابا جان کے سوات والے دوست ہیں جن کا تذکرہ ڈائری میں ہے۔ اس نے تمام حواس مجتمع کر کے دروازے کے پیچھے سے آنے والی آوازوں کی طرف متوجہ کیے۔

''میں تو یونہی ایک بات......'' تائی جان منمنائیں۔

''پھر بھی گل بھابھی آپ کو سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔'' چچی جان کے لہجے میں خفگی تھی۔

بی بی جان کی دبی دبی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ یہاں بھی خطرہ ہی خطرہ ہے۔ یہ وردگ بھی ہماری طرح دشمن دار لوگ ہیں۔ نسلوں تک بدلے کا زہر ان کے ذہن سے نہیں اُترتا۔ اللہ میرے بچے کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا اب میں اس کے یہاں آنے کی دعا نہ کروں؟'' بی بی جان کا پگھلتا اور بھیگا لہجہ اس کے لیے نئی چیز تھا۔ وہ بھاری ہوتے وجود کو آگے گھسیٹ لے گئی۔

فیروز خان ورگ بابا جان کا عزیز تر دوست یا خون کا پیاسا دشمن۔اس سوال کے جواب کی طلب نے اسے ایک بار پھر وہی ڈائری کھولنے پہ مجبور کر دیا۔

☆☆☆

۷مئی ۱۹۸۰ء

مئی کا مہینہ یہاں کا سب سے خوش گوار مہینہ ہے اور اسی مہینے میں وہ جشن بہاراں منایا جاتا ہے جس کی اکثر جھلکیاں ٹی وی پروگرامز میں دکھائی جاتی ہیں۔آگ کا بڑا سا الاؤ جس کے گرد خوشی سے دمکتے چہروں کا سادہ مگر منظم رقص۔جب فیروز نے بتایا کہ ہم لوگ بھی کل رات ہونے والے اس جشن میں مدعو ہیں تو میں بے حد پر جوش ہو گیا۔آج صبح ہی فیروز مجھ سے اجازت لے کر ایک دن کے لیے آگے کسی قصبے میں اپنے والد کے کسی دوست کی عیادت کے لیے چلا گیا۔مجھے اور تو کیا اعتراض ہو سکتا تھا،لیکن میں نے اسے کل تک ہر حال میں واپس لوٹنے کی تاکید کی۔میں جشن میں اس کے بغیر شرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کے حوالے سے اس کے مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

آج کا سارا دن میں نے بمبوریت کے اونچے نیچے راستوں پہ بھٹکتے ہوئے گزارا،ایران چاچا میرے ہمراہ تھا۔میں نے وہاں کا روایتی قبرستان بھی دیکھا۔ایک کھلا سا میدان جس میں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں،شکستہ استخواں اور پرزہ پرزہ ہوئے تابوت ہیبت ناک ماحول پیدا کر رہے تھے۔ ایران چاچا بتانے لگا۔

''یوں تو ہمارے ہاں مردے کو تمام آخری رسومات ادا کرنے کے بعد چارپائی سمیت یہاں ڈال دیتے ہیں لیکن کچھ صاحب حیثیت لوگ اب تابوت بھی بنانے لگے ہیں،مردے کے ساتھ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خوراک بھی رکھی جاتی ہے۔فرشتے جب مردے کے پاس آتے ہیں تو وہ ان کی تواضع کے لیے یہ خوراک پیش کرتا ہے۔''

جنگلی جانوروں،چیلوں اور گدھوں کی نوچ کھسوٹ اور بربریت کی نشانیاں وہاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔میں نے جھرجھری لی اور آگے چل پڑا۔

عورتوں کے ٹولے کے ٹولے روٹیوں کی چنگیریں اٹھائے،سر پہ پھل کے ٹوکرے رکھے،جنگل کی طرف نکل رہے تھے۔

''چاچا تم تو کہہ رہے تھے جنگل کے اندر کا حصہ بہت خطرناک ہے،ہر طرح کا زہریلا سانپ اور خونخوار جانور اندر موجود ہے،پھر یہ عورتیں پکنک منانے وہاں کیوں جا رہی ہیں۔''میرے سوال پہ چاچا الجھا۔

''پن،کک؟ وہ کیا بلا ہے؟...... بچہ یہ تو ملوش دیوتا کی خدمت میں کھانا پیش کرنے جا رہی ہیں۔کل تہوار ہے ناں،ہر تہوار دیوتا کی دعوت کے لیے کھانا جنگل میں پھینک دیا جاتا ہے۔''

''بڑے پیٹو دیوتا ہیں تمہارے۔''میں بڑبڑایا۔

''وہ دیکھو،تمہارا قبر۔''

میں ایک شفاف جھیل کے کنارے اونچے سے پتھر پہ بیٹھا ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا جب چاچا کی پاٹ دار آواز پر چکنے پتھر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا، شاید اس کے دیوتا کی شان میں گستاخی کرنے کی پاداش میں میرا قتل کا منصوبہ تیار ہو گیا ہو لیکن اس کے تاثرات نارمل ہی تھے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میں نے ذرا سا اچک کے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر...... چناروں کے سائے میں ایک اکیلی قبر تھی۔ قبر کچی تھی مگر اس کے گرد پتھر لگا کے گویا حد بندی کر دی گئی تھی، اوپر چکنی مٹی کا لیپ بھی تھا۔

''اوہ'' اب میں سمجھا۔ کسی مسلمان کی قبر تھی جسے وہ میری قبر بنا رہا تھا۔

''تمہیں اللہ سمجھے چاچا'' میں نے خفگی سے اسے گھورا اور دوبارہ سے وضو کرنے لگا۔

اس حسین وادی کے سرسبز قطعے پہ پھولوں بھری سرزمین پہ سجدہ ادا کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لطف اور سکون محسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ فطرت آپ کو خدا سے اور قریب کر دیتی ہے۔ چہرے کو چھو کے گزرتی بدلیاں بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہیں۔ سلام پھیرتے ہوئے میری نظر پھر اس قبر پہ پڑی نجانے میرے دل میں کیا آیا کہ چند لمحوں بعد میں اس قبر کے سرہانے کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ بڑھ کے ایک بڑا سا گیندے کا پھول توڑا اور اس کی پتیاں قبر کے سرہانے پھیلا دیں۔ واپس پلٹتے ہوئے ایک سرشاری کی کیفیت مجھ پہ چھائی ہوئی تھی۔

۱۸ مئی ۱۹۸۰ء

مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود فیروز آج نہیں لوٹا۔ میں سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔ صبح سے اس جشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کیمرے میں قید کرنے کے لیے بے چین تھا اور اب فیروز غائب تھا۔ موسم کی خرابی مجھے اس کی بے بسی کا یقین دلا رہی تھی کہ یقیناً سارا دن چلتی تیز آندھیاں اسے سفر کرنے سے روکتی ہوں گی اور شام کے بعد تو ان علاقوں میں سفر کرنا یوں بھی ناممکن ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے رہ رہ کے اس پہ غصہ آ رہا تھا۔

میں اکتایا ہوا سا چارپائی پہ سیدھا لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنی حس سماعت اور حس شامہ سے کام لیتے ہوئے کڑھ کڑھ کر وادی میں ہونے والے جشن کی گہما گہمی محسوس کر رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اونچے اونچے سروں میں اجنبی زبان والے گیتوں کی مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ الاؤ کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ جلتی لکڑیوں کی کڑوی خوشبو، چاول دم لگنے کی اشتہا انگیز مہک کے ساتھ ساتھ چربی پگھلنے کی ناگوار سی بدبو بھی آ رہی تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی یہ اچانک اور زوردار دستک ایران چاچا کی مخصوص تھی۔ میں نے بے دلی سے اسے اندر آنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ چند اور مقامی لوگ بھی زور زور سے بولتے چلے آئے۔

میں پھرتی سے اٹھ بیٹھا۔ ان کے انداز سے خفگی اور اپنائیت بیک وقت عیاں تھی۔ ایران چاچا نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''صیب، یہ لوگ بہت سخت خفا ہیں۔ تم نے ان کی دعوت کو قابل توجہ نہیں سمجھا، اس لیے تم صرف فیروز خان صیب کے مہمان نہیں پوری وادی کے مہمان ہو اور وادی کا کوئی مہمان یوں اکیلا پڑا ہو تو کیا خاک تہوار ہوگا۔ بھلا کیا جشن منائیں گے ہم لوگ۔ خان صیب نہیں تو کیا ہوا تم ہم لوگ کے ساتھ چلو۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تمہاری خاطر میں تو فیروز خان صیب سے کہہ کر سو جوتیاں لگوا لینا۔''

اس کے استحقاق پہ میں مسکرا دیا اور مزید نخرے نہ کرتے ہوئے ان کے ہمراہ چل پڑا۔

پوری کیلاش عوام اس وقت ایک کھلے سے میدان میں جمع تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سب اپنے اپنے ٹولے بنائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف چند بزرگ خواتین برتن نما ساز بجا بجا کے کانپتی آوازوں میں گیت گا رہی تھیں اور الاؤ کے گرد بیس مرد و زن کی ٹولی دائرہ بنا کے رقص کر رہی تھی۔ کچھ کچھ دیر بعد ٹولی کے ارکان بدل جاتے تھے۔

میں دلچسپی سے ان سادہ چہروں پہ پھیلے مسرت کے عکس دیکھ بھی رہا تھا اور اپنے کیمرے میں ان کے مختلف زاویے قید بھی کر چکا تھا۔ میری توجہ رقص سے زیادہ ان کے چہروں پہ تھی۔ اتنے آئینہ چہرے میں نے کہیں اور نہیں دیکھے تھے۔ جو دل میں وہی چہرے کے خدوخال سے ظاہر ہوتا تھا اور اس وقت ہر چہرے پہ صرف ایک ہی چہرہ جھلملا رہا تھا اور وہ تھا خوشی کا...... محبت کا...... میری محویت کو ایک مترنم آواز نے توڑا۔

''صہیب...... میں۔'' میں نے مڑ کر دائیں جانب دیکھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ژان خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کے کیلاش دوست رقص کے لیے لے جا چکے تھے اور اس وقت میرے دائیں طرف وہی عجیب سے نام والی لڑکی بیٹھی تھی جو میری مادری زبان بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔

''تم...... وہی ہو ناں...... مریم علی۔'' میں نے ذہن پہ زور ڈالا۔

''نہیں، مومنہ علی...... مومنہ علی ہے میرا نام۔'' وہ ذرا سا مسکرائی تو قندھاری انار کے رنگ والے اس کے گداز لبوں سے موتی جیسے چمکیلے خوب صورت دانتوں نے لشکارا مار کے جیسے روشنی سی میرے اطراف بھر دی۔ الاؤ کی کئی فٹ اونچی ہوتی آگ کی روشنی بھی مدھم سی پڑ گئی۔ میں مسحور ہو گیا، تب میں نے پہلی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کی ہلکی بھوری زلفیں وہاں کی روایتی عورتوں کی طرح مینڈھیوں کی صورت نفاست اور صفائی سے گندھی تھیں، ماتھے اور رخسار پہ بھرے گل گودے تھے۔ اس کی آنکھیں یہاں کے لوگوں جیسی سبز یا نیلی نہیں تھیں، بلکہ بھوری...... نہیں...... قرمزی یا شاید شہد...... ہاں شہد جیسا ہی رنگ تھا اور ان شہد کے قطروں کے گرد پھیلی وہ لالی جیسے شفق...... پتا نہیں کب تک میں خود کو بھلائے ان آنکھوں کا رنگ دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہتا کہ وہ پھر سے گویا ہوئی۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی صہیب وہ تم ہی تھے جس نے کل میرے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ کے بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ میرے دوڑ کے آنے کے باوجود تم وہاں سے جا چکے تھے برسوں سے سوائے میرے اس قبر پہ کسی اور نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اللہ تمہیں بڑا اجر دے گا تم نے ایک اجنبی شخص کے لیے دعا کی۔'' وہ آبدیدہ ہو گئی تو میں بے چین ہوا تھا۔ نمکین پانی کی یہ بوندیں کہیں شہد میں نہ مل جائیں۔

''وہ تمہارے والد تھے، میرا مطلب ہے تم تو......''

میں نے اس کے سیاہ لباس، سر پہ روایتی ٹوپی، اس پہ ٹنگی سیپیاں اور موتیوں کو بغور دیکھا۔ وہ فوراً بولی۔

''الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہوں۔ میرے ابا کا نام محمد علی تھا اور انہوں نے ہی مجھے مومنہ کا نام دیا، تا کہ میرے نام سے یہ ظاہر ہو جائے کہ میں کون ہوں۔''

''اوہ......!'' میں نے سر ہلایا اب اسے کیا بتاتا کہ اس کا نام جاننے کے بعد بھی میں یہی سمجھتا رہا کہ کسی کم فہم نے بغیر مطلب جانے یونہی

ایک خالص مسلم نام ایک کافرلڑکی کو دے رکھا ہے بلکہ اس وقت تو مجھے اس انجانے شخص پہ غصہ بھی آیا تھا جس نے میری دانست میں یہ نامعقول حرکت کی ہوگی لیکن اب یہ جان کر کہ وہ ایک مسلمان شخص کی مسلمان بیٹی ہے۔ مجھے طمانیت سی محسوس ہوئی اور وہ گھبراہٹ جو اسے اپنے قریب پا کے مجھ پہ طاری ہوگئی تھی پل میں زائل ہوگئی۔

میں پھر سے جشن کی طرف متوجہ ہوگیا، اسے شاید کچھ اور بھی کہنا تھا، جب ہی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ بار بار مجھے دیکھتی لیکن میرے اس کی طرف دوبارہ پلٹ کے نہ دیکھنے پہ چپ رہ جاتی۔ آخر میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

''تو تم رقص میں بھی اس لیے شریک نہیں ہو رہیں۔ لیکن یہاں ژان خان، اس کے علاقے کے دوسرے، بہت سے لوگ تو یہ جشن پورے جوش وخروش سے منا رہے ہیں اور تم تو پھر بھی یہاں کی رہنے والی ہو، انہی لوگوں میں سے ایک ہو، وہی لباس پہنتی ہو، وہی زبان بولتی ہو، پھر اس موقع پہ سب سے الگ تھلک کیوں ہو؟''

''نہیں سوائے مذاہب کے میں نے کبھی خود کو ان لوگوں سے الگ محسوس نہیں کیا، نہ میں نے، نہ میرے ابا نے، اصل میں میری ماں کیلاش تھی۔ اس لحاظ سے یہاں موجود بہت سے لوگوں سے میرا خونی رشتہ بھی ہے۔ ایک غیر قوم، غیر مذہب کے شخص کی اولاد ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی مجھ سے غیریت نہیں برتی بلکہ پندرہ سال پہلے مرنے والی میری ماں کے حوالے سے آج بھی مجھے اپنا عزیز جانتے ہیں تو میں اپنی ماں کے حوالے سے انہیں اپنا کیوں نہ سمجھوں۔ ابا نے بھی تو یہی کہا تھا۔ میری ماں کے عشق نے انہیں ہر اس چیز سے عشق کرنے پر مجبور کر دیا جو میری ماں سے متعلق تھی۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زبان، یہاں کے گیت، یہاں کے پہاڑ، ندی، نالے، یہاں کا چپہ چپہ انہیں عزیز تھا جہاں جہاں میری ماں نے قدم رکھا ہوگا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''وہ بڑے اہتمام سے اس رقص میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے اپنے ابا کا ماں کے ساتھ اس جشن میں آخری رقص آج تک یاد ہے۔ تب میں پانچ چھ برس کی تھی۔ یہی مقام تھا، یہی گیت فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ اتنی ہی روشن آگ تھی ایسا ہی ستاروں بھرا آسمان تھا۔''

وہ کسی طلسم کے سے عالم میں الاؤ پہ نگاہیں جمائے ساکت بیٹھی تھی، صرف اس کے لب نامحسوس سی حرکت کر رہے تھے نہایت مدھم آواز میں کہے گئے اس کے الفاظ مجھے جکڑ رہے تھے۔

''میری ماں کا پورا وجود دمک رہا تھا، ابا کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ نہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ دائرے میں رقص کر رہے تھے۔ میں یہاں اپنی نانی کی گود میں بیٹھی انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اچانک ابا کا ایک قدم ذرا آگے پڑ گیا۔ سنبھلتے بھی اسکا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور...... اور ماں...... وہ بت بنی کھڑی رہ گئی۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں اسے دیکھنے لگے۔ کچھ شاید بات سمجھ گئے تھے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک میری ماں نے......''

اس کے چہرے پہ آتے زلزلے کے آثار مجھے مکمل طور پر اردگرد کے ماحول سے بے خبر کر کے اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ بہنے پہ مجبور کر گئے۔ وہ مجھ سے تو کیا خود سے بھی بے خبر تھی۔

''وہ چیخی...... چیختی چلی گئی۔ میری نانی مجھے گود سے اُتار کے روتی پیٹتی اس کی طرف لپکی، میرا ابا ہکا بکا اس کی حالت دیکھتا رہا۔ پھر سب لوگوں کے ساتھ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ چیختی رہی، اپنے بال نوچتی، اپنا سینہ پیٹتی رہی پھر اس نے اپنا آپ سب سے چھڑایا اور بھاگ گئی۔ ابا پیچھے پیچھے بھاگا...... بھاگتا گیا۔ لیکن سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نیچے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پھر...... پھر سب نے بہت ڈھونڈا...... مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا اس کے لباس کی ایک دھجی تک کسی کے ہاتھ نہ لگی۔ اس رات دریا کو بھی جلال آیا ہوا تھا۔ اتنی تیز لہریں...... اتنی خوفناک موجیں...... نجانے کہاں بہا لے گئیں اسے......'' آنسو اس کے گالوں پہ پھیلے تو وہ ہوش میں آ گئی۔ دونوں ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر وہ سر جھکائے اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی دل پہ ایک انجان عورت کی اچانک اور عجیب سی موت کا دکھ لیے خاموش بیٹھا رہ گیا۔

''لیکن اسے ہوا کیا تھا؟ کیا پہلے بھی کبھی اسے یہ پاگل پن کے دورے پڑتے تھے؟'' میرے سوال پہ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

''پاگل پن...... ہاں وہ پاگل ہی تو تھی۔ کسی بہت اپنے کے اچانک بچھڑ جانے کا خوف شاید یونہی پاگل کر دیتا ہے۔ دراصل میری ماں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ ایک اچھی مسلمان عورت بننے کی پوری دیانتداری سے کوشش کرتی رہی لیکن اس کے خون کی تاثیر، مٹی کی محبت اسے اس سرزمین سے دور نہ جانے پہ مجبور کرتی رہی، اس نے شادی سے پہلے یہی شرط رکھی تھی ابا کے سامنے کہ وہ کبھی یہ وادی اور اپنے لوگ نہیں چھوڑے گی۔ اپنا پیدائشی مذہب چھوڑ دینے کے باوجود وہ اتنی جلدی یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں کو فراموش نہیں کر سکی جو اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اپنی ماں اور نانی کی طرح وہ بھی اپنا اور ابا کا کھانے کا پیالہ الگ رکھتی تھی کہ مرد کا پیالہ جھوٹا کرنے والی عوت جلد بیوہ ہو جاتی ہے، یہ اس نے سن رکھا تھا اور یہ بھی کہ تہوار کے رقص پہ ہاتھ چھوٹ جانا بہت بڑی بدشگونی ہوتی ہے اور جس کا ہاتھ اپنے ساتھی سے چھوٹ جائے وہ اسی ماہ مر جاتا ہے۔ یہ خوف میری ماں کو لے ڈوبا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ابا کو...... شاید اسی لیے اس نے خود کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ تب سے میرے ابا نے رقص کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اس جشن میں شریک ضرور ہوتا رہا۔

جن لوگوں نے کڑے وقت میں ان کا دکھ بانٹا، ان کی خوشیوں میں شریک نہ ہونا تو کم ظرفی ہوتی ہے اس لیے ابا کے بعد میں بھی اس جشن میں باقاعدگی سے شامل ہوتی ہوں لیکن اس دائرے میں شامل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ٹھوڑی گود میں ٹکائے بولتی رہی۔

لگ ہی نہ رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل اجنبی تھے، یکسر ناواقف......

''سنو، تم کیا ہر اجنبی سے یونہی گھل مل جاتی ہو۔''

بات تو نکل ہی چکی تھی منہ سے اب پچھتانے کے سوا کیا ہو سکتا تھا لہٰذا میں بھی اس وقت اس کا خجالت سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کر خود کو اس قدر نامعقول سوال پہ کوس رہا تھا۔ وہ لب کچلتی کھڑی ہو گئی میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی ایک قدم آگے بڑھا کے پلٹ آئی۔

''صیب، تم اجنبی تھے لیکن میرے باپ کی قبر پر دو پھول چڑھا کے اور دعا پڑھ کے تم مجھے اپنے اپنے سے لگے تھے میں تو صرف یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ مجھے تو خود پتا نہیں کب اور کیسے میں اتنی دیر باتیں کرتی رہی۔ مجھے معاف کرنا صیب اگر میری کوئی بات بری لگی ہو اور ہاں

میں ہر اجنبی سے تو کیا، کسی بھی اجنبی سے باتیں نہیں کرتی، اگر وہ اجنبی ہو تو......''

وہ چلی گئی اور میں اس کے آخری الفاظ پر غور کرتا رہ گیا ماحول کی ساری رنگینی، رقص و سرور کی گہما گہمی اب افسردگی کی کہر میں لپٹ چکی تھی۔ اس کا بھیگا لہجہ میرے اعصاب بھگو رہا تھا۔ اس کی کپکپاتی آواز میرا دل لرزا رہی تھی اور اس کی درد میں ڈوبی آنکھیں میری روح کے اندر تک شگاف ڈال کے مجھے یہ باور کرا رہی تھیں کہ کسی اجنبی کا دکھ اپنا دکھ نہیں بن جاتا...... اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو......

۱۹ مئی ۱۹۸۰ء

آج صبح ہی فیروز کی واپسی ہوئی۔ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ معذرتیں پیش کرنے لگا۔ وجہ وہی تھی یعنی موسم کی خرابی۔

''تم نے جشن تو انجوائے کیا ہوگا؟'' اس کے سوال پہ میں چپ کر گیا۔ کیا کہتا، میں اپنی فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر کرنے میں بڑا کنجوس واقع ہوا ہوں یا یوں کہنا چاہیے قطعی نابلد ہوں اس معاملے میں۔ سوائے تمہارے اے میری ڈائری، کوئی نہیں جس سے میں اپنے احساسات و جذبات بیان کر سکوں، لیکن کل رات کے بعد سے جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ ابھی میرے قلم کی گرفت میں کیا آئے گا، اس جذبے کو ابھی تک میرا دل بھی صحیح طریقے سے پرکھ نہیں سکا۔ کبھی میں خود کو بے حد افسردہ محسوس کرتا ہوں، اداس، قنوطی، کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے خزانوں کے منہ کھل گئے ہوں، میرے لیے اور میں جھولی میں خوشیاں بھر بھر کے تھک رہا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ یکدم تنہا تنہا سا لگنے لگتا ہے۔ ہر چہرہ ناآشنا محسوس ہوتا ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اجنبی دیس میں کسی بہت اپنے نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا ہے۔

میں آج سارا دن کمرے سے نہیں نکلا۔ میرے میزبان اسے رت جگے کی تھکن سمجھتے رہے، حالانکہ وہ کیا جانیں تھکن سے تو مجھ جیسے آوارہ گرد کا کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ فیروز سمجھ رہا ہے میں اس کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہا اور ایک بات کہہ کر تو اس نے مجھے چونکا ہی دیا۔

''یار ازریاب جاؤ لالہ کہیں گھوم پھر آؤ، پھر نہ کہنا فیروز نے اپنے گھٹنے سے لگا کے بٹھا دیا تھا۔ کون جانے دوبارہ تم یہاں کبھی آ پاؤ یا نہیں۔''

''دوبارہ...... ہاں مجھے واپس بھی تو جانا ہے......'' میں بری طرح چونک گیا تھا۔ اپنے ہی الفاظ پہ...... آ کے واپس جانا تو ایک حقیقت ہے اس حقیقت کو کیسے فراموش کر بیٹھا اور کس کے لیے...... میری خاموشی محسوس کر کے وہ بولا۔

''یار تم تو بنجارے چھڑے ہو، میں ٹھہرا زمیندار قسم کا بندہ اور وہ بھی ایک عدد پٹھانی کا شوہر...... اگر تم دو دن اور ٹھہرنا چاہتے ہو تو میں اپنا پروگرام آگے کر لیتا ہوں اور اگر زیادہ دن رکنے کا ارادہ ہے تو یار پھر مجھے فی الحال اجازت دو، چند انتہائی ضروری نوعیت کے کام وہاں رکے پڑے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد پھر آ جاؤں گا۔ میرے لیے پہاڑوں کا یہ سفر کوئی نئی بات نہیں۔ تم کہاں آئے دن یہ تکلیفیں اٹھاتے پھرو گے۔ اچھی بات ہے کچھ دن اور رہ لو، اگر دل لگ گیا ہے تو......''

وہ تو سو گیا، لیکن میرے لیے پھر سے کئی سوال چھوڑ گیا۔ میں الجھنے لگا کہ واپس جانے کی بات سن کر میرا دل رکا تو کیوں رکا؟

ٹھہرنے کا سن کر میرے اندر اطمینان نے ڈیرے ڈالے تو کیوں؟

وہ کیا ہے جو ان وادیوں میں میں تلاشنا چاہتا ہوں؟ وہ کون ہے جس کی کشش مجھے اس زمین سے قدم آگے نہیں بڑھانے دیتی؟

میں نے آنکھیں موندیں تو شہد کے دو چشمے جھر جھر کرتے ہوئے بہنے لگے۔ میں نے آنکھیں کھول لیں۔

جواب مل چکا تھا۔

ایسا جواب جو اپنے جلو میں بہت سے سوال لیے ہوئے تھا۔

۲۰ مئی ۱۹۸۰ء

دو باش تک میں اور ژان فیروز کے ساتھ گئے۔ اس نے میرے بارے میں اسے اتنی تاکیدیں کیں کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اسے وین میں سوار کرا کے میں نے ژان خان کو بصد اصرار اس کے کام پہ بھیجا ورنہ تو وہ فیروز کی تازہ ترین ہدایات کے زیر اثر مجھے ایک پل کو جدا کرنے پہ تیار نہ تھا۔ وہاں سے میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے خود کو محمد علی نامی شخص کی قبر پہ موجود پایا نجانے کون شخص تھا یہ...... اور کتنا پرزور عشق تھا اس کا جس کے کھونے کے ڈر نے ایک عورت کے حواس پل بھر میں ضائع کر دیے، اسے ایک ساعت میں دیوانگی کی سرحد پہ لا کھڑا کیا اور وہ عورت...... کتنی کشش ہو گی اس کی محبت میں، جس نے ایک شخص کو اپنا خاندان، رشتے ناطے، ذات پات، وطن، کاروبار، سب بھلا کے اس حسین مگر پسماندہ سی وادی میں کافر قوم کے ساتھ غربت میں زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیا۔ میری محویت ٹوٹی جب میرے عقب سے دو ہاتھ طلوع ہوئے اور قبر پہ گلاب کے پھولوں کی بارش برسا گئے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حد درجہ سنجیدگی لیے وہ مومنہ تھی۔ میں ذرا سا مسکرایا لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے قریب بیٹھ گئی اور زیر لب آیات کا ورد کرنے لگی۔ یقیناً اس کے گریز کا سبب میرا وہ دل آزار جملہ تھا۔ مجھے نئے سرے سے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں کاٹن کی آرام دہ ٹراؤزر ذرا سا اوپر کھینچ کے اس کے نزدیک دوزانو بیٹھ گیا۔

اس نے پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور بلند لرزیدہ دراز پلکوں کے ساتھ وہ مجھے اتنی مقدس، اتنی نورانی لگی کہ مجھے اپنا اس کے اس قدر نزدیک بیٹھنا گستاخی محسوس ہوا۔ میں ذرا سا کھسکا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے اس نے ایک نظر میرے پیچھے ہونے پر ڈالی اور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”اچھا ہوا صیب تم خود ہی پرے ہو گئے ورنہ پھر کہتے پھرتے، کیا میں ہر اجنبی کو اتنا ہی قریب بیٹھنے دیتی ہوں۔“

”لاحول ولا قوۃ“ اس کی جلی کٹی بات پہ مجھے تاؤ آ گیا۔

”مومنہ مجھے گھما پھرا کے بات کرنا نہیں آتی، بلکہ یوں کہو آتی ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت میری بات کا یہ مطلب نہیں تھا دراصل تم اتنی اداس تھیں اور رو رہی تھیں مجھے کسی لڑکی کو چپ کرانا نہیں آتا اور نہ ہی تسلی دینا۔ میں نے اس وقت صرف یہ سوچا تھا کہ کوئی ایسی بات کروں جس کا تعلق اس بیتے واقعے سے نہ ہو تا کہ تمہیں اداسی کی اس کیفیت سے نکال سکوں۔ ہاں میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ جلدی میں انتہائی فضول بات منہ سے نکل گئی۔ تمہیں برا لگنا ہی چاہئے تھا لیکن اگر میں معافی مانگوں تو کیا تم اپنا دل میری طرف سے صاف کر لو گی؟“

وہ کوئی جواب دیئے بغیر قبر کی گرد سے سوکھے پتے اور ٹہنیاں اٹھانے لگی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی جواب دیے بغیر لوٹ جائے گی لیکن جاتے جاتے وہ پھر سے ایک عجیب سی بات کہہ گئی۔

''مجھے صرف یہ برا لگا صیب کہ تم نے خود کو اجنبی کہا'' اس کا یہ سادہ سا جملہ مجھے سن کر گیا اور پھر سے سوالوں کے جنگل میں بھٹکنے کو چھوڑ گیا۔

آج پھر طویل تاریک رات ہوگی، چیختے چنگھاڑتے سوال ہوں گے اور جواب میں میرے دل کا خوف ناک سناٹا۔

اُف...... میں کیوں رکا...... کیوں نہ آج ہی لوٹ گیا، فیروز کے ساتھ مجھے بیڑیاں پسند نہیں۔ الجھاتے سوالوں سے نفرت ہے مجھے...... ایک جگہ ٹھہرنے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے پھر میں کیوں رکا...... کیوں...... آج رات مجھے اس کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ ورنہ واپس لوٹ جانا ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۸۰ء

اور میں واپس نہیں لوٹا۔

مجھے لوٹنا بھی نہیں تھا، کم از کم اکیلے تو نہیں۔ اس طرح خالی ہاتھ تو نہیں، کبھی کبھی خود سے ہار مان لینا بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ رات بھی یہی ہوا تھا۔ اپنے ذہن و شعور کے تمام دلائل، جواز اور حیلے بہانوں کے پرخچے اڑتے دیکھے تھے میں نے، صرف دل کی ایک ذرا سی ضد پہ...... جو ہمک ہمک کے بس یہی کہتا جا رہا ہے۔ صرف وہ...... بس وہ...... اور کوئی نہیں...... اور کچھ نہیں...... صرف...... وہ......

۲۲ مئی ۱۹۸۰ء

کل کا سارا دن میں اُسے وادی کے مختلف حصوں میں تلاشتا رہا، لیکن وہ مجھے نہ ملی اور آج میں نے اسے جھیل سہوگ کے پاس پایا۔ وہ خوبانیاں ٹھنڈے پانی سے دھو دھو کے ٹوکری میں رکھتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کا ذرا سا مسکرانا مجھے حوصلہ دلا گیا کہ اس دن ہونے والی تلخی کا اثر اس کے دل سے زائل ہو چکا تھا۔

''کہاں تھیں تم، مومنہ میں کل سارا دن تمہیں ڈھونڈتا ہی رہا۔''

میں لہجے کی بے چینی چھپانے میں قطعی ناکام رہا تھا اور یوں بھی میں اب اس سے کچھ چھپانا ہی کب چاہتا تھا۔

''کوئی کام تھا صیب؟'' وہ بدستور اپنے کام میں مشغول تھی۔

''مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے، تم سے اور یہ تم مجھے صاحب صاحب کیوں پکارتی ہو، خان زریاب خٹک ہے میرا نام۔''

''اچھا نام ہے۔'' وہ منہ پہ زور زور سے چھپاکے مارنے کے بعد اس بڑے سے پتھر کے ایک سرے پہ ٹک گئی۔ جس پہ میں ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر بھر کے اس کے شفاف چہرے پر دمکتے ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھا۔

''تم نے بتایا نہیں کل سارا دن کہاں غائب رہیں تم۔ پوری بستی میں ہر جگہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔'' اس نے میری بے تابی اور لہجے کی تڑپ کو حیرت سے محسوس کیا۔

''میں...... میں...... بشالینی'' گئی تھی۔ میرے ماموں کی بیٹی ہے وہاں، اس کی خیر خبر کے لیے کل میں سارا دن وہاں رکی تھی۔ آج میری خالہ وہاں گئی ہے اور میں ان دونوں کے لیے یہ پھل، انڈے اور یخنی لے کے جا رہی ہوں۔'' اس نے ٹوکری کی طرف اشارہ کیا، جس میں اس کا ایک سیاہ جوڑا بھی رکھا تھا۔

''کیا تم اور کچھ دن وہاں رکو گی۔'' میرا دل تنگ پڑنے لگا۔

''نہیں تو...... بس یہ دے کے آجاؤں گی۔''

''تو یہ کپڑے، میں سمجھا وہاں رہنے جا رہی ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ ٹوکرا کمر پہ ٹکائے کھڑی ہو گئی۔

''میں بھی چلوں تمہارے ساتھ، یہ سامان اٹھا لیتا ہوں۔'' میرے ہاتھ آگے بڑھانے پہ وہ گھبرائی۔

''نہیں نہیں...... تم کیسے جاؤ گے تم نہیں جا سکتے، وہاں پہ کوئی......''

''بہت دور ہے کیا، یہ بشالینی گاؤں'' اس نے بے ساختہ مسکراہٹ روکی۔

''بشالینی۔'' گاؤں نہیں ہے وہ سامنے جو جھیل کے اس طرف گارے کا بڑا سا مکان نظر آ رہا ہے ناں اسے بشالینی کہتے ہیں اور اب خدا کے لیے مجھے جانے دو۔''

وہ زچ سی ہو گئی، اس کے چہرے پہ پھیلی سرخی مجھے لطف دے رہی تھی، پھر بھی میں نے اس کی حالت پہ مزید ستم نہ ڈھاتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

''اچھا جاؤ، لیکن میں کل اسی وقت اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔ ضرور آنا اور مجھے بتانا کہ تمہارے ماموں کی بیٹی کو لڑکا ہوا یا لڑکی۔''

وہ جاتے جاتے چونک کے پلٹی اور میرے شرارت بھرے چہرے پہ ایک خفگی بھری نظر ڈال کے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ اس کی حیا اور جھجک نے میرا دل موہ لیا۔ باپ کے مسلمان خون کی تاثیر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ جس نے اسے یہاں کی دیگر دوشیزاؤں کی طرح بے باک نہیں ہونے دیا اور ایک عام سی بات کہنے میں اس کا یہ تذبذب مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں بشالینی کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس کے سامنے انجان بنا رہا۔

فیروز کے ساتھ پہلے دن کی سیاحت کے دوران میں اس جھیل پہ بھی آیا تھا اور اس کے کنارے کے بالکل سامنے موجود بغیر کسی کھڑکی اور روشن دان کے نیچی چھت والے اس کچے مکان کو دیکھ کر میں نے ایران چاچا سے استفسار کیا تھا کہ یہ مکان آبادی سے اتنا الگ تھلگ کیوں ہے۔

یہ ''بشالینی'' ہے۔ ہمارے ہاں جب کسی عورت کو بچہ ہونے والا ہو تو وہ یہاں قیام کرتی ہے۔ اپنے مرد اور اہل خانہ سے کٹ کر، ناپاکی والی عورت کو آبادی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہاں صرف اس کی دائی رہ سکتی ہے اس کے ساتھ، یا پھر گھر کی عورت ملنے آ سکتی ہے۔ لیکن اسے بھی رات رکنے کی اجازت نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک صاف لباس لاتی ہے جو بشالینی کی حدود سے باہر رکھا جاتا ہے۔ زچہ سے ملنے کے بعد وہ جھیل کے پانی سے غسل کر کے اپنا پہنا ہوا لباس دھوتی ہے اور صاف لباس پہننے کے بعد بستی میں قدم رکھتی ہے۔ مردوں کا اس عورت کے قریب جانا منع ہے۔''

ایران چاچا کے تفصیل سے بیان کرنے پر فیروز نے ریمارکس دیا تھا۔

''تو عورتوں کا کمیونٹی سینٹر ہے یہاں۔''

۲۳ مئی ۱۹۸۰ء

مجھے اسے تقریباً دس بجے ملنا تھا، لیکن فجر کی اذان سے بھی کچھ پہلے مجھ پہ بے چینی چھا گئی اور ناشتے کے بعد تو مجھ سے ایک پل بھی نہ رکا گیا اور میں جھیل سہوک کی طرف نکل پڑا۔ وہاں پہنچ کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس سرمئی چکنے پتھر پہ مومنہ کو بیٹھے دیکھا۔

''تم کب آئیں؟''

''بس ابھی......'' وہ بھی شاید اپنی جلد بازی پہ خجل سی تھی۔

''پھر...... کیا خبر ہے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''بیٹا ہوا ہے۔'' اس نے خوشی سے چور لہجے میں بتایا۔

''چھ بیٹیوں کے بعد۔''

''مبارک ہو۔'' میں اس کی پرخلوص اور بے پایاں محبت سے متاثر سا ہو گیا جو اس کے دل میں خود سے وابستہ ہر شخص کے لیے تھی۔

''اور پتا ہے میں نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہے۔ زریاب خان۔'' اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ اس کی زبان سے پہلی بار اپنا نام سن کر میں سحر زدہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میرا نام نہیں بلکہ میرے نام پہ پھول ہی پھول چن دیے ہوں۔ میری خاموشی محسوس کر کے وہ اٹک اٹک کے بولی۔

''کیا ہوا صیب...... برا لگا تمہیں...... تمہارا نام میں نے ایک...... میرا مطلب ہے کہاں تم کہاں وہ...... شاید میں نے غلط کیا ناں۔''

''بالکل غلط کیا...... مجھے دوبارہ صاحب پکار کے تم نے بالکل غلط کیا۔ میں نے کل ہی تمہیں منع کیا تھا کہ اب مجھے صاحب مت پکارنا، سخت برا لگتا ہے مجھے۔''

''اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی خراب لفظ ہے کیا...... میں تو تمہیں عزت دینے کے لیے صیب کہتی ہوں۔''

''مجھے تم سے احترام نہیں...... محبت چاہیے۔'' میری اس بات پہ اس کا ردعمل وہی تھا جو ہونا چاہئے تھا۔ وہ حسین تھی...... یہ تو میں جانتا تھا مگر اس موقع پر چہرے پہ سجانے کے لیے اتنے رنگ اس نے کہاں چھپا رکھے تھے اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی مگر اس کے نیم وا کپکپاتے لبوں سے سانسوں کی مدھم آوازیں انوکھے اقرار کر رہی تھیں۔ شہد لٹاتی جھکی آنکھیں ایک ہی بار حیرانی سے مجھ پہ اٹھی تھیں پر جھکنے سے پہلے خاموشی سے ایک عہد کر گئی تھیں۔

۲۴ مئی ۱۹۸۰ء

آج مومنہ کا ایک اور وصف کھلا مجھ پہ۔ وہ اچھا گنگنا لیتی ہے یہ تو میں پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔ آج میرے بار بار اکسانے پر بھی گنگنانے پہ تیار نہ ہوئی۔

''میں نے سنا ہے یہاں کے لوگ خاصے شاعرانہ اور عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں۔ دوشیزائیں اپنے محبوب کے لیے گیت لکھتی ہیں اور گاتی ہیں۔ تم پر تو ذرا اثر نہیں دکھتا ہے ان فضاؤں کی رنگینی کا۔'' میں نے جھوٹ موٹ منہ پھلایا۔

''اچھا میں تمہیں ''برہ'' سناتی ہوں مگر تم میری طرف دیکھنا مت بالکل بھی نہیں ورنہ میں گا نہیں پاؤں گی۔'' وہ ہار مان کے بولی۔

''کیوں...... یہ کیسی پابندی ہے، میں کیوں نہ تمہیں دیکھوں...... ایسا ہی مشکل لگتا ہے تمہیں میرے سامنے گیت گانا تو تم اپنی آنکھیں بند کرلو۔'' میں ایک پل کے لیے بھی اس ست رنگے چہرے کی دید سے خود کو محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے شہد کی جھیلوں پہ گلابی پپوٹوں کے بادل گرا لیے۔ ہلکے سروں اور سادہ سی لے میں اجنبی الفاظ کا جادو میرے اردگرد پھیلنے لگا۔ اس کے پپوٹوں اور شفاف گردن پہ بیک وقت ہلکی نیلی رگیں ابھر اور ڈوب رہی تھیں۔ رخساروں پہ ہلکورے لیتے بھنوروں میں میں ایسا کھویا کہ وہ کب خاموش ہوئی پتا ہی نہ چلا۔

''کیسا لگا؟'' وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا وہ مزید بتانے لگی۔

''برہ'' یہاں کا لوک گیت ہے جس میں ایک لڑکی اپنے ایسے محبوب کے لیے محوِ انتظار ہے جو سفر میں ہے۔ وہ اس کی جدائی میں اپنی حالت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سفر میں اٹھائی جانے والی اس کی صعوبتوں پہ فکر مند ہے۔

اے میرے محبوب
میں ہر روز تمہارے لیے اپنے بالوں کے کنڈل بنا کے رکھتی ہوں۔
میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں
تم نے چھ ماہ دکھ اٹھایا ہے
اے میرے محبوب
لوٹ آؤ
میں تمہاری ٹانگوں کی تھکن، اپنے ہاتھوں میں سمولوں

اس نے بڑی خوب صورتی سے گیت کا ترجمہ پشتو میں دہرایا۔ تو مجھے ایک خیال آیا۔

''سنو، تم کچھ لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟''

''تھوڑا بہت، جتنا ابا پڑھا سکا۔ یہاں کتابیں عام نہیں ملتیں اس لیے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، میرا ابا بھی کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا، بس پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا۔ نماز، کلمے بھی یاد کرا دیے۔ ماں کے بعد ابا بہت بکھر گیا تھا۔ شادی کے پانچ چھ سال بعد تک بھی وادی کے اکثر لوگوں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا، ماں کا مذہب اختیار کر کے ہم لوگوں میں مل جائے لیکن اس کے برعکس ماں نے اس کے رنگ میں رنگنا مناسب سمجھا۔ یہ بات بہت سے لوگوں کو ہضم نہ ہوئی انہوں نے اس پہ اسی وادی میں رہنے کی شرط عائد کی اور ان کی توقع کے برعکس اس نے یہ بات مان لی۔ اس لیے وہ مجبوراً اسے برداشت کرتے رہے۔

ماں کے بعد ابا چاہتا تو مجھے لے کے یہاں سے جا سکتا تھا۔ اپنے شہر یا کہیں اور بھی، اس کے ماں باپ زندہ نہ تھے مگر بہن بھائی ذات برادری سب تھا۔ وہ کہیں جا کے نئے سرے سے زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن وہ نہیں گیا، اس وادی کو چھوڑ کے نہیں گیا، جو اس کے عشق کی گواہ تھی جو اس کی

محبت کی مہربان گود تھی۔

یہاں اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے، ان لوگوں کو اپنانے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا۔ یہ چند ایک ذرا پڑھے لکھے نوجوان نظر آ رہے ہیں۔ یہ ابا ہی کی بدولت ہیں۔ یہاں کے کاشت کاروں کو منڈی میں صحیح بھاؤ لگوانا بھی ابا نے سکھایا۔ بہت سی عورتیں اپنے شیر خوار بچے لیے اس کے پاس آتیں کہ وہ قصبے جا کر اسپرین، کھانسی کے شربت اور درد وغیرہ کی گولیاں لا کے رکھتا تھا۔ زیادہ بیمار بچوں کو خود قصبے لے کر جاتا علاج کے لیے۔ میری بوڑھی نانی کا سارا خرچہ اُٹھاتا اس کی اپنی ماں جیسی خدمت کی۔ اپنی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس نے اپنی عزت اور مقام تو بنا ہی لیا، آج میں بھی صرف اس کے کرموں کا پھل ہی کھا رہی ہوں، یہاں کا بچہ بچہ مجھے تعظیم دیتا ہے، میرے رشتے دار مجھے کسی امانت کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اپنے ابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وہ تمام عقیدے اور ارکان ادا کرتی ہوں، روزے رکھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ کبھی کسی نے میرے کسی عمل پہ اعتراض کیا نہ روکنے کی کوشش کی۔''

''تمہارے ابا کہاں کے رہنے والے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''لاہور نام بتاتے تھے اپنے شہر کا، سنا ہے بہت بڑا اور خوبصورت شہر ہے۔ تم نے دیکھا ہے۔'' وہ فرطِ اشتیاق سے بولی۔

''ہاں کئی بار، واقعی بڑا پر رونق شہر ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ لاہور کا رہنے والا کوئی شخص اتنے برسوں تک کیسے اس شہر کو بھلائے رہ سکتا ہے۔''

''عشق...... صرف عشق......'' وہ جذب کے سے عالم میں کہنے لگی۔

''ابا جیسا عشق کوئی اور نہیں کر سکتا۔'' اس کی بات پہ میں گنگنایا۔

ہم بھی اُڑائیں خاک بیاباں دشت سے تم گزرو تو سہی

ہم بھی دکھائیں چاک گریباں لیکن جاناں دیکھو تو

''دیکھیں گے۔'' اس کے منہ سے پہلی بار شستہ اردو کے الفاظ سن کر میں بری طرح چونکا۔

''تم...... اُردو بھی......'' اس سے پہلے ہمارے مابین صرف پشتو میں ہی گفتگو ہوا کرتی تھی۔

''تم نے پہلے بتایا ہی نہیں کہ......''

''تم بھی صاحب......'' وہ کھلکھلائی

''ابھی میں نے بتایا تھا ناں کہ میں پڑھنا اور لکھنا جانتی ہوں تم تب ہی سمجھ جاتے۔''

''ہاں بس وہ......'' میں خجل سا ہو گیا اس کے سامنے میں اتنا ہوش میں رہتا ہی کب تھا کہ ہر بات کی باریکی میں جا سکوں۔

۲۸ مئی ۱۹۸۰ء

زندگی اتنی خوب صورت ہو جائے گی یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دن اتنے مہکنے لگیں گے خبر ہی نہ تھی۔ پہروں اس کے ساتھ بتا کے بھی بچھڑتے وقت اداسی دل پہ اپنے پنجے گاڑ لیتی ہے۔ گھنٹوں اس کے ساتھ ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرنے کے بعد بھی واپس آ کے لگتا اس سے وہ سب تو کہا ہی نہیں جو

پچھلی شب سوچ کے رکھا تھا اور تو اور برسوں بعد ایسا ہوا ہے کہ میں نے کئی راتیں ڈائری نہ لکھی۔ اپنا دل میں کھولتا ہی ڈائری کے ذریعے تھا اور اب جب دل کو اک نیا رفیق مل گیا ہے تو......

وہ بولتی بھی تو اتنا اچھا ہے کہ گھنٹوں سنتے رہنے سے بھی تھکتا نہیں ہوں۔ وہ خود بھی جب تھک جائے تو چپ کر جاتی ہے اور تب میں اسے کچھ نہ کچھ کہہ کر چھیڑتا ہوں۔ غصہ بھی تو اسے اس قدر جلد آتا ہے تب وہ پھر سے بولنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے وہ بولتی رہے، میں سنتا رہوں چاہے وہ غصے میں ہی کیوں نہ کچھ کہہ رہی ہو۔ ابھی کل ہی وہ میری معلومات میں اضافے کے لیے وادی کے مختلف رسم ورواج اور عقیدے بتا رہی تھی۔

''یہاں کے لوگ نہایت کمزور عقیدہ رکھتے ہیں' کچھ تو تدریس سے بے بہرہ رہنے کی بدولت بھی ہے۔ بہر حال جو بھی ہے اپنے عقائد پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ''اگر'' یعنی جمعہ کا دن مقدس ہوتا ہے اس دن کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ تقریبات وغیرہ منعقد کرنے کے لیے یہ دن مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح 20 کا ہندسہ اور مارچ، اپریل مئی کے مہینے مقدس کہلاتے ہیں۔ پیاز کو یہ لوگ جنت کا مبارک پھل سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے لیے سیاہ رنگ مخصوص ہے۔ انہیں بال کٹوانا اور سرننگا رکھنا منع ہے۔ مرغ حرام ہے۔ اسی طرح اپنا پالا جانور خود کھانا بھی حرام ہے۔ عورت پر زمویشی کا گوشت کھانا حرام ہے وغیرہ وغیرہ، ہر آسمانی آفت اور نظام کے بارے میں ان کا اپنا نظریہ ہے جیسے بجلی چمکنے کا مطلب ہے پریاں لڑائی کے دوران تلوار چلا رہی ہیں۔ اور جب گھوڑا اور گائے آسمان پہ دوڑ لگاتے ہیں تو آندھی آجاتی ہے۔ پہاڑوں پہ پریاں رہتی ہیں جن کی خدمت میں نذر چڑھانا ہر شخص پر فرض ہے جو کوتاہی کرے پریاں اس کی زندگی پہ اچھا برا اثر ڈال سکتی ہیں۔''

وہ چپ ہوئی جیسے میری عدم دلچسپی کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دلچسپی تو لے رہا تھا مگر اس کے ہاتھوں کی حرکت میں جو الفاظ کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اسے دوبارہ بولنے پہ اُکسانے کے لیے میں نے چھیڑا۔

''یہ تم بار بار ''وہ لوگ، وہ لوگ'' کیا کہہ رہی ہو۔ تم خود کون سی کم ہو۔ یاد نہیں اس دن بستی میں گھر دکھاتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ ہر گھر کے داخلی دروازے پہ بکرے کے دو سینگ اور پتے لٹک رہے تھے۔ میں نے ہاتھ لگانا چاہا تو تم نے فوراً روک دیا۔''

''نہ نہ ہاتھ مت لگانا۔ انہیں ہاتھ لگانے والا فوراً بیمار پڑ جاتا ہے۔'' حسب توقع اس کا منہ پھول گیا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے، میں کوئی ان کے مذہبی عقیدوں پہ تو یقین نہیں رکھتی۔ نذر نہیں چڑھاتی، قربان گاہ نہیں جاتی، میرا ایمان بھی وہی ہے جو تمہارا ہے کہ بارش، آندھی، طوفان بھی زندگی اور موت کی طرح خدا کی طرف سے آتے ہیں اور ہر انسان کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کسی کو کیا خبر میں کن کن حالات میں اپنا ایمان بچائے بیٹھی ہوں۔'' وہ زیادہ ہی گرم ہوگئی۔

''اوہو تم تو برا مان گئیں۔ میں نے ایسا کب کہا کہ تم خدانخواستہ...... وہ تو اس دن تم نے ہی یہ بات کہی تھی جو میں نے یاد دلا دی۔''

''تو کیا ہوا...... ان لوگوں میں پلنے بڑھنے کا کچھ اثر تو ہونا ہی تھا۔ میری فطرت نہیں بدل سکتے یہ لوگ، عادتوں پہ تو اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پتا ہے ہمارے ہاں چارپائی شام سے پہلے پہلے جہاں بچھائی ہو، بچھا لی جاتی ہے۔ شام کے بعد کہیں اور منتقل نہیں کی جاتی۔ گھر کے باقی لوگوں کی طرح میں

بھی اسی معمول پہ قائم ہوں۔ لیکن یہ اور اس جیسی دوسری بے ضرری باتیں یہ تھوڑا ظاہر کرتی ہیں کہ میں ان میں سے ہوں۔ میرا ابا تو پکا مسلمان تھا لیکن گھر سے نکلتے ہوئے اگر کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سب کام چھوڑ کر واپس آ جاتا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی تو بے چارگی سے کہنے لگا۔

''پتا نہیں، مگر اماں ہمیشہ کہتی تھی کالی بلی کا راستہ کاٹ دینا منحوس ہوتا ہے۔''

''اچھا تمہارے ابا تم سے اپنے گھر کی، اپنے شہر کی باتیں کرتے تھے۔'' بمشکل میں موضوع تبدیل کر سکا تھا۔

''ہاں کبھی کبھی انہیں شہر سے زیادہ اپنا گاؤں یاد آتا تھا، جس میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا۔ اپنے اسکول کی باتیں اور ایک گیت تھا اُردو میں نہیں، کسی اور زبان میں شاید ان کی مادری زبان میں وہ اکثر گنگناتے تھے۔ مجھے بہت پسند تھا۔ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود دل پہ اثر کرتا تھا۔ ماں کے بعد ابا کے اس گیت کے بولوں میں اور بھی درد آ گیا تھا۔''

''پنجابی میں ہوگا۔'' میں نے قیاس کیا۔

''پتا نہیں، بہت مشکل زبان تھی، اردو کے دو تین لفظ تھے اس میں عمراں کا لیا۔'' وہ ذہن پہ زور ڈال رہی تھی۔

''عمراں لنگیاں پباں پار'' میں بھانپ گیا۔

''ہاں...... ہاں وہی......'' وہ اچھلی۔

''پنجابی کا گیت ہے بڑا مشہور۔ جہاں پنجابی بولی نہیں جاتی وہاں بھی پسند کیا جاتا ہے۔ مجھے بھی اسے سننا بہت اچھا لگتا تھا۔ میری ایک پنجابی دوست نے اس کا لفظ لفظ ترجمہ جب سے مجھے بتایا مجھے اس گیت سے اور بھی محبت ہو گئی۔''

''مجھے سناؤ ناں۔'' اس کی فرمائش پہ میں نے صاف انکار کر دیا۔

''میں گاؤں گا نہیں۔ مجھے گانا نہیں آتا البتہ تمہیں ویسے ہی اس کے بول سنا دیتا ہوں مطلب کے ساتھ۔'' تب میں نے اسے کئی بول مطلب سمیت سنائے جو بات اسے زیادہ اچھی لگتی وہ دوبارہ فرمائش کر کے سنتی۔

عمراں لنگیاں پباں پار

ہالے نہ وس او کالیا

یعنی ساری عمر پنجوں کے بل رستہ تکتے گزر گئی۔ کچھ پل اور ٹھہر جا اے کالے بادل ابھی نہ برس شاید وہ آتا ہی ہو۔

پھلاں دے رنگ کالے

سرخ گلاباں دے موسم وچ

پھلاں دے رنگ کالے

جدائی میں گزری بہار بھی ویران دکھتی ہے اور سرخ گلابوں کے موسم میں پھولوں کے رنگ سیاہ نظر آتے ہیں۔

یہاں اس نے مجھے ٹوک کر دوبارہ اشعار اور مطلب سنے۔

''مجھے کچھ صحیح طرح سمجھ نہیں آیا۔ جدائی کا کرب اپنی جگہ لیکن پھولوں کا تو جو رنگ ہے سو وہی رہے گا۔ بھلا سرخ گلاب کالے کیسے نظر آنے لگتے ہیں۔''

''بھئی میں تو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہی دہرا سکتا ہوں کوئی شاعر تو نہیں جو شعر کی روح میں اتر کر معنی چرا لوں۔ اتنی شاعرانہ حس ضرور ہے کہ شاعر نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کو دل کے اندر تک محسوس کر سکوں لیکن معاف کرنا میں اتنا بڑا زبان دان نہیں جو مکمل تشریح کے ساتھ تمہاری تسلی کرا سکوں۔ ہاں اگلے بول سنو جو میں بڑے دل اور جذب کے ساتھ کہہ رہا ہوں شاید یہ بات سمجھ جاؤ۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ساری مٹھاس اپنے اندر سموتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سڑساں
جے میں مکھ ماہی ولوں موڑاں

''اگر کبھی میں نے تم سے مکھ موڑا، کبھی زندگی میں تمہارا دل دکھایا، کبھی بے وفائی کا سوچا بھی تو خدا مجھے دوزخ میں پھینک دے، مجھے ازل تک جلنے کے لیے......''

میں اپنا عہد پوری سچائی کے ساتھ دہرا رہا تھا، جب ان شہد سے بھری جھیلوں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا اور ایک گلابی، ہتھیلی میرے لبوں پہ ٹھہر گئی۔

☆☆☆

۳۱ مئی ۱۹۸۰ء

فیروز کی اچانک آمد پہ میں حیران رہ گیا۔ وہ دو ہفتے کا کہہ کر گیا تھا اور بمشکل ایک ہفتہ رہ کر واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا متفکر رویہ اور کھوجتے انداز بھی مجھے متوجہ کر گئے اور پھر اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

''لالہ میں کیا سن رہا ہوں تم اور..... لڑکی؟''

''لڑکی؟'' میں چونکا۔ ''تمہارا مطلب ہے مومنہ۔''

''ہاں وہی، مجھے سوات تک اطلاع مل گئی تھی مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ تمہارا نام کسی لڑکی اور وہ بھی کسی پہاڑی لڑکی کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ بہت کم عرصے میں کافی جان چکا ہوں تمہیں اور مجھے یقین ہے تم نے یونہی دن رنگین گزارنے کے لیے تو یہ کھیل شروع نہیں کیا ہوگا۔ یہ تمہاری فطرت میں ہی نہیں اور دوسری صورت میں..... یعنی اگر معاملہ سیریس ہے تو..... پھر۔''

''پھر.....؟'' اس پھر تک تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

''پھر یہ کہ آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میں نے ایران چاچا سے تمام معلومات لی ہیں اس کے بارے میں۔ اگرچہ وہ وادی کے مذہب سے تعلق نہیں رکھتی لیکن تمام لوگ اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کے والد کے ان لوگوں پہ کافی احسانات ہیں اور وہ احسان فراموش لوگ ہرگز نہیں۔ اس لیے کسی قیمتی امانت کی طرح اسے سنبھال کر رکھا ہے۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق اس کے ننھیال والے کسی مسلمان گھرانے میں ہی اس کی شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بستی والے اور یہاں قصبے کے لوگ بھی کم ہی یقین کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے، کافر قبیلے کے درمیان پرورش پانے کی وجہ سے اس پر کافر ہونے کا لیبل لگ چکا ہے ایسے میں تمہارا سہارا دینا ان لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ مشکل اگر کوئی پیش آئے گی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے ہوگی۔

پتا نہیں تم اتنا بولڈ اسٹیپ لینے کی جرات کر پاتے ہو یا نہیں اور اگر کر بھی لیتے ہو تو یہ پتا نہیں کہ تمہارا خاندان تمہارے اس فیصلے کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ قبول کرتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے پہلے تم فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا ہے تم کس حد تک انوالو ہو؟ اگر یہ محض وقتی جذبہ ہے اور تم خود میں اس کی خاطر سارے خاندان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں پاتے تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے اس تمام قصے کو یہیں دفن کرو اور میرے ساتھ واپس چلنے کی تیاری کرو کیونکہ ایران چاچا کو ان کے قبیلے کے بڑوں نے میرے پاس بھیجا تھا اور اس الٹی میٹم کے ساتھ کہ عزت کے ساتھ لڑکی رخصت کرانی ہے تو باقاعدہ اس کے ماموں کے پاس رشتہ بھیجا جائے ورنہ ساری مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ایک طرف۔

اپنی لڑکی اور وہ بھی ایسی لڑکی جسے انہوں نے کسی مقدس امانت کی طرح رکھا ہو اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کی اجازت وہ نہیں دے سکتے۔''

اس کی طویل تقریر کے اختتام پہ میں نے لمبی سانس کھینچ کے کب سے تنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

''بہت بہت شکریہ.....''

''کس بات کا؟ خبردار کرنے کا؟'' وہ میرے ردعمل پر حیران تھا۔

''نہیں میرے جذبوں کو ایک واضح صورت دینے کا۔ میرے قدموں کو ایک صحیح سمت موڑنے کا، اور یہ جو کئی دن سے ایک بے نام سی الجھن تھی میرے دل میں کہ اب کیا ہوگا...... کیا کروں گا میں...... کیسے واپس جا پاؤں گا...... کیسے رہ سکوں گا اس کے بغیر اس الجھن کا حل میرے سامنے پیش کرنے کا، بہت بہت شکریہ'' میں کھل کر ہنسا۔

''ہاؤ اسٹوپڈ آئی ایم (کتنا احمق ہوں میں) اتنی سی بات تھی اور کبھی میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔''

''واقعی......؟'' فیروز تعجب سے بولا پھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

''کمال شے ہے تو بھی یار ازریاب۔''

''اب راہ سجھائی دے ہی گئی تو میرا خیال ہے دیر نہیں کرنا چاہئے۔ کیا کل ہی چلیں بات کرنے؟'' میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا، جیسے اگلے قدم پہ ہی تو ''کل'' ہے وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے اپنے بزرگوں سے بات کرلو۔ شاید انہیں کچھ اعتراضات ہوں۔''

''شاید نہیں یقیناً وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا۔''

''پھر بھی...... بے شک تم اپنے فیصلے پہ قائم رہو...... اپنی مرضی سے ہر کام کرو...... لیکن رسمی طور پر ہی سہی، تمہیں ان سے بات تو کرنی چاہئے۔ یہ عمر بھر کی بات ہے نہ تو تم ہمیشہ کے لیے خاندان سے کٹ کے رہ سکتے ہو نہ ہی بیوی کو پوشیدہ رکھ سکتے ہو، اگر تم نے ان سے چھپا کے شادی کر بھی لی تو۔''

''میں چھپا کے شادی کر رہا ہوں نہ چھپا کے بیوی کو رکھوں گا۔ ہاں میں فی الحال انہیں اطلاع دیئے بغیر ان کی غیر موجودگی میں یہ شادی کر کے رہوں گا۔ رسمی طور پر بھی ان سے اجازت طلب کرنے کا مطلب ہے انہیں الرٹ کر دینا۔ جب ان کے انکار کے بعد بھی میں نے اپنی مرضی سے ہی شادی کرنی ہے تو ابھی کیوں نہیں، کم از کم ابھی کسی کی دخل اندازی کا اندیشہ تو نہیں لیکن اگر باچا جان اور بڑے لالہ کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ مجھے اپنے فیصلے اور ارادے سے باز رکھنے کی اور پھر بی بی جان...... تم جانتے ہی ہو یہ خونی رشتوں کی ایموشنل بلیک میلنگ، میں بغیر کسی ذہنی دباؤ اور پریشانی کے اپنی زندگی کا یہ سنہرا دور شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا تم میری مدد کرو گے۔''

میں نے اچھی طرح اپنا نقطہ نظر اس پہ واضح کرنے کے بعد اس کا تعاون طلب کیا تھا اور جواباً اس نے پوری گرم جوشی کے ساتھ مجھے وسیع بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔

یکم جون ۱۹۸۰ء

مومنہ کا طرزِ عمل میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ میری بات سن کے کھل جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے خوف کے سائے ناپید ہو جائیں گے اور دل میں اپنے بے یقین مستقبل کے حوالے سے لپسے سوالوں کو جواب مل جائے گا۔ لیکن میری بات سن کے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور واضح ہو گئے۔ وہ یوں بدک کے اچھلی جیسے میں نے اسے شادی کی پیش کش نہ کی ہو بلکہ آگ کے دریا میں کودنے کی

دعوت دی ہو۔اس کے دوٹوک انکار پہ میں بھڑک ہی تو گیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیوں نہیں شادی کرسکتیں تم مجھ سے، میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیا کمی ہے مجھ میں۔اس لیے کوئی بھی شخص خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا۔لیکن اگر تم ہر کمی اور خامی سمیت مجھ سے محبت کرسکتی ہو، تو شادی کیوں نہیں......''

''بس نہیں کرسکتی، کہاناں بالکل نہیں کرسکتی۔''اس کے مسلسل نفی میں سر ہلانے پر غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی نے بھی مجھے گھیر لیا۔

''میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری محبت پر شک بھی نہیں کرسکتا۔یہ بھی نہیں تصور کرسکتا کہ تم نے مجھ سے محبت کا ڈرامہ کیا۔مجھ سے جھوٹے اقرار کیے،نہیں......نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں مومنہ ایسا نہیں کرسکتی، یہ چہرہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا، یہ آنکھیں کوئی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔''اس لمحے شدت سے میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے اسے اپنی آنکھوں میں جھانکنے پہ مجبور کروں لیکن میں نے خود پہ قابو پایا اور دوزانو اس کے روبرو بیٹھ کے عاجزی سے کہنے لگا۔

''مومنہ خدا کے لیے کچھ سوچو......وہ کیا وجہ ہے، کون سی مجبوری ہے جو تمہیں اس شادی سے انکار پر اکسا رہی ہے۔''میرے بار بار کے اصرار پر وہ اپنے اندیشوں کو زبان دینے پہ تیار ہوگئی۔

''تمہیں بہت آسان لگ رہا ہے ناں یوں سارے خاندان سے کٹ کر مجھے اپنا لینا۔سارے جہان سے ٹکر لے کر اپنی من مانی کرنا۔ایک فرد کی محبت پانے کے لیے دوسرے تمام رشتوں کو ٹھکرا دینا اتنا ہی سہل نہیں۔یہ جو تم بار بار کہہ رہے ہو۔بعد میں دیکھیں گے اور بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔اس کی کیا ضمانت ہے تمہارے پاس۔ہوسکتا ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہ بچے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن بھائی نہ خاندان، نہ جائیداد۔''

''اور تم......تم تو رہو گی ناں۔''

''فرض کرو میں بھی نہ رہی تو۔ابا نے بھی ماں کے بھروسے سب کو چھوڑا۔لیکن ماں کو تو زندگی نے بس چھ سال کی مہلت دی۔اس کے بعد کیا رہا میرے ابا کے پاس۔میری صورت میں ایک مستقل ذمہ داری اور بس......میں نہیں چاہتی کل کو پھر سے تم اور میں اسی عذاب سے گزریں۔اپنوں کی بے اعتنائی کا کرب سہیں۔ماں کے پاس تو پھر بھی اس کے تمام رشتے موجود تھے۔میرا دامن تو خالی ہے۔میں خود تہی داماں، تمہیں کیا دے سکوں گی۔''

''مجھے صرف تم چاہیے ہو مومنہ، صرف تم اور تمہارے لیے میں کوئی بھی نقصان اٹھانے کو تیار ہوں۔تمہارا ساتھ میری زندگی کے لیے اتنی بڑی آسائش ہے کہ اس کے بعد مجھے کوئی خسارہ خسارہ نہیں لگے گا۔''

''اور میرے بارے میں کیا سوچا تم نے، میں کتنے خسارے میں رہوں گی۔کل بھی تہی داماں، آج بھی اور آنے والے کل میں بھی میرے لیے کوئی رشتہ نہیں ہے۔تمہاری اور میری محبت آج بھی اتنی ہی تناور ہے، کسی رشتے کے بغیر بھی، ہماری شادی نہ بھی ہوئی تم مجھے کبھی نہ بھی ملے تب بھی میرے دل میں تمہارے لیے وہی مقام رہے گا۔تم دنیا کے کسی کونے میں بھی چلے جاؤ میں تمہاری یادوں میں زندہ رہوں گی۔اس بات کا یقین ہے مجھے۔پھر میں صرف محبت کے نام پہ تم سے شادی کیوں کروں۔

اگر مجھے کسی سے شادی کرنا ہوگی تو وہ ایسا شخص ہوگا جو مجھے ایک ہی رشتے سے متعارف نہیں کروائے گا جو مجھے کسی کی بہو، کسی کی بھابھی

بنائے گا، جو مجھے ایک بھرے پرے کنبے میں بسائے گا، مجھے وہ دے گا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور پھر چاہے مجھے اس سے محبت ہو یا نہ ہو وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ اگر شادی صرف ایک بار ہی ہوتی ہے تو میں اسی سے کروں گی۔ ورنہ بے نام ونشاں تو میں یہاں بھی ہوں، تمہارے ساتھ جا کے بھی بے سائباں نہیں ہونا چاہتی۔''

''تو پھر میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ مومنہ علی، ایک خٹک مرد تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم پوری آن بان اور وقار کے ساتھ اس کے گھر جاؤ گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

''تم مجھے آن بان اور وقار کے ساتھ وہاں لے تو جاؤ گے لیکن سب کو مجبور تو نہیں کر سکو گے کہ وہ میرے وقار کا احترام کریں۔ نہیں خان زبردستی تم مجھے ان کے سروں پر تھوپ کے اور بھی بے توقیر کر دو گے۔ میں سب سہہ سکتی ہوں اپنی بے عزتی اور تذلیل نہیں۔''

اس کے لہجے میں سختی محسوس کر کے میں چپ کر گیا کہتا بھی کیا، میں ہر طرح کے بلند و بانگ دعوے کر سکتا ہوں اور شاید ان پہ عمل بھی لیکن کیا میں واقعی باچا جان کی نظروں میں اسے بہو کی حیثیت دلا سکتا ہوں؟ کیا اپنے خاندان والوں کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اسے خٹک فیملی کے باعزت فرد کی طرح محترم اور عزیز جانیں۔

ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد شاید میرے ماں باپ میری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس شادی کو تسلیم کر لیں، مومنہ کو خٹک ہاؤس میں قدم رکھنے کی اجازت بھی مل جائے، لیکن وہ اتنے وسیع القلب ہرگز نہیں ہو سکتے کہ ایک کم نسب و کم حیثیت سی لڑکی کو گھر کے ساتھ ساتھ دل میں بھی جگہ دے دیں۔ مجھے چپ ہی رہنا تھا۔ میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا جسے پورا کرنا میرے اختیار میں نہ ہو۔

۲ جون ۱۹۸۰ء

اس اذیت ناک رات کی تمام ترسفاکی میرے چہرے پہ رقم تھی۔ رت جگے اور تذبذب کے خون آشام سائے آنکھوں سے ہویدا تھے۔ پلکیں جھپکنے میں بھی سینکڑوں کانٹے چبھ جاتے تھے۔ میری حالت دیکھ کے فیروز بے چین ہو گیا اس کے پرخلوص استفسار پہ میں نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ وہی اپنے ارادے کی پختگی اور مومنہ کے انکار کے پس منظر میں موجود تمام تر اندیشے۔

''فیروز، وہ ایک بار میرا ساتھ دینے پہ تیار ہو جائے تو ہر مرحلہ خود بخود آسان ہو جائے گا۔ میں ایک دم سے اسے لے جا کے باچا جان کے سامنے نہیں کھڑا کر سکتا، نہ ہی وہ اسے اس طرح قبول کر لیں گے۔ وہ کم از کم مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں اپنا نام اس کے نام کے آگے لگا سکوں۔ مجھے اس کی ہمراہی کا اعتبار آ جائے تو میں تمام دنیا کا سامنا کر لوں گا۔ بس ایک بار وہ میری مان لے۔''

میں بے بسی سے نڈھال تھا، اس کا اچانک اٹھ کے جانا بھی محسوس نہیں کر سکا۔ چند گھنٹوں بعد جب وہ واپس آیا تو خوشی سے چہرہ گلنار تھا اور عجلت و بے تابی اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

''اٹھو خان خاناں...... اٹھو جان جاناں...... آؤ تمہیں بنائیں سنواریں...... جلدی کرو، کام زیادہ اور وقت کم ہے۔ پہلے تو یہ لٹکا ہوا چہرہ اصل حالت میں واپس لاؤ، پھر انجینئر خان سے حجامت وغیرہ بنواؤ، کچھ شکل پہ رونق لاؤ۔ میرے یار کی بارات نکلنی ہے آج۔'' اس کی بے ربط گفتگو

میری سمجھ سے باہر تھی۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بارات؟ کون سا یار؟'' وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''میں گیا تھا مومنہ کے پاس، کچھ باتیں اس کی بھی سچی تھیں، اس کے اپنے اندیشے اپنی فکریں تھیں بڑی خوددار اور ناموس والی لڑکی ہے۔ ایک پختون زادے کو اور کیا چاہیے۔ ایسی شریک حیات جو آن بان اور شان میں اصلی ہو۔''

وہ نجانے اور کتنی دیر مومنہ کے قصیدے پڑھتا کہ میں نے ٹوک دیا۔

''تمہاری بات کیا ہوئی اس سے، مجھے یہ بتاؤ۔''

''قصہ مختصر یہ کہ وہ تم سے شادی پہ تیار ہے۔'' اس نے بالکل ہی حتمی بات کہہ دی جب کہ میں اس کی تفصیل جاننے پہ بے تاب۔

''اوہو مگر یہ ہوا کیسے، تم نے کیا کہا اس سے؟''

''اسے اعتماد دیا ہے، جس سے اس کی ذات نا آشنا تھی۔ اسے وہ رشتہ دیا ہے جس کے سہارے وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ یار عورت بڑی عجیب چیز ہے۔ محبت کے بارے میں بڑی حرص ہے اس کے اندر، چاہتی ہے ہر رشتے، ہر حوالے سے چاہی جائے اور پھر مومنہ جیسی عورت جس سے قدرت نے ہر رشتہ چھین لیا تھا۔ اس کے اندر تو یہ طلب اور بھڑکی ہوئی تھی۔ میں اس سے تیرا یار بن کے ملنے گیا تھا لیکن اسے بہن بنا کے آ رہا ہوں۔

اور پھر وہ اپنی ذات اور تقدس کے حوالے سے بے حد حساس ہے بڑے بڑے خراب حالات اور نا مساعد ماحول میں بھی اس نے خود کو سنبھال کے رکھا ہے۔ اپنی پاکیزگی، اپنے ایمان پہ غرور کی حد تک ناز ہے اسے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی اسے یا اس کے کردار کو نشانہ بنائے۔ جب کہ تمہارے اپنی پسند کی شادی کر لینے کی صورت میں کم از کم تمہارے گھر والوں سے تو اسے یہ طعنے سننے ہی پڑیں گے۔ اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تمہارا نکاح ابھی اسی وقت قصبے کی مسجد میں ہوگا۔ صبح ہم سب سید و شریف روانہ ہوں گے اور میری حویلی سے مومنہ رخصت ہوگی۔ تب جب تم اپنے والد یا بھائی کے ساتھ اسے لینے آؤ گے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اور اس سلسلے میں تم کوئی اعتراض نہیں کرو گے۔''

''لیکن تم نے یہ فیصلہ......''

''صرف اور صرف اپنی بہن کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس کے کردار و مقام پہ کوئی حرف نہیں آئے اور اپنے یار کو اس کی تمام خوشیاں دلانے کے لیے مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اچھا اب تفتیش کرنا بند کرو اور اٹھ کر ڈھنگ کے کوئی کپڑے پہن لو، اگر ہیں تو......'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔

میں......میری تو وہ حالت تھی کہ میں اس کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکا اور اچھا ہی ہوا۔ بھلا الفاظ اس کی محبت اور خلوص کا حق ادا کر سکتے تھے۔ میں خوشی سے گنگ تھا جب کہ مسرتیں اظہار کے لیے بے تاب، اسی لیے فوراً تم سے اے میری ڈائری، تم سے اپنی خوشی شیئر کرنے بیٹھ گیا۔ جب کہ آتے جاتے مختلف انتظامات میں مصروف فیروز کی پکار مجھے بار بار ڈسٹرب کر رہی ہے۔

۳ جون ۱۹۸۰ء

اور بالآخر مومنہ علی، مومنہ زریاب خٹک بن ہی گئی۔ چاہے کسی بھی طرح ہوئی مگر یہ شادی ہو تو گئی۔ مومنہ کی ضد کہ میرے گھر والے خود اسے رخصت کرانے آئیں اور میری مجبوری کہ باچا جان کسی صورت بھی کافرستان اپنے بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے نہیں آسکتے تھے اور کافرستان سے اسے بغیر کسی تعلق کے میں لے جا نہیں سکتا تھا۔ یہ شادی یونہی ہونی تھی...... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں شہد کی دو جھیلوں کو بس پیاسا ہی تکتا رہوں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کی مٹھاس سے میرے لب سیراب ہوں۔ یہ شادی یونہی کیوں ہوئی تھی؟ کیوں؟ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خان ارباب خٹک کا سب سے لائق فائق اور لاڈلا بیٹا خان زریاب خٹک، سرحد کے مشہور خانوادے کا چشم و چراغ سینکڑوں میل پہ پھیلی اراضی اور کروڑوں کی جائیداد کا وارث، اپنی بارات میں چند پہاڑی لوگوں کی ٹولی لے کے مانگے کا شلوار سوٹ پہن کر پیدل، کافرستان کی بستی میں تنگ گلی کے آخری کونے پہ موجود لکڑی اور پتھروں سے بنے اس دو منزلہ مکان تک چل کے جائے گا۔

دروازے پہ موجود چند بزرگ عورتوں نے میرا استقبال کیا اور میرے گلے میں خشک میوہ جات سے پرویا ہوا ایک ہار ڈال کر خیر مقدمی گیت گائے۔ گھر کے کچے احاطے میں کئی بچیاں تالیاں پیٹ پیٹ کے بے حال ہو رہی تھیں۔ نکاح مسجد میں ہو چکا تھا۔ مومنہ کے ماموں اور خالہ چونکہ مسجد تک نہیں آسکتے تھے اس لیے ان کی خوشی کے لیے میں خود چل کے یہاں تک آیا تھا تا کہ وہ اپنے رسوم و قواعد کے مطابق اسے رخصت کریں۔ لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ رسمیں اس قدر فضول اور بے زار کن ہوں گی۔ خصوصاً اس وقت تو میں جھلا گیا جب میرے ہی پاؤں کے موزے اتروا کے انہیں جلانے کے بعد مجھے دھونی دی گئی۔ میرے چہرے پہ ناگواری محسوس کر کے ایران چا چا نے بتایا۔

''بچہ یہ تمہاری نظر اتارتا ہے۔ جب دو محبت کرنے والے ایک ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں کی روحیں تڑپ جاتی ہیں۔ جنہیں دنیا میں اپنی محبت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے حسد اور نظر بد سے بچانے کے لیے یہ اماں تمہیں دھونی دے رہی ہے۔''

اور کوئی یقین نہیں کرے گا کہ میں...... جی ہاں میں حاسدوں کے خوف سے دبک کے بیٹھ گیا اور چپ چپ نظر اتروانے لگا۔

کون کہتا ہے محبت دلیر ہوتی ہے۔ جی نہیں محبت تو بزدل ہوتی ہے۔ ذرا سے خطرے کو محسوس کر کے سہم جاتی ہے۔

☆☆☆

خان زریاب خٹک۔

مومنہ علی۔

اور......

فیروز وردگ۔

ایک سیدھی سادی کہانی کے آسان فہم سے کردار۔

پھر ابہام کہاں ہے؟ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

شاید تب جب باچا جان کو بابا کے اس جرات مندانہ اقدام کی خبر ملی ہوگی۔ یا تب جب بابا جان مما کو لے کر یہاں آئے ہوں گے لیکن تب اس وقت فیروز ورد گ کا کیا کردار رہ جاتا ہوگا اس ساری کہانی میں، کیوں ان کا نام اب بھی بابا جان کے حوالے سے اس قدر خوف و ہراس کے ساتھ لیا جا رہا ہے......کیوں؟ آخر کیوں؟

مقدس پہ جان لینے کی بے تابی سوار تھی لیکن ساتھ ساتھ ہی تحریر کا جادو بھی اسے جکڑ رہا تھا، وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ ان تمام احساسات کو خود پہ گزرتا دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایک سطر پڑھنے پہ مجبور تھی۔ ورنہ شاید دل تو اس کا ڈائری کے اختتامی صفحات میں اٹکا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک دھڑکتا ہوا سا سناٹا پھیلا ہوا تھا پورے کمرے میں صرف باچا جان کی اکھڑی اور دشوار سانسوں کی آمدورفت کا شور تھا یا پھر بی بی جان کی دبی دبی سسکیوں کی مدھم آوازیں۔ ضبط گریہ سے ان کی بلوریں آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ سفید پر جلال چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور دانتوں سے سختی کے ساتھ بھینچے لب سسکیاں روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ خان افراسیاب خٹک نے یکدم اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب مزید خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خان دراب خٹک نے بھی ڈاکٹر کی تازہ ترین رپورٹ کو دسویں بار پڑھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بھائی کو دیکھنا شروع کر دیا کہ کب وہ اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ تیسری بار بی بی جان کے سامنے گزرتے ہوئے وہ اچانک پلٹنے اور والد محترم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''آپ کی وجہ سے باچا جان......صرف اور صرف آپ کی وجہ سے زریاب کا یہ حال ہوا ہے اور اس کے بے حال ہونے کی وجہ سے آج ہم سب کی حالت دگرگوں ہے۔ ہر چیز کے ذمہ دار آپ ہیں۔ آپ ہی ہیں اس کی ہر فضول حرکت اور بے کار مشاغل کو بڑھاوا دینے والے، اس کے ہر روایت شکن اقدام سے چشم پوشی کرنے والے اور اس کی ہر ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے کمزور پڑنے والے۔''

خان ارباب خٹک کے ناتواں اور جھریوں بھرے چہرے پہ موجود آنکھیں حیرت سے پوری طرح کھل گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے بلاشبہ پہلی بار کسی کی اتنی اونچی آواز سنی تھی۔ پہلی بار کوئی ان کے سامنے ان کے جرم گنوا رہا تھا اور انگلی اٹھانے والا کوئی اور نہیں ان کا اپنا بیٹا، ان کا بڑا بیٹا خان افراسیاب خٹک تھا۔

غم و غصے کی شدت سے ان کی رگیں ابھر آئیں اور سانس گویا چند لمحوں کے لیے ڈوب ہی گئی۔ بی بی جان تڑپ کے اٹھیں لیکن ان سے پہلے ہی دراب نے لپک کر آکسیجن کی پائپ سیٹ کر دی۔ وہ وہیں اپنے خان کے سرہانے کھڑی تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔ دراب نے باچا جان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے بھائی کو ملامتی نظروں سے گھورا۔

''بڑے لالہ، پلیز اپنے آپ پر کنٹرول کیجئے۔ باچا جان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ آپ کی تند و تیز باتیں سہ سکیں۔''

''باپ بستر پہ ہے، لاغر ہے، مجبور ہے، بے بس ہے مگر......'' بی بی جان نے بھی برستی آنکھوں سے بڑے فرزند کو دیکھا۔

''مت بھولو کہ وہ تمہارا باپ ہے۔ اپنے بڑوں سے اس طرح پیش آنا تو ہم نے تمہیں نہیں سکھایا افراسیاب۔''

''یہ ہی تو رونا ہے آپ نے جو کچھ سکھانا تھا بس مجھے زرسانگہ اور دراب کو سکھایا سارے حدود وقیود کا احترام، بزرگوں اور ان کی مرضی کو ہر حال میں مقدم جاننا، خاندانی حرمت وناموس کو بتایا ہر چیز پر اولیت دینا......کاش......کاش......زریاب کو بھی کچھ سکھایا ہوتا لیکن اسے یہاں رہنے کا موقع ہی کب ملا۔ وہ یہاں رہتا تو اسے اپنی روایات وخاندان سے انس بھی ہوتا۔ باچا جان کی طرف سے اسے کھلی چھوٹ مل گئی تھی، بنجارہ بن گیا تھا وہ......نگر نگر گھومنے والا......اور بنجارن ہی اٹھا لایا گھر میں۔''

''لالہ کی طبیعت میں ہی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ یہ جاگیر اور قواعد و پابندیاں سب ان کی فطرت سے بہت دور کی چیزیں تھیں۔ اس میں باچا جان یا بی بی جان کی تربیت کو مورد الزام ٹھہرانا غلط ہے۔'' دراب نے کہا۔

''اولاد کو لگام ڈالنا تو فرض ہے ماں باپ کا اور ایسی کی تیسی ایسی فطرت اور طبیعت کی جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگیاں داؤ پر لگا دے۔'' افراسیاب کسی طور اپنا غضب دبانے پہ تیار نہ تھے۔

''نہ اس کی سوچ بے لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر بھٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے یاروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پہاڑن اسے ملتی......اور اگر یہ سب ہونا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے ہار مان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے، کیوں اس کی نا خلفی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر رکھ کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے نکاح کر لینا اتنا قابل معافی جرم نہیں تھا۔ انہیں چاہیے تھا اسے قید میں ڈلوا دیتے۔ لڑکی کو مروا کے کالام ہی کے پہاڑوں میں پھنکوا دیتے۔ عشق کا چند روزہ بخار اتر ہی جانا تھا ایک دن۔''

''بعض جادو سر چڑھ کر بولتے ہیں۔'' بی بی جان نے سرد آہ بھری۔

''اپنی ہی اولاد کو خود اذیت دینا آسان کام نہیں۔ اس لڑکی کو مروانا ناممکن نہیں تھا لیکن تم نہیں جانتے اس وقت زریاب کا جنون کس درجے کا تھا، اسے کھو دینے کے ڈر سے خان جی اس لڑکی کا بال بھی بیکا نہ کر سکے مگر یقین کرو انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی۔ لاتعلقی اختیار کرنے کی دھمکی بھی دی اور عاق کر دینے کا ڈراوا بھی لیکن سب بے سود۔ وہ پہلے ہی ہر چیز سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے چھوڑ دینے پہ تیار تھا۔ خان جی اس کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ تم ایک باپ ہو، باپ کی مجبوری جان سکتے ہو۔'' انہوں نے شوہر کی طرف سے صفائی پیش کی۔

''میں صرف ایک باپ ہی نہیں، ایک بھائی بھی ہوں۔'' افراسیاب تھکے تھکے انداز میں کرسی پہ گر گئے۔ ان کے انداز سے بے چارگی ظاہر تھی اور آواز میں شکستگی۔

''اس کی جوانی برباد ہونے کا غم کیا مجھے نہیں ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ پچھلے بیس سال اس گھر کے کسی فرد نے پر سکون گزارے ہیں۔ کون ہے جو رات کو انگاروں پہ نہیں لوٹتا ہوگا۔ یہ سوچ کر کہ خان زریاب خٹک جیسا نفیس اور حسین شہزادہ......'' دراب کی آنکھوں میں پھیلی نمی ان کے قیاس کی تائید کر رہی تھی۔

''میں صرف باپ ہی نہیں......ایک بھائی بھی ہوں، ایک بیٹا بھی ہوں...... یہ بے بسی مجھے تڑپاتی رہی کہ میں اتنا اثر و رسوخ رکھتے ہوئے بھی اپنے باپ کے سینے میں ٹھنڈک نہیں پیدا کر سکتا۔ جب میں اور دراب ان کے آگے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی نگاہیں ہمارے پہلو میں کس کو تلاشتی ہیں کیا میں نہیں جانتا......اور اب...... جب ان کی برسوں کی امیدیں پوری ہونے والی ہیں تو یہ فیروز کا مسئلہ...... ورد گ خاندان اس کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔'' وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں مٹھیاں کھول اور بھینچ رہے تھے۔

''اسی لیے رہ رہ کے مجھے بس یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس وقت ہی اس مصیبت کا سدباب ہو گیا ہوتا۔ اس نے نکاح کر ہی لیا تھا تو کم از کم اس کی اس حرکت پہ خاموشی سے ہتھیار نہیں ڈال دینے چاہیے تھے۔ اس ذلیل عورت کو کھلی چھوٹ دے دی ہم لوگوں نے زریاب کی زندگی سے کھیلنے کی۔''

''گزرے وقت کو کوسنے سے کیا فائدہ لالہ۔ آپ بس اب کسی طرح کچھ ایسے انتظامات کریں کہ زریاب لالہ کو فوراً یورپ، یا اسٹیٹس بھیجا جا سکے۔''

''ہوں...... کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں میں بھی۔''

☆☆☆

وہ لے جاتا ہے سورج مجھ سے جینے کی سکت

رات بھر بن بن کے دن بھر ٹوٹتا رہتا ہوں میں

وقت کی آندھی سے کھل کھل جاتی ہے میری گرہ

خود کو کس کس کے ہر وقت باندھتا رہتا ہوں میں

ہر دن پہلے سے کہیں بڑھ کے بیزار کن اور ہر رات پہلے سے کہیں بڑھ کے طویل تر۔ ہر صبح کا سورج اپنے ہمراہ نیزے چبھوتی اذیتیں سمیٹے لاتا ہے اور ہر شام کی پھیلتی تاریکی کے جلو میں ڈھیروں ڈھیروں یادوں کے تارے ہوتے ہیں۔

یادیں۔

جو اور بھی نڈھال کر دیتی ہیں

یادیں......

جو اور بھی تنہا کر دیتی ہیں۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز سورج نکلے، مگر اسے میرے سڑتے بلتے وجود کی پرچھائیں بھی نہ ملیں سارا دن میرا تماشا دیکھنے والا شرمندگی سے اپنی ہی حدت آمیز آغوش میں منہ چھپالے کاش ایسا ہو۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز شام ڈھلے مگر اس کی تاریکی کا ساتھ دینے کے لیے اسے میں نہ ملوں۔ یادیں...... ان بوسیدہ دیواروں سے ٹکریں مارتی پھریں لیکن اس دل و دماغ تک پہنچنے والے تمام رستے اندھے ہو چکے ہوں، جہاں ہر رات یہ یادیں دھاوا بولتی ہیں۔ کاش......کاش......آہ......

لمبی سرد آہ کھینچتے ہی اس کی سانس پھر سے اکھڑ گئی، اس نے پورا منہ کھول کے اس مختصری چار دیواری میں موجود کثیف سی فضا سے زندگی کھینچنے کی کوشش کی لیکن جیسے سانس کے تمام رستے تنگ پڑ چکے تھے۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور حلق سے عجیب آوازیں نکلنے لگیں اس نے اپنا اوندھا سیدھا وجود بمشکل کھڑا کیا اور دیوار کے ٹھنڈے لمس کا سہارا لے کر سیدھا بالکل سیدھا کھڑا ہو کے سر اونچا کر کے سانس ہموار کرنے لگا۔

اپنے آپ سے ہم سخن رہنا

ہم نشیں، سانس اکھڑ جاتی ہے

☆☆☆

اور یہ آخری چند صفحات

مقدس نے چونک کے ضخیم ڈائری اور پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔

''آج سے پہلے میں کس قدر انجان تھی، کچھ بھی تو نہ جانتی تھی، کہاں ہیں میرے بابا جان...... کیسی ہیں میری مما...... کون ہیں وہ......۔

اور آج ایک ایک نقش جیسے میرے دل پہ نقش ہے اس حسین چہرے کا...... وہ چہرہ جو میری ماں کا ہے۔

اور آج جیسے میں دل کے اندر تک اُتر چکی ہوں...... اس کے دل کے اندر...... جو میرے باپ کا ہے۔

کتنا انوکھا تجربہ ہے یہ بھی ان احساسات کو لفظ بہ لفظ پڑھنا، محسوس کرنا۔

ان تجربات کی گہرائی سے گزرنا، وہی امید وبیم کی کیفیت، وہی انتظار کی بے تابیاں، وہی اظہار کی شدتیں...... وہی کرب کے عالم...... ہر چیز میں نے خود محسوس کی ہے۔ ہر چیز میں میں خود شامل ہوں۔

وہ میرے کسی جذبے، کسی احساس، کسی تجربے میں شامل نہیں۔ اس دکھ کا کچھ مداوا تو ہوا ہے ناں۔

اور یہ آخری چند صفحات۔

نجانے یہ کون سی کہانی سنائیں۔ شاید انہیں میں وہ راز قید ہو، وہ بھید دفن ہو، شاید یہی مجھے میرے ماں باپ کا سراغ دے جائیں۔''

اس نے ایک امید کے سہارے تھکی ہوئی آنکھوں کو پھر سے پڑھنے پر آمادہ کیا۔ اگرچہ اس ڈائری کے مطالعہ کے دوران وہ کچھ اس طرح کھو گئی تھی کہ یہ بات ذہن سے نکل ہی گئی کہ وہ اصل میں کیا جاننا چاہتی ہے لیکن اب آخری دو صفحات نے اس کی بے چینی پھر سے بڑھا دی تھی۔ یہ ڈائری ہی وہ واحد ذریعہ تھی جس سے وہ اتنا کچھ جان پائی تھی اور یہی ڈائری وہ واحد ذریعہ ہے جو اس کو اپنے باپ کا سراغ بھی دے سکتی تھی۔

وہ یہ تو جان ہی چکی تھی کہ شادی کے بعد بابا جان کو کتنا وقت لگا با چا جان کو رضامند کرنے میں اور کیا کیا دھمکیاں دے کر انہوں نے بی بی جان کو مجبور کیا تایا جان کی ناراضگی کا ذکر بھی تھا اور پھوپھی جان کی برہمی کا بھی۔ مما کے اندیشے بھی بیان کیے گئے تھے اور ان تمام واقعات کا بھی سرسری سا ذکر تھا جو شادی کے بعد حویلی میں پہلی بار آنے پر پیش آئے تھے۔

با چا جان نے ناپسندیدہ بہو کو تسلیم کرنے کے لیے بابا جان کی آوارگی خرید لی تھی۔ ان کے سیر و سیاحت کی شوق پہ پابندی لگا کر کاروبار

میں شریک ہونے کی شرط رکھی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپنی پسند کو زبردستی تسلیم کروانے کے باوجود بابا جان انہیں گھر کے افراد کے دل میں جگہ دینے سے قاصر رہے تھے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ خوشگوار شب و روز کا تذکرہ یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اہل خانہ کے کھنچے کھنچے رویے اور ناراضگی کے باوجود دونوں مطمئن اور شاد تھے اگرچہ اب ڈائری میں خاصی بے قاعدگی آ گئی تھی، کہیں چار روز تو کہیں دو ہفتے کے وقفے سے لکھی گئی تھی لیکن کہیں سے بھی دونوں کے مابین ہلکی پھلکی سی چپقلش اور ناچاقی کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اتنی انڈراسٹینڈنگ کے بعد آخر وہ کیا بات تھی جس نے یکا یک دونوں کے راستے الگ کر دیے۔ اس نے ڈائری پر نظر جمائی۔

۱۱۸کتوبر ۱۹۸۱ء

مجھے یقین نہیں آتا کہ پورے ڈیڑھ سال بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مومنہ کے ساتھ نے میرے اندر کی تنہائیوں کو یکسر ختم کر ڈالا ہے اور اب مجھے اپنے احساسات و جذبات بیان کرنے کے لیے کاغذ کے بے جان ٹکڑوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اس خاندان میں مس فٹ محسوس کیا۔

اپنے تمام لوگوں سے محبت کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر خود کو ان سے بہت فاصلے پہ پاتا تھا۔ چلو بی بی جان، زرسانگہ باجی وغیرہ سے ذہنی مطابقت نہ ہونے کی ایک وجہ تعلیم بھی ہو سکتی تھی وہ گھر کی دیواروں میں قید رہنے والی خواتین تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی سطح بھی اس درجہ کی ہی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کے میں ہمیشہ ہی خاندانی جھگڑوں کی تفصیل اور رشتوں کے تانے بانے سن سن کے بور ہوتا تھا۔

میرا دل کرتا ہے زرسانگہ باجی کے پاس بیٹھ کے انہیں وہ تمام واقعات سناؤں جو مجھے اپنے پچھلے سفر میں پیش آئے تھے اپنی آنکھوں سے انہیں دنیا کی سیر کراؤں لیکن ان کے پاس اپنی سہیلیوں اور کزنز کے جہیزوں اور رشتوں کے حاسدانہ تذکروں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور بڑے لالہ ...... ان سے میں محبت کرتا ہوں لیکن احترام کے ساتھ...... وہی احترام جو مجھے باچا جان سے قریب نہیں ہونے دیتا وہی احترام میرے اور لالہ کے درمیان بھی حائل ہے۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اپنے اور اپنی اولاد کے درمیان ایسا کوئی رعب و دبدبہ نہیں رکھوں گا کہ کھل کے محبت کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے ہم ایک دوسرے سے، پھر آخر دراب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹا بھی ہے، ہارورڈ میں پڑھتا ہے۔ پھر کیوں نہیں ہمارے مزاج ملتے۔ کبھی کبھی تعلیم بھی انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہارورڈ سے آنے کے بعد وہ یہاں مرغوں اور بازوں کی لڑائیوں کے کھیل کھیلتا ہے، جنگلی سوروں کا شکار کرتا ہے۔ باچا جان کی شوقیہ دشمن داریوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے اور پھر چھٹیاں ختم ہوتے ہی تعلیم میں مگن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے ہم تینوں بھائیوں میں سے وہی اصل خانزادہ ہے کہ باچا جان کے بقول اس کے تیور ہی اصل نسل خانوں والے ہیں۔ اگر ہر وقت بندوق اٹھائے رکھنا، سنگلاخ پہاڑوں پہ خاک اڑائے پھرنا اور پر ہیبت جنگلوں میں واہیات قسم کے جانور شکار کرتے پھرنا ہی خان ہونے کی شان ہے تو میں باز آیا ایسی سرداری سے۔ مجھے تو شروع ہی سے رنگ، خوشبو اور فضا اٹریکٹ کرتی رہی۔ جہاں جہاں رنگ نظر آئے میں چرانے گیا۔ جہاں سے خوشبو آئی میں اس کے تعاقب میں بھاگا اور ایسے میں صرف یہ ڈائری ہی تو تھی جو میرے ہر تجربے میں شریک تھی۔

پھر مومنہ آئی...... اور میں جو سوچے بیٹھا تھا کہ خاندان کی کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا چاہے زندگی بھر کنوارہ ہی کیوں نہ رہنا پڑے

کیونکہ کسی میٹرک پاس سے میری ذہنی مطابقت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی اور لڑکی بھی وہ جو پشاور سے آگے صرف چارسدہ اور نوشہرہ تک گئی ہو۔ وہ میرے پر لگے وجود کا ساتھ کہاں تک دے پائے گی...... لیکن مومنہ...... اس نے میرے سارے تجربات غلط ثابت کر دیے۔ میں جان گیا کہ ذہنی مطابقت کے لیے تعلیمی سطح کا یکساں ہونا ضروری نہیں اور وہ لڑکی جو میٹرک تو کیا پانچ جماعتیں بھی نہ پڑھی ہوئی تھی...... جو اس بیضوی وادی کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں سے باہر کی دنیا کو بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ لڑکی میری سب سے قریبی ہستی بن گئی۔ میں اسے اپنی روح کے اندر محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے ذہن میں روشن دیکھنے لگا اور دل کے اندر دھڑکتا سننے لگا...... پھر...... پھر کیسے میں اسے کھو دیتا۔ مجھے اسے پانا ہی تھا چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ کھونا پڑتا یہ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا لیکن شکر ہے کہ مجھے کچھ کھونا نہیں پڑا۔

اسے اس حویلی میں لانے کے لیے کچھ مشکلات تو پیش آئیں لیکن بہت جلد سب کچھ صحیح ہو گیا۔ اگر میں نے کچھ کھویا تو محض اپنی آزادی۔ باچا جان نے میری خواہش کے بدلے میری آزادی طلب کی تھی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں بہت بڑی قیمت چکا رہا ہوں۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، کاش باچا جان آپ نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ یہ صحرا نوردی تو یوں بھی ختم ہونا ہی تھی۔ مہینوں بعد جب بھی گھر لوٹتا تھا تو باچا جان کے سینے سے لگ کے ٹھنڈک سی اتر جاتی تھی وجود میں، بی بی جان کے ممتا سے بھیگے بوسے پرسکون کر دیتے تھے لیکن کچھ ایسا نہ تھا جو مجھے رکنے پہ مجبور کرتا۔ چند ہی دنوں بعد میں پھر سے نئے سفر پہ جانے کے لیے کمر کس لیتا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ پاؤں میں بیڑیاں کیسے ڈلتی ہیں۔

میرا سب کچھ تو یہاں ہے اس حویلی میں پھر سمندر پار کیا کھوجنے جاؤں گا۔ شاید وہی تھی جس کی تلاش نے مجھے دنیا کھنگالنے پر اکسایا اور ہاں اک اور تحفہ، مقدس اس کے آنے کے بعد تو اب کاروبار میں بھی دل نہیں لگتا، پہلے ہی خاصی مشکل سے دل و دماغ چھڑا کے گھر سے نکلنا کس قدر دشوار لگتا ہے۔ پھر بھی...... نکلنا تو پڑے گا۔ سیاست میں بری طرح مشغول ہو جانے کے باعث لالہ کا رجحان کاروبار کی طرف کم ہی ہو گیا تھا اور میرے دلچسپی لینے کے بعد تو ان کا عمل دخل بس برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ باچا جان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہنے لگا ہے، جاپان جانا بھی ضروری ہے ورنہ ایک بڑی ڈیل ہونے سے رہ جائے گی۔ مومنہ کو شادی کے بعد پہلی بار تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں میری سوچ کے برعکس وہ خاصی پرہمت نظر آ رہی ہے اور مسلسل مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلا رہی ہے کل ہی میری فلائیٹ ہے اسلام آباد کی وہاں سے میں تقریباً بیس روز کے لیے جاپان روانہ ہو جاؤں گا۔"

ڈائری ختم ہو چکی تھی اور مقدس بری طرح الجھ گئی۔ ڈائری اٹھانے سے قبل اس نے اچھی طرح یہ تسلی کرائی تھی کہ یہ وہاں موجود ڈائریوں میں سے آخری لکھی گئی ڈائری تھی۔

"تو کیا ان کے جاپان جانے کے بعد کچھ ہوا تھا۔ کیا واقعی، وہ سب ہوا تھا جو بی بی جان اور چچی جان کہتی ہیں کہ مما نے بابا کی عدم موجودگی میں کسی اور سے...... نہیں نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈائری پڑھنے سے قبل میں نے بھی یہ فرض کر رکھا تھا کہ واقعی میری مما غیر ملکی اور غیر مسلم ہونے کی وجہ سے آزاد روش رکھتی ہوں گی۔ حویلی کی رسموں کو انہوں نے قبول نہیں کیا ہو گا اور اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ چن لیا ہو گا اور اسی بات پہ دل برداشتہ ہو کر بابا جان یہ ملک چھوڑ کے چلے گئے ہوں گے لیکن...... یہ ڈائری تو کوئی اور کہانی سناتی ہے۔

میری ممانہ تو غیر مسلم ہیں اور نہ ہی غیر ملکی...... نہ یہودی نہ عیسائی، نہ ہی جرمن نہ فرنچ ان کا ''مومنہ'' ہونا ہی تو بابا جان کو چونکا گیا تھا اور انہوں نے ہر ہر صفحے پر ان کی پاکیزگی کا عقیدت بھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔ اب تو میں مر کے بھی یہ تصور نہیں کر سکتی کہ وہ کبھی بابا کو دھوکا بھی دے سکتی ہیں۔..... پھر...... پھر کیا وجہ تھی...... کیا ہوا تھا ان کی غیر موجودگی میں...... کیوں نہیں وہ واپس لوٹے......؟

یہ وہ سوال تھے جواب بھی باقی تھے اور ایک سوال یہ بھی۔

''کیا میری یاد نے بھی انہیں واپس لوٹنے پہ مجبور نہیں کیا؟'' اسے ان آخری صفحات سے ڈیڑھ ماہ پہلے لکھی وہ تحریر یاد آنے لگی جو اس کے بابا جان نے اس کی پیدائش کے صرف چھ گھنٹے بعد لکھی تھی اس نے ایک بار پھر صفحے پلٹے۔

۵ ستمبر ۱۹۸۱ء

میں اتنا مطمئن تھا مومنہ کے ساتھ کہ مجھے کوئی کمی کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی اور اب ایک ننھی سی پری نے آ کے یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی تو ابھی ادھوری تھی۔ ابھی اک رنگ باقی تھا...... اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ رنگ اتنا شوخ ہوگا۔ زندگی سے اتنا بھرپور...... جب اس نے پہلی بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کے مجھے دیکھا...... پہلی بار میرے ہاتھوں نے اس کا مخمل سا ننھا چہرہ چھوا، پہلی بار جب وہ منے منے گلابی ہونٹ بسور کر روئی۔ اور پہلی بار جب میں نے اسے سینے سے لگایا۔ میری گود میں آتے ہی وہ چپ کر گئی جیسے روئی ہی صرف میری گود میں آنے کے لیے تھی۔

''دیکھو مومنہ، دیکھو اس کا چہرہ...... بالکل تمہارے جیسے ہونٹ، وہی ناک، وہی رخسار، وہی پیشانی، وہی آنکھیں۔''

''نہیں، اس کی آنکھوں کا رنگ میرا نہیں ہے۔''

اس کے کہنے پہ میں نے ذرا سا گدگدا کے اسے دوبارہ آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔

''ارے ہاں واقعی۔'' اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا۔ وہ شاید اس طرح کسمسائے جانے پہ برا مان گئی تھی۔ پھر سے مٹھیاں بھینچ کے رونے لگی۔

''دیکھو، مومنہ! تمہاری طرح اس کے بھی رونے پر آنسو نہیں نکلتے، صرف آنکھوں کا رنگ یہ بتاتا ہے کہ وہ رو رہی ہے۔ تم بھی جب روتی ہو تو شہد کے قطروں کے گرد جیسے کوئی روح افزا گر جاتا ہے۔'' میری مثال پہ وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

''اور یہ جب روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔'' اس کی گیلی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا تھا۔

مقدس نے اپنی پلکوں کو انگلی کی پور سے چھوا، وہ نم تھیں۔

''بابا جان دیکھیے آج بھی میرے آنسو آنکھوں میں ہی تڑپتے پھرتے ہیں۔''

☆☆☆

وہ دیوار سے سر ٹیکے اکڑوں بیٹھا تھا جب ہڑبڑا کے رہ گیا۔ اس نے چونک کے چاروں طرف دیکھا اور پھر سے رات کے سناٹے میں اس آواز کو کھوجنے کی کوشش کی مگر بے سود...... وہ بے چین ہو کے ٹہلنے لگا۔

''کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ لیکن خواب دیکھنے کے لیے سونا بھی تو پڑتا ہے۔ میں کب سویا ہوں جو خواب دیکھا ہو...... پھر وہ آواز

یادوں کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں سے

دل اگر سوکھ بھی جائے تو بنجر نہیں ہوتا

''یہ کس دراڑ سے اس کی یاد پھوٹ پڑی۔ میں نے تو دل کب کا پتھر کرلیا تھا۔'' وہ سینہ مسلنے لگا جہاں دو نیلی کانچ سی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

''اور جب یہ روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔'' کسی نے سرگوشی کی اور تاریکی میں دو روتی بسورتی آنکھیں ہزاروں شکوے لیے اُبھر آئیں۔ نیلم کے شفاف ٹکڑے آنسوؤں سے نم ہو کے چمک رہے تھے پلکوں پہ ٹھہرے آنسو ہیروں کی طرح جگر جگر کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اچانک ان کے عقب سے دو اور آنکھوں نے جھانکا اور......

''تمہاری آنکھوں کا رنگ بتاتا ہے کہ تم رو رہی تھیں۔'' کسی نے ان بھوری آنکھوں میں پھیلے لال ڈورے دیکھ کے کہا۔ وہ ڈر گیا، خوفزدہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ چہرے پہ چھپا کے چلانے لگا۔

''اسی لیے...... اسی لیے مجھے بری لگتی ہیں یہ یادیں وہ سب بھی یاد دلا دیتی ہیں جنہیں بھلانے میں اتنے سال لگے ہیں۔''

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر

یاد کچھ بھول کے نہیں آتی

☆☆☆

''کہاں جا رہے ہیں آپ اتنی صبح صبح'' خان دراب خٹک کو صبح صبح جانے کی تیاریوں میں مصروف دیکھ کے ان کی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ ظاہر ہے ان کا اتنا سویرے جاگنا اور پھر اتنے اہتمام کے ساتھ باہر نکلنا، خلاف معمول جو تھا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول رہے تو زبیدہ خانم جھنجھلا گئیں۔ جیسے ہی وہ گن لوڈ کر کے پلٹے تو بیگم کو راستے میں پھر موجود پایا۔

''اب کیا ہے؟'' وہ اپنے خصوص اکھڑ لہجے میں بولے۔

''شکار پہ آپ نہ تو اکیلے جاتے ہیں نہ ہی اتنی رازداری کے ساتھ پھر......؟''

''بڑے لالہ کے پاس جا رہا ہوں۔ اسلام آباد۔ انہوں نے کسی کام سے بھیجنا ہے مجھے۔''

''انہیں آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ آپ ان کا کیا کام کر سکتے ہیں بھلا اور پھر نہ ڈرائیور نہ گارڈ...... یوں فجر سے بھی پہلے روانگی کا کیا مطلب ہے؟'' ان کی کسی طور تسلی نہ ہوتے دیکھ کے دراب زچ ہو گئے۔

''گارڈ کے ساتھ نکلا تو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ اکیلے زیادہ رازداری کے ساتھ پہنچوں گا۔ بڑے لالہ کی خاص ہدایات ہیں کہ ملازمین تک کو علم نہ ہو، میرے گھر سے نکلنے کا۔ خود وہ بھی سارا دن آفس میں مصروف رہیں گے تاکہ سب کو یہ تاثر ملے کہ ہم دونوں بھائی سارا دن اپنے اپنے کام میں مصروف رہے ہیں اور زریاب لالہ کو......''

''یہاں ہیں زریاب لالہ؟ کب آئے وہ؟'' زبیدہ بے تابی سے اور آگے بڑھیں۔

''آہستہ زبیدہ آہستہ۔'' وہ ڈپٹ کر بولے۔

''ابھی نہیں آئے وہ، کل آنا ہے انہیں لیکن بڑے لالہ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے انہیں آج ہی لانے کا انتظام کر لیا ہے۔ کل دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں گے بلکہ وہ تو کئی روز سے چوکنے ہیں اس لیے آج بھی انہیں لانے کے لیے اتنی رازداری اور احتیاط برتی جا رہی ہے۔''

''ہائے اللہ'' وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئیں۔

''اب کیا ہو گیا؟''

''کچھ نہیں ایک بار لالہ خیریت کے ساتھ حویلی پہنچ جائیں۔ پھر کس کی جرات ہے جو انہیں نقصان پہنچا سکے۔ آگے کے لیے بھی بڑے لالہ نے کافی کچھ سوچ رکھا ہے وہ انہیں دشمنوں کی پہنچ سے دور، بہت دور پہنچا دیں گے۔ یہاں تو وہ صرف انہیں باچا جان کی تسلی کے لیے لا رہے ہیں۔''

''اور آپ...... آپ اکیلے اتنے خطرناک کام......''

''کوئی خطرناک کام نہیں، یہ فرض ہے میرا۔ صرف احتیاط سے کام لے رہے ہیں ہم لوگ۔ ورنہ ایسی بات نہیں کہ خٹک خاندان اب چوڑیاں پہن کے بیٹھ جائے۔ میرا بھائی آ رہا ہے اور میں اسے بحفاظت گھر لانے کے بجائے اپنے بچاؤ کے طریقے سوچنے بیٹھ جاؤں۔ تف ہے تم عورتوں کی بزدلی پر اور خبردار......'' وہ پھر پلٹے۔ ''خبردار ابھی گھر کے کسی فرد کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے۔''

☆☆☆

''کیا کہا؟ پھر سے کہنا......'' شناور چونک کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میری مما! جیسا کہ تم لوگوں کی قیاس آرائیاں ہیں، انگلش یا جرمن نہیں، کالاش کی رہنے والی ہیں۔ وہ اس خاندان کا حصہ نہیں لیکن اسی وطن کے ایک خوب صورت پہاڑی خطے کی رہنے والی ہیں اور وہ مسلمان بھی ہیں، پیدائشی مسلمان...... مومنہ علی...... مومنہ زریاب خٹک۔''

اس نے دوبارہ زیادہ تفصیل سے بتایا۔ شناور کھوئی کھوئی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ مقدس کے لیے اس کا ردعمل حیرت انگیز تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ ڈائری سے اس کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا اب وہ ہنس ہنس کے بتانے لگی۔

''بے حد اضافہ ہوا میری معلومات میں دیر اور چترال میں مچھلی کا شکار کرنا اور جھیلوں میں نہانا منع ہے۔ سوات کا رقبہ ۸۷۸۸ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ چترال سے ایوان کے رستے کالام میں داخل ہوا جاتا ہے۔ وادی بمبوریت پر داخلہ ٹیکس پندرہ روپے ہے اور......''

''ہیں...... ہیں...... یہ کیا اول فول بک رہی ہو'' وہ مشتبہ نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

''اور سنو ناں...... وہاں کی اپنی زبان میں بمبوریت کو مرمریت، برواور بری لا کہتے ہیں اور وہ جوان کا روایتی لباس ہوتا ہے ناں عورتوں کا کرتے کو 'پوش' کمر کی پٹی کو 'مشوشت' اور ٹوپی کو 'کوپی' کہتے ہیں۔ اور......''

''اسٹاپ اٹ مقدس تم نہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ۔ لیکن یہ کافرستان کا سفرنامہ تو مت سناؤ'' وہ باقاعدہ ناراض ہوگئی۔

''جو پڑھا ہے وہی سنا رہی ہوں۔ ڈیئر، میری مما بابا جان کو انہی پہاڑوں میں ملی تھیں۔'' مقدس نے مختصراً تمام کہانی اسے سنا ڈالی۔

''مومنہ علی...... مومنہ زریاب...... مومنہ......'' شناور بے یقینی سے بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر سر جھٹک کے کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مقدس حیرت سے اس کا اضطراب نوٹ کر رہی تھی۔ شناور کے چہرے پہ فیصلہ کن تاثرات پیدا ہوئے اور وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

''سنو مقدس! میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہاری مما کو جانتی ہوں۔''

''کیا......؟'' وہ فرط حیرت سے اچھلنے کو تھی کہ شناور نے اس کے ہاتھ تھام کے پھر سے بٹھایا۔

''آرام سے بیٹھ کے سنو۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے ہاسپٹل میں ایک ملازمہ...... میرا مطلب ہے ایک عورت ہے جس کی شکل و صورت تم سے حد درجہ مشابہ ہے۔ تمہاری آنکھوں کی ساخت، چہرے کی بناوٹ، بالوں کی رنگت، ایک ایک نقش حتیٰ کہ آواز اور مسکراہٹ بھی بالکل ایک جیسی ہے۔ میری اس بات کو اس وقت تم نے مذاق میں اڑا دیا تھا خود میں بھی اسے زیادہ سیریسلی نہیں لے رہی تھی اس لیے بھول بھال گئی۔ اب تم نے جو بات بتائی ہے تو رہ رہ کے وہی چہرہ میری نگاہوں میں آ رہا ہے وہی شہد رنگت آنکھیں، سرو قد، وہی رخسار اور ٹھوڑی پہ گودے تل اور نام، ان کا نام بھی مومنہ ہی ہے۔ ہم سب انہیں اماں مومنہ کہتے ہیں۔''

''کیا واقعی؟ پھر تو وہ...... کیا پتا وہی......'' اس کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے۔

''ہاں شاید وہی...... اور شاید وہ نہ ہوں۔ تم ہر بات کے لیے خود کو تیار رکھو۔'' شناور نے اس کے کپکپاتے وجود کو سہلایا۔

''میں اسی لیے یہ بات تمہیں بتانے میں ہچکچا رہی تھی۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ وہ کیلاش کی ہیں یا نہیں لیکن پٹھان ہیں یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ رواں اور شستہ اردو بولنے کے باوجود کہیں کہیں پشتو لب ولہجہ جھلک مار جاتا ہے اور پھر ان کی شکل وصورت، سب انہیں پٹھان ہی ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً چہرے پہ گودے تل جو عموماً سرحد کی پہاڑی دوشیزاؤں کی نشانی ہیں۔ اسی لیے تمہارے ذکر کرتے ہی میرے تصور میں فوراً ان کا ہی چہرہ آیا۔ لیکن پتا نہیں میں نے تمہیں بتا کے صحیح کیا یا غلط۔ میرا مطلب ہے ابھی یہ بات کنفرم تو نہیں ہے ناں یہ نام ایک شخصیت کا تو نہیں ہو سکتا۔''

''نہیں شانو نہیں۔ تم ان کا ذکر کرتی ہو تو میرا دل تمہارے اک اک لفظ پہ ایمان لانے کو چاہتا ہے۔ یہ دل کہتا ہے شانو کہ وہی مما ہیں وہی میری مما ہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''مگر وہ نشان...... میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ان کے چہرے پہ جلنے کے نشان ہیں۔ ایک طرف کا رخسار اور آنکھ کا نچلا حصہ پورا جلا ہوا ہے۔''

''جو بھی ہو...... میں جلد از جلد ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ لاہور چلنے کی تیاری کرو۔''

''ابھی...... اسی وقت...... مگر کیسے؟'' شنا ور بولی۔

''ابھی کل ہی دراب ماموں نے پوچھا تھا کہ وہ کب ہماری واپس کی ٹکٹیں بنوائیں تو میں نے انہیں اگلے ہفتے کسی بھی دن کی ٹکٹیں بک کروانے کے لیے کہا تھا۔ ابھی تقریباً بارہ چھٹیاں باقی ہیں۔''

''لیکن میں ایک ہفتہ نہیں رک سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل ضرور لاہور جانا ہے۔''

''اتنی جلدی ٹکٹیں کیسے ملیں گی محترمہ۔''

''بائی روڈ چلے جائیں گے۔'' وہ مصر تھی۔

''بائی روڈ؟ پورے آٹھ گھنٹے کا سفر۔ نا بابا نا۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''پلیز شانو...... پلیز...... تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔'' وہ منتوں پر اتر آئی۔

''میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں، مقدس لیکن تم خود سوچو محض میرے ہامی بھر لینے سے تم لاہور تو نہیں پہنچ جاؤں گی۔ بی بی جان کبھی ہمیں بائی روڈ اکیلے جانے کی اجازت نہیں دیں گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم اپنے ہنگامی فیصلے کا ریزن کیا دیں گے۔''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ کم از کم تم ایک کوشش تو کر سکتی ہو۔ ویسے بھی بی بی جان تمہاری ہر بات مان لیتی ہیں۔ تم ان سے بات کر کے تو دیکھو۔ کوئی بھی بہانہ بنا لو پلیز۔''

''اچھا بابا!'' اس کے مسلسل اصرار پر وہ ہار مان کے بی بی جان کے پاس چلی آئی۔

''بی بی جان اور کیا وجہ ہوتی ہے در اصل میں نے اور میری دوسری فرینڈز نے جس ایگزبیشن میرا مطلب ہے تصویری مقابلے میں حصہ لینا تھا اس کی ڈیٹ یعنی تاریخ مقرر ہو گئی ہے اور ابھی ابھی شائستہ کا فون آیا تھا مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے تا کہ اپنا نام لکھوا سکوں ورنہ پھر میں اس

مقابلے میں شامل ہونے سے رہ جاؤں گی۔ آپ پلیز ہمیں ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیجئے۔ میرا مطلب ہے مقدس بھی میرے ساتھ ہی چلی جائے اس کی بھی چھٹیاں باقی ہیں لیکن مجھ سے اکیلے سفر نہیں کٹے گا۔''

وہ جانتی تھی اس کا بہانا ایک دم بوگس اور فضول ہے پھر بھی وہ بڑے دھڑلے سے بول گئی کہ مقابل بی بی جان تھیں جنہیں اس کے کالج کا پتا معلوم تھا نہ تعلیم کی خبر۔

انہیں کیا علم کہ ایسے مقابلے یوں ہی منعقد نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکول میں ہونے والے ٹیبلو پروگراموں کی طرح ان میں لائن میں لگ کے نام لکھوانا پڑتا ہے پھر بھی وہ پر یقین نہیں تھی کہ بی بی جان بھلے اس کی بات کا اعتبار کر لیں لیکن ضروری نہیں کہ اکیلے جانے کی اجازت بھی دے دیں۔ اور اس وقت وہ حیران رہ گئی جب بی بی جان نے بغیر کسی سوال کے کہہ دیا۔

''تم تیاری کرو۔ اگر ہو سکے تو نو بجے تک ڈرائیور کے ساتھ نکل جاؤ شام تک پہنچ جاؤ گی ورنہ تیاری میں دیر ہونے کی صورت میں کل صبح سفر کرنا۔ میں نہیں چاہتی تم دوپہر کو نکلو اور رات گئے ہاسٹل پہنچو۔''

''تھینک یو بی بی جان! ابھی نو بجنے میں پورا سوا گھنٹہ ہے۔ ہم تقریباً تیار ہی ہیں۔ آپ ڈرائیور کو کہلوا دیجئے۔'' وہ بھاگتی ہوئی مقدس کو خبر سنانے کمرے سے نکلی اور بی بی جان نے سینے میں کب سے رکا سانس خارج کیا۔

''اچھا ہوا مقدس کے یہاں سے جانے کا سبب بن گیا۔ ورنہ زریاب کے یہاں آتے ہی پھر سے..... اچھا ہی ہوا جو آتے ہی اسے یہ صورت دیکھنے کو نہ ملے گی ورنہ.....''

☆☆☆

''لالہ.....'' دراب نے بے تابی سے آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگالیا۔

''دراب تم؟'' وہ حیران تھا۔ اس قید تنہائی میں کسی اپنے کی موجودگی؟

اذیت و کرب کے تھپڑے سہتے وجود کو کسی کی مہربان بانہوں کا سہارا۔

اس نے حیرت سے خود کو اس کی بانہوں کی گرم جوش پناہ میں محسوس کیا۔

''تم یہاں کیسے؟''

''آپ کو لینے آیا ہوں لالہ.....''

''مجھے لینے؟ کیا اتنا وقت بیت گیا۔'' وہ حیران تھا کہاں تو سرپٹخ پٹخ کے بھی ایک رات نہ گزرتی تھی۔ کانٹوں پہ چل چل کے ایک ایک پہر بتایا تھا اور اب یہ کہہ رہا ہے..... کہ بیس سال گزر گئے۔

''چلیں..... لالہ، گھر چلیں۔'' اس نے بھائی کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنا چاہا۔

''گھر؟ چلو۔'' وہ یوں بولا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ ہو۔

وہ بن ہو کے صحرا، دیوانے کو کیا مطلب

زنجیر کھلی ہو تو پھر خاک اڑانا ہے

اور خان زریاب خٹک برسوں بعد گندی بوسیدہ دیواروں، پیر زخمی کرتی بیڑیوں اور سنگلاخ پتھروں والی زمین کی سنگت چھوڑ کے آزاد فضا میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

''سینٹرل جیل پشاور'' کی تمام تر اذیتیں، تنہائیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے کی آزاد دنیا میں اس کے لیے اور بھی کچھ تھا...... کچھ اور امتحان...... کچھ اور اذیتیں......

☆☆☆

عمراں لنگیاں پباں پار

ہالے نہ وس او کالیا

عمراں لنگیاں پباں پار

''یہاں بھی ڈھنگ کا کوئی گانا نہیں لگ رہا۔''

وہ پوری طرح سے اسد امانت علی خان کی پرسوز آواز میں کھوئی ہوئی تھی جب شاور نے ایف ایم ون ہنڈرڈ بھی آف کر دیا۔

''کسی ایک جگہ تو ٹک جاؤ۔'' مقدس کو اس طرح اس کی مداخلت پہ اچھی خاصی کوفت ہوئی۔

''میرا بالکل دل نہیں لگ رہا ان اجاڑ سنسان سڑکوں پہ تم بھی منہ لپیٹے بیٹھی ہو۔ پیکنگ بھی اس قدر افراتفری میں کی کہ کیسٹس بھی لانا بھول گئی۔ اُف کس طرح کٹے گا...... یہ سفر، ابھی پورے ساڑھے چار گھنٹے باقی ہیں۔'' اس نے باقاعدہ واویلا مچا دیا۔

''تو کوئی رسالہ ہی پڑھ مرلو۔'' اس نے سائیڈ پہ رکھے بیگ میں اسے اکٹھے دو تین ڈائجسٹ نکال کے اس پہ پھینکے۔

''یا پھر کچھ دیر سونے کی کوشش کرو میرا دماغ مت چاٹو۔'' وہ اس وقت واقعی بے حد اُلجھی ہوئی تھی، اسی لیے اس لہجے میں اس سے بات کر گئی، ورنہ شاور کی طبیعت کا بے صبراپن اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بھی مقدس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر چپ کر گئی لیکن نچلا بیٹھنا اس کی فطرت میں بھی کہاں تھا۔ چند منٹ منہ پھلا کے بیٹھنے کے بعد وہ ڈرائیور سے الجھنے لگی۔

''یہ کیا ہے ماما! اس قدر بکواس کیسٹ رکھے ہوئے ہیں تم نے، نام بھی اتنے ہولناک ہیں۔ ''پختو پہ زہ گستم'' اور یہ کیا ہے ''شرنک دا بنگڑو'' مائی گاڈ کیا تصویر بنی ہے اس کے کور پہ نام ہے ''خونخرے''۔

''وہ دو مجھے، سر ہلو پٹہ۔''

''واللہ کیا ظالم ظالم گانا ہے اس میں۔'' اس نے سر دھنتے ہوئے کیسٹ طلب کیا۔

''رہنے دو ماما! ہمیں نہیں یہ ظلم سہنا۔ اگر پشتو گانا سننا ہی ہیں تو بندہ رحیم شاہ یا پھر سردار تلگر کو سنے کیوں مقدس؟'' اسے آنکھیں موندے

دیکھ کر وہ مایوس سی ہوئی۔ ''اب کس سے سر پھوڑوں۔'' ایک آدھ سیکنڈ ہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر آگے کی طرف جھکی۔

''اس سے تو اچھا ہے ایف ایم ون ہنڈرڈ ہی لگا لوں۔ غزلیں اور کافیاں ہی سہی۔''

گاڑی میں پھر سے وہی پر درد لے مدھم مدھم سی اُبھرنے لگی۔

کدھے نہ سکھ سنیہا گھلیا

کدے نہ

ہائے کدے نہ

''خانہ خراب''ایک جھٹکے سے گاڑی کے رُکنے پہ اورنگزیب ماما جھنجھلایا ہوا سا باہر نکلا۔

''کیا ہوا؟'' وہ دونوں بھی متفکر ہو گئیں۔

''ٹائر پنکچر ہو گیا ہے بی بی!'' وہ چیک کرنے کے بعد پیچھے کی طرف مڑا۔

''چلو، کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ لگیں گے ٹائر چینج ہونے میں۔'' ان دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔

''اوئے خانہ خراب کا بچہ۔ کس چرسی کی اولاد پھر دغا دے گیا۔''

''اب کیا ہوا؟'' وہ دونوں بیک وقت شیشے نیچے کر کے باہر سر نکالتے ہوئے چلائیں۔

''وہ خبیث رمضانی نہیں ہے، اس کو میں بولا بھی تھا گاڑی چیک کرنے کے واسطے، یہ چیک کیا ہے اس خانہ خراب نے؟ پھالتو (فالتو) ٹائر مائر بھی نہیں رکھی۔''

''تمہاری تو پرانی عادت ہے ماما۔ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنے کی، کار تمہیں ڈرائیو کرنی تھی، تمہیں خود سب انتظام کرنا چاہیے تھا۔ وہ چرسی ہے تو تمہارا نسوار کا ناغہ کب ہوا ہے؟'' شناور کے ڈپٹنے پہ وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

''ظالم ظالم گانوں والے یہ الم غلم کیسٹ بھرنے یاد تھے، ایک اسپیئر ٹائر نہیں رکھ سکتے تھے۔''

''اب بس بھی کرو۔ یوں سر راہ چلانے سے کچھ ہو جائے گا کیا؟''

مقدس نے ناگواری سے اسے دیکھا جو کمر پہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ جما کے بازو نچاتے ہوئے اورنگزیب کی خبر لے رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتی گاڑیاں کچھ دیر کے لیے آہستہ ہو جاتی تھیں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ مقدس کو بھی فکر تو ضرور تھی لیکن اس طرح سڑک پہ تماشا بن جانے کا خوف زیادہ تھا۔ وہ پھر سے آوازیں دے کے اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے بلانے لگی۔ ایک سلور گرے کرولا کی اسپیڈ بھی سلو ہو گئی ان کے پاس آتے ہی مگر دوسرے لوگوں کی طرح گردن باہر نکال کے محض صورتِ حال کا جائزہ لے کر گاڑی آگے بڑھا لے جانے کے بجائے اس شخص نے ان سے ذرا آگے سائیڈ پہ کار پارک کی اور خود ان کی طرف بڑھ آیا۔

''اینی پرابلم؟'' بے حد شائستہ انداز میں اس نے شناور سے پوچھا۔ جو غصے سے تمتمایا چہرہ لیے مسلسل ڈرائیور کو گھور رہی تھی۔ غصے کی زیادتی

نے اسے ڈھنگ سے اس اجنبی کی بات کا جواب بھی نہیں دینے دیا۔ وہ محض بڑبڑا کے رہ گئی۔

''وہ ٹائر پنکچر ہوگیا ہے صیب اور پھالتو ٹائر بھی نہیں۔'' اورنگزیب منمنایا۔

''اوہ آپ پریشان مت ہوں مس۔ اپنی سیٹ پہ آرام سے بیٹھیے جاکر، میں ٹائر دے دیتا ہوں آپ کے ڈرائیور کو۔'' وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے پیچھے باچھیں پھیلاتا ہوا اورنگزیب بھی لپکا۔

''ماما ایک منٹ'' مقدس نے پرس میں سے کچھ روپے نکالے۔ ''شناور یہ ماما کو پکڑا دو۔ ٹائر کی قیمت ادا کر کے پھر لیں۔''

''ایکسکیوزمی مس! یہ آپ نے بھجوائے ہیں؟'' وہ نوٹ لہراتا پھر شناور کے سر پہ موجود تھا۔ ''میں ٹائروں کی خرید وفروخت کا کام بالکل بھی نہیں کرتا۔ بائی پروفیشن، میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اگر آپ کو ٹائر خریدنا ہی ہے تو میں آپ کے ڈرائیور کو چند میل آگے سروس اسٹیشن پر ڈراپ کر دیتا ہوں لیکن...... یہ سوچئے کہ آپ کا یوں تنہا اس کے انتظار میں کھڑے ہونا مناسب ہوگا؟ یہی بہت ہے آپ یہ ٹائر لے لیں پلیز۔''

''دیکھیے ہم لوگ اس وقت آپ کی مدد لینے پر مجبور ہیں، لیکن پھر بھی......بغیر قیمت ادا کیے یہ ٹائر لینا بھی ہمیں گوارا نہیں۔'' مقدس باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کے وہ یوں چونکا جیسے گاڑی میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

''اس طرح آپ کا یہ عمل مدد نہیں احسان کہلائے گا اور کسی کا احسان لینا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔''

اس کے مضبوط لہجے اور پراعتماد انداز سے محظوظ ہو کے وہ مسکرایا۔

''اور خواتین کی مدد کرنے کا معاوضہ وصول کرنا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔ بہرحال آپ کے اُصول بھی مقدم ہیں ہمیں۔ آپ یوں کیجیے یہ میرا کارڈ رکھ لیں اور جب آپ کا مسئلہ حل ہوجائے میرا ٹائر مجھ واپس لوٹا دیجیے گا۔ شکریے کے ساتھ۔'' وہ اس کی نیلی آنکھوں کی الجھن محسوس کر کے مسکرایا۔

''اوئے خانہ خراب۔'' اورنگزیب نے پھر دہائی دی۔ ''یہ تو دو ٹائر پنکچر پڑے ہیں۔''

''اوہ نو!'' ان تینوں کے منہ سے افسوس بھرے انداز میں ادا ہوا۔ مقدس تو مایوس سی ہو کر دوبارہ سے گاڑی میں بیٹھ گئی، جب کہ شناور ذرا آگے ہو کے گزرتی گاڑیوں کو اُمید بھرے انداز میں دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مزید ایک ٹائر دینے کے لیے رک جائے۔''

''بی بی۔'' اورنگزیب تیزی سے اس کی طرف آیا۔

''مجھے تو تم اپنی شکل ہی نہ دکھاؤ ماما۔'' اس کے دھاڑنے پہ وہ سہم کر مقدس کی طرف بڑھا۔

''بی بی تم ہی سن لو ہمارا بات۔''

''ہاں بولو۔'' موڈ تو اس کا بھی خاصا خراب تھا لیکن سننے لگی کہ اب کیا مژدہ سناتا ہے، ماما اورنگزیب خان، شناور بھی سن گن لینے پاس کھڑی ہوگئی۔

''وہ ڈاکٹار صیب (ڈاکٹر صاحب) کہتا ہے کہ ام تینوں اس کی گاڑی میں بیٹھیں وہ آگے کوئی ہوٹل موٹل ہے وہاں تک چھوڑ دے گا۔ بی بی لوگ آرام سے بیٹھ کے ادر (ادھر) چائے مائے پیئے گا اور ام ٹائر لے کے واپس یہاں آئے گا، ٹائر لگائے گا پھر تم کو ادر لینے آئے گا۔'' اس نے پانچ

نکاتی منصوبہ تفصیل سے دہرایا۔

''چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔'' شناور نے سکون بھری سانس لی۔

''لیکن ہم کیسے کسی اجنبی کے ساتھ چل پڑیں۔'' مقدس کو اعتراض تھا۔

''بی بی کوئی پندرہ منٹ لگیں گے، بس ہوٹل تک جانے میں اور پھر ام ہے ناں تمہارے ساتھ'' اس نے تسلی دی۔

''میرا خیال ہے مقدس یہی بہتر ہے۔ یہاں اکیلے موٹروے پہ کھڑا ہونا بھی تو ناممکن سی بات ہے۔'' اس کے کہنے پہ وہ مزید پس و پیش کرنے کے بجائے اپنا شولڈر بیگ اٹھائے چادر درست کرتی باہر نکل آئی۔

''بی بی تم پھکر (فکر) مت کرو، ڈاکٹر صیب شریف آدمی ہے اور پختو (پشتو) بھی بولتا ہے۔''

وہ پختو بولتا ہے یا نہیں یہ تو پتا نہیں چل سکا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ان دونوں کو کہ ڈاکٹر صیب واقعی شریف بندہ ہے۔ بارہ منٹ کی ڈرائیو میں اس نے بالکل بھی دونوں لڑکیوں کو مخاطب نہ کیا، البتہ کافی شاپ میں اس کی دی گئی کافی اور اسنیکس کی پیش کش شکریے کے ساتھ واپس لوٹا دیے پہ وہ چپ نہ رہ سکا۔

''یہ تو آپ میری مہمان نوازی کو ٹھیس پہنچا رہی ہیں محترمہ!''

''لیجیے خوامخواہ ہی۔ ہم بھلا آپ کے مہمان کیسے ہو گئے۔'' شناور بحث پر اتر آئی۔

''کوئی آپ کے گھر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں۔''

''ضروری نہیں کہ گھر آنے والا ہی مہمان ہو۔ آپ میری گاڑی میں بیٹھ کر یہاں تک آئی ہیں۔ میری نظر میں اس وقت آپ میری معزز مہمان ہیں اور آپ کی تواضع کرنا میرا فرض ہے۔'' اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

''معاف کیجئے گا۔ آپ کی مدد اور تعاون کے لیے ہم واقعی شکرگزار ہیں لیکن یہ ہماری مجبوری تھی ورنہ جس خاندان سے ہمارا تعلق ہے وہاں لڑکیاں اجنبیوں سے تواضع نہیں کرواتی پھرتیں۔'' اب کی بار مقدس اپنے مخصوص سنجیدہ اور دوٹوک انداز میں بولی تو وہ مطمئن ہو کر یوں مسکرایا جیسے اب تک کی بلا مقصد بحث محض اسے بولنے پر اکسانے کی ایک کوشش ہو۔

''بجا فرمایا آپ نے۔ اجنبیوں سے گریز اچھی بچیوں کا شیوہ ہے لیکن......'' وہ لطف لینے لگا مقدس کی برہمی کا۔ ''اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو......''

مقدس سراپا ہل گئی اس کے فقرے پہ، اس نے پہلی بار نظر اُٹھا کے سامنے بیٹھے خوش قامت وخوش لباس شخص کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار پڑھ کر وہ مسکرایا۔

''آپ کے بیگ میں میرا کارڈ موجود ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ کو مجھے اجنبی نہیں کہنا چاہئے۔'' مقدس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اپنے بیگ کی طرف سرک گیا۔ اسے یاد آیا بے دھیانی میں اس نے یہ کارڈ بغیر دیکھے ہی بیگ کے اندر ڈال لیا تھا۔ وہ بھی شاید اس کی بے اعتنائی جان چکا تھا اس لیے اپنا باقاعدہ تعارف کروانے لگا۔

''مجھے ڈاکٹر خوشنود کہتے ہیں۔ ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اعزازی طور پر تعینات ہوں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانے کا ارادہ ہے۔ آج کل اسی کے سلسلے میں کچھ مصروفیات ہیں۔ لاہور میں ایک ذاتی نوعیت کے کام سے جارہا ہوں۔ آپ لوگ بھی شاید لاہور ہی جارہی ہیں۔'' ان کا تعارف لینے کے بجائے اس نے سرسری سا ایک سوال کیا اور اثبات میں جواب ملنے پر خاموشی سے کافی پینے لگا۔ اگرچہ اس نے دوبارہ ان سے اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس طرح اکڑ کر بیٹھے رہنا کم از کم شناور سے گوارا نہیں ہوا اور اس نے بھی اپنا مگ اٹھا لیا۔ مقدس نے ایک نظر سامنے بیٹھے اس نفیس طبع شخص کو دیکھا جو اس وقت گردوپیش سے لاپروا نظر آتا ہوا کافی اور اخبار سے شغل فرمارہا تھا اور جس نے تکلفاً بھی ایک بار اپنے سامنے بیٹھی لڑکیوں کا نام و پتہ نہیں جاننا چاہا تھا۔ اس کے ہاتھ خود بخود اپنے سامنے رکھے بھاپ اڑاتے مگ کی طرف اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اورنگزیب سامنے سے آتا نظر آیا۔

''گاڑی آگیا ہے بی بی! وہ جن بس والوں نے ام کو لفٹ دیا تھا انہوں نے ٹائر بدلنے میں بھی مدد کردیا اسی لیے ام جلدی واپس آگیا۔''

''شکر ہے اللہ کا۔'' دونوں جلدی جلدی اپنے بیگ اور پرس سنبھالنے لگیں۔

''آج زندگی میں پہلی بار میں نے اورنگزیب ماما کی صورت دیکھنے کے بعد شکر کا کلمہ پڑھا ہے۔'' شناور اس کے کان میں گھس کر بولی تو باوجود اس قدر تناؤ کے بھی وہ مسکرادی۔ خوشنود نے دلچسپی سے سرمئی گرم شال کے ہالے میں لپٹے اس صبیح چہرے پہ پھوٹتی مسکراہٹ کی کرن دیکھی۔

''چہئے اُس کے؟'' (چائے پیو گے) اس کی آفر پہ اورنگزیب تو پھیل کے بیٹھ جانا چاہتا تھا لیکن شناور کی گھوریوں سے گھبرا کے نفی میں سر ہلاتا ہوا بیگ اٹھانے لگا۔ خوشنود ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں اسے ہاتھ میں ڈسپوزایبل کپ پکڑے اس طرف آتے دیکھا۔ اس نے زبردستی اورنگزیب کو چائے پکڑائی۔ شناور کے دوبارہ شکریہ ادا کرنے پہ بھی مقدس چاہنے کے باوجود اسے تھینک یو تک نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

''کون؟ وہ پٹھانی؟'' ان کے پوچھنے پہ ہاسٹل وارڈن نے سوال کیا۔

''جی میڈم وہی، کیا آپ بتاسکیں گی، اس وقت وہ کہاں ملیں گی؟''

''تم لوگوں کو اس سے کیا کام ہے؟'' انہوں نے الٹا تفتیش شروع کردی۔

''کتنی بار تم لڑکیوں کو تاکید کی ہے اسٹاف کے ساتھ اس قسم کی عنایتیں وغیرہ مت کیا کرو۔ یقیناً تم نے اسے کچھ رقم اُدھار دی ہوگی اور اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں لگ رہی۔''

''نو میڈم ایسی بات نہیں۔ ان سے کچھ اور کام تھا مجھے۔'' شناور ان کی مسلسل حجت پہ زچ ہوگئی۔

''آپ پلیز انہیں بلوادیں یا مجھے بتادیں وہ اس وقت کہاں ہوں گی۔''

''وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے غیر حاضر ہے۔ پرسوں اطلاع ملی تھی کہ کچھ بیمار وغیرہ ہے، شاید کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ مجھے کچھ صحیح علم نہیں ہے۔'' وہ گول مول جواب دے کے ٹیلی فون پہ کوئی نمبر پش کرنے لگیں۔

''کون سے ہاسپٹل میں؟ کیا ہوا ہے انہیں؟'' مقدس جواب ایک خاموشی سے کھڑی دونوں کے چہرے باری باری تک رہی تھی، بے صبری سے کہہ اُٹھی۔ وارڈن نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھ کے بولیں۔

''میں نے کہا ناں، مجھے علم نہیں۔ تمام ملازمین کی مزاج پرسی اور عیادت میری ڈیوٹی میں شامل نہیں...... ہاں عرفانہ...... کیسی ہیں آپ، ایک کام کہا تھا آپ سے......'' وہ رخ موڑ کے مکمل طور پر فون پر متوجہ ہو گئیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ کسی اور سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں۔ شناور نے شانے اُچکا کے خود پہ ضبط کرتی مقدس کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' وارڈن کی آواز پہ وہ چونک کر مڑیں۔ ''اماں برکتے...... یہاں آنا...... ذرا ان لڑکیوں کے ساتھ باہر جا کر بات کر لو اور ہاں شناور یہ اماں اس پٹھانی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اس سے پوچھ لو جو بھی پوچھنا ہے۔'' بڑی عجلت میں انہوں نے ریسیور کان سے لگائے ہوئے، معاملہ بھگتایا۔

''کی گل اے کڑیے۔'' اماں برکتے شناور کو جانتی تھیں اس لیے براہ راست اس سے سوال کیا۔ وہ تینوں اس وقت خنک اور قدرے تاریک کوریڈور سے گزر کر بیرونی دروازے کے ساتھ بنے احاطے میں کھڑی تھیں۔ چمک دار دھوپ نے ایک دم سے سامنے آ کر آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔

''اماں وہ جو کچن میں ایک خوبصورت سی گوری چٹی اماں ہوتی ہیں، اماں مومنہ، وہ کہاں ملیں گی اس وقت؟''

''کیوں؟ تمہیں کیا کام ہے؟'' اُف پھر وہی سوال۔

''کام ہے تو پوچھ رہے ہیں ناں۔''

''اوہ تاں بیمار اے......(وہ تو بیمار ہے)

''کیا ہوا ہے انہیں؟'' مقدس کو اس ان دیکھی عورت کی بیماری بے چین کر رہی تھی۔

''ایہہ......'' (یہ......؟) اماں برکتے نے آنکھوں پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر اسے بغور دیکھا۔ اس کی سخت مزاج آنکھوں میں تعجب کے رنگ واضح نظر آنے لگے۔ شناور نے اسے پھر اپنی جانب متوجہ کیا۔

''کیا کسی ہاسپٹل میں ہے؟''

''مینوں نئیں پتا۔'' وہ یکایک واپس مڑنے لگی۔

''ایک منٹ اماں...... رکیں تو سہی......'' وہ رک گئی لیکن شناور کے مقابل کھڑے ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بار بار مقدس کے پریشان اور الجھے ہوئے وجود پر بھٹک جاتی تھیں۔

''آپ دونوں ایک ہی کوارٹر میں رہتی ہیں۔ کئی سالوں سے ایک ساتھ ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے بارے میں بالکل بھی کوئی خبر نہ رکھتی ہوں کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔'' شناور کے جرح کے انداز پہ اماں برکتے بگڑ گئیں۔

''اپنا کام کر کڑیے۔ تیرا کی مطلب پٹھانی سے وہ کدر ہے، کدر نئیں، تجھے کیا؟''

''اماں ناراض مت ہو۔ دراصل دو سال سے انہیں دیکھتی آ رہی ہوں۔ ہم ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کے لیے تو آپ اور دیگر لوگ ہی گھر کے افراد جیسے ہوتے ہیں ناں۔'' وہ چاپلوسی پر اتر آئی۔

''بس ان کی بیماری کا سنا تو پریشانی سی ہوئی۔ آپ سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ شاید انہیں کسی مدد کی ضرورت ہو۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اگر آپ بتا دیں کہ وہ کس ہاسپٹل میں ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی آؤں گی اور علاج معالجہ وغیرہ کے سلسلے میں کچھ مدد بھی کر دوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' اس کے چہرے پر پھیلی کمال معصومیت اور لہجے کی انتہا درجے کی مٹھاس شاید اماں برکتے کو موم کر دیتی لیکن سامنے کھڑی مقدس کا متفکر چہرہ اور مضطرب انداز میں چٹختی انگلیاں باور کرا رہی تھیں کہ بات اتنی سی نہیں۔

''مینو سچی نئیں پتا، اوہ کیسے نوں وسدی دی نئیں سی اپنی کوئی گل۔ پر میرا خیال اے اوہ ہن واپس آن نہیں جے لگی۔ ہو رے اپنے پنڈ چلی گئی ہوے۔'' (مجھے واقعی نہیں پتا وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں تھی، اپنی کوئی بات، لیکن میرا خیال ہے وہ اب واپس نہیں آنے والی۔ شاید اپنے گاؤں چلی گئی ہو) وہ تیز تیز قدموں سے واپس اندر کی طرف چلی گئی۔

''کیا کہہ رہی تھیں؟'' اسے ایک لفظ نہ پلے پڑا۔

''شاید وہ واقعی نہیں جانتیں۔''

''نہیں شانو، انہیں سب پتا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' لگ تو شانو کو بھی رہا تھا لیکن اس نے اس کی تائید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''اگر پتا ہوتا تو بھلا وہ ہم سے کیوں چھپاتیں۔'' وہ ہر صورت اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سوئی بار بار اماں برکتے کی کھوجتی نظروں پر اٹکی ہوئی تھی۔

''پھر وہ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدل سے گئے تھے، شانو تم کہہ رہی تھیں ناں کہ میرے اور ان کے چہرے میں بے حد مشابہت ہے تو کیا اس لیے؟''

''ہو سکتا ہے...... لیکن اس مشابہت کو بہت کم لوگ محسوس کر سکتے ہیں۔ خصوصاً وہ جو تمہیں یا ان خاتون کو بہت قریب سے جانتے ہوں۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو اس چہرے کے نین نقش مجھے چونکا گئے تھے کیونکہ برسوں سے ان نقوش سے میری واقفیت رہی ہے۔ اسی طرح چونکہ اماں برکتے، اماں مومنہ کے ساتھ گزشتہ کئی سالوں سے رہتی چلی آ رہی ہیں اس لیے تمہاری صورت دیکھ کے انہیں اچنبھا تو ہوا ہی ہوگا۔ ورنہ سرسری سا دیکھنے پہ یہ مشابہت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ ایک تو عمر کا فرق، دوسرے ان کے چہرے کا ایک تہائی حصہ خاصا جلا ہوا ہے۔''

''اور...... اور...... یہ چہرہ کس نے جلایا ہوگا؟'' اس نے جیسے ہواؤں سے سرگوشی کی تھی۔

''پلیز مقدس...... ان سوالوں میں خود کو مت الجھاؤ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ ہم یہاں ایک امید لے کے آئے ہیں۔ الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا ڈھونڈنے لیکن جب تک کوئی بات واضح نہ ہو جائے تم یہ فرض کر کے مت بیٹھ جاؤ کہ وہی تمہاری مما ہیں'' اسے تابعداری

سے سہلاتے دیکھ کے اسے ذرا تسلی ہوئی۔

''اور ہاں اکیلے مت جانا ہاسٹل، مجھے لائبریری میں بس دس منٹ کا کام ہے۔ میں فارغ ہو کے آتی ہوں تو اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔ تمہیں وہاں چھوڑ کے میں زارا کی طرف جاؤں گی۔ اس کے ساتھ ایگزبیشن سے کچھ معاملے نمٹانے ہیں۔''

اسے آڈیٹوریم کی سنسان سیڑھیوں پہ گم صم بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خشک پتوں کے کرلانے کی آوازیں اس کے خالی دماغ میں گونجیں پھر ایک بھاری مردانہ آواز اسے غائب الدماغی کی کیفیت سے مکمل طور پر نکال لائی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے گرد آلود سیڑھیوں پہ انگلی سے لائنیں کھینچنے کا شغل ترک کر کے سامنے نظر اٹھائی۔ چند لمحے اسے انجان نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ جیسے ہوش میں آگئی۔

''آپ......؟...... یہاں۔''

''جی...... میں ڈاکٹر خوشنود...... اور یہاں۔'' اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمق پا کے وہ ریلیکس سا ہو کر وہیں ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا۔ ''بڑی کمزور یادداشت ہے آپ کی۔ محض چوبیس گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات بھی آپ کے ذہن سے محو ہوگئی۔''

''جی نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ اب اسے کیا بتاتی کہ ذہن اس وقت کن طوفانوں کی زد میں ہے۔ وہ تو ابھی خود کو پہچاننے کے مراحل سے گزر رہا ہے، کسی دوسرے کا حوالہ کیا یاد رکھے۔ ''دراصل میں آپ کو یہاں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں ناں پھر یہاں۔''

''میں ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ آپ یہاں پڑھتی ہیں۔'' اس کے سوال کا جواب پیچھے سے آتی شناور نے دیا۔

''جی نہیں، یہ بھی یہاں ایک ذاتی کام سے آئی ہیں۔ نجانے اس ملک کے ڈاکٹروں کو ہم فنکاروں سے کیا کام پڑ گئے ہیں۔''

''السلام علیکم۔''

''شکر ہے سلام کا جواب تو ملا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ سلام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ میں سلام کا جواب دینے کی بھی روایت نہیں۔'' مقدس اس کا طنز محسوس کیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

''تو آپ بھی ڈاکٹر ہیں، یقین نہیں آتا۔'' اس نے لائٹ براؤن کڑھائی والی آف وہائٹ چادر میں سلیقے سے لپٹی اس مختصر الوجود لڑکی کو بے یقینی سے دیکھا جو چہرے پہ چھائی سنجیدگی اور پر وقار طریقے سے اوڑھے چادر کے باوجود بھی کم عمری ٹین ایجر ہی نظر آتی تھی۔

''تقریباً'' اس بار بھی اس کی طرف سے جواب شناور نے ہی دیا۔

''یہ زیر تعمیر ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں ہے، کنگ ایڈورڈ کالج میں'' اس نے مقدس کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے تعارف کا سلسلہ مزید آگے بڑھایا۔ ''اور میں شناور گل، مقدس کی فرسٹ کزن اور اکلوتی فرینڈ، یہاں منی ایچیز ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔''

''بے حد خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' اس نے ہنستے ہوئے تعارف سے اگلی رسم بھی نبھا دی۔

''آپ لاہور میں کب تک ہیں؟''

''کچھ صحیح اندازہ نہیں کب تک رُکنا پڑے لیکن اس ایک ہفتے تک تو واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''تو پھر یہ میری طرف سے باقاعدہ انویٹیشن ہے آرٹ گیلری میں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایگزیبیشن ہے پرسوں۔ضرور آیئے گا۔''

''جی ضرور'' اس نے فوراً ہامی بھرلی۔ بعد میں سارے راستے ہی مقدس اس سے بحث کرتی رہی۔

''کیا ضرورت تھی اتنے تفصیلی بیان کی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ کنگ ایڈورڈ کالج۔ منی ایچر ڈیپارٹمنٹ اور تو اور فضول میں انوائیٹ بھی کیا۔ پتا نہیں کب عقل آئے گی ہر کسی سے بلاوجہ فرینک ہو جاتی ہو۔ نجانے کون ہے، کیسا ہے، کیا سمجھ رہا ہوگا، ہمیں۔''

''اوہو تم کیوں اس قدر چڑ جاتی ہو اس معاملے میں۔ آخر کسی سے ذرا سا تعارف حاصل کرنے میں کوئی ذاتیات کی حدود میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی اس بات سے تو انکار نہیں ہے ناں تمہیں، پھر کیا ہوا، اگر میں نے اخلاقاً اسے انوائیٹ کرلیا آخر پرسوں کی ایگزیبیشن میں شامل سارے لوگ ہمارے واقف کار ہی تو نہیں ہوں گے۔ اجنبیوں کا وہاں آنا منع تو نہیں ہے اور پھر...... دو ملاقاتوں کے بعد کوئی اجنبی نہیں رہتا۔'' شناور کو اس کی انتہا درجے کی احتیاط پسندی سے چڑ تھی۔

''اور پھر وہ کون ہے، کیا ہے اس کا اندازہ تو تمہیں بھی ہو ہی گیا ہوگا۔ اس قدر پولائٹ، کلچرڈ اور ویل مینرڈ شخص کم از کم میں نے تو پہلی بار دیکھا ہے۔ خواتین کا احترام کرنا جانتا ہے۔ تم نے محسوس کیا اس نے ایک بار بھی ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ نام نہیں پوچھا۔ پتہ نہیں جاننا چاہا اس سے ظاہر ہوتا کہ وہ......''

''پلیز شانو، پلیز اسٹاپ اٹ۔'' اس نے تنگ آکے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ نجانے کیوں وہ اس شخص کی تعریف میں ایک لفظ مزید نہ سننا چاہتی تھی لیکن بھلا کسی کے چاہنے سے بھی کچھ ہوا ہے۔ ایگزیبیشن والے روز شناور اسے کھینچ گھسیٹ کرکے اپنے ساتھ لے ہی گئی۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے مقدس کو زبردستی تیار کیا تھا۔

''یہاں اکیلی بیٹھی کیا کروگی۔ اب چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے آہی گئے ہیں محض تمہاری ضد کے ہاتھوں مجبور ہوکے تو کسی نہ کسی طرح وقت گزارنا ہی ہے۔ وہ تو شکر ہے زارا اور احمد نے ایگزیبیشن کا پروگرام بنایا ہوا تھا ورنہ میں نے تو تمہاری جان نہیں چھوڑنی تھی اگر مجھے بوریت کا شکار ہونا پڑتا۔''

''کوئی احسان نہیں کیا تم نے میرے ساتھ آکے۔ جس مقصد کے تحت میں یہاں آئی تھی، وہ تو اب تک ادھورا ہے۔ تم سب کچھ بھلائے اپنے دوست کے کاموں میں مصروف ہو۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''میں بھولی نہیں جان، لیکن اس طرح بار بار وہاں جانے کا کیا فائدہ؟ خیر تمہاری تسلی کے لیے کل پھر چلیں گے پتا کرنے۔'' اس نے کسی طرح بہلا پھسلا کر اسے جانے پہ تیار کر ہی لیا۔ وہ جانتی تھی کہ مقدس اس وقت کس ذہنی کیفیت سے دوچار ہے۔ ادھوری معلومات اسے کچلے دے رہی ہیں اور جب تک وہ کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی یونہی امید و بیم کا شکار رہے گی۔ اب تو خود شناور بھی بے چینی سے اماں مومنہ کی منتظر تھی تاکہ آر یا پار کوئی تو حل نکلے۔ وہ مقدس کی ماہیں یا نہیں، یہ معمہ تو کھلے۔

''السلام علیکم۔'' اس بار شناور نے خوشنود کو دیکھ کر لپک کے سلام کرنے میں پہل کی۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے مسکراتے ہوئے شناور کے سلام کا جواب دینے کے بعد مقدس کی طرف دیکھا۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

''جی ٹھیک ہوں۔'' اب اتنی بداخلاق تو وہ بھی نہ تھی کہ جواب ہی نہ دیتی لیکن مزید گفتگو سے بچنے کی خاطر دانستہ رُخ موڑ کے پینٹنگز دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر خوشنود کو مکمل طور پر مقدس کی طرف متوجہ دیکھ کے شناور ٹھٹکی اور کچھ سوچ کے غیر محسوس انداز میں دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے بڑی دلچسپی سے اس کی بے اعتنائی کا مظاہرہ دیکھنے لگا۔ اس وقت آرٹ گیلری میں موجود ایک سے ایک ماڈرن ازم کی شکار لڑکیوں کے درمیان اس کا سادہ مگر پُر وقار وجود انفرادیت کے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ سر کو مکمل طور پر ہر وقت ڈھانپے رہنے والا آنچل، سر کو قدرے اُونچا کر کے پینٹنگز دیکھنے کی کوشش میں ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ سنہرے بالوں کے درمیان سے نکلتی سیدھی اور شفاف مانگ میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ پیشانی کا نور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے نام کے رنگ اس کی شخصیت میں کتنے گہرے ہیں۔ مصنوعی رنگوں سے قطعی بے نیاز لب ورخسار نقرئی جلد پہ یاقوت کی مانند دمک رہے تھے۔

''اور آنکھوں میں ترشے ہوئے نیلم اس چہرے کو کس قدر بیش قیمت بنا رہے ہیں۔'' خوشنود نے سوچا۔

''پھر کیا ہے...... کون سا تاثر ہے جو اس انمول نگینے کو محروم ظاہر کر رہا ہے...... اداسی کی اس کہر کا سبب کیا ہے جو اس نکھری ہوئی شخصیت کو دھندلائے دے رہی ہے...... وہ کون سی الجھن ہے جس کے الجھاؤ نے اسے گرد وپیش سے اس قدر بیگانہ کر دیا ہے۔ وہ اس کی کھوئی کھوئی سی کیفیت کا راز کھوجنے میں خود بھی کہیں کھو سا گیا۔

کچھ دیر کی خاموشی محسوس کر کے مقدس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا۔ شناور غائب تھی لیکن ڈاکٹر خوشنود ہنوز اس کے عقب میں دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے یک دم رُکنے پہ وہ بھی ٹھٹھک کر ٹھہر گیا۔ ان آنکھوں میں سراسیمگی سی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔

''آپ کی کزن غالباً اپنے کلاس فیلوز کے ہمراہ ہیں۔''

مقدس کو اس لڑکی پہ بے انتہا غصہ آیا جو ضد کر کے اسے ساتھ لائی تھی اور اب اجنبی لوگوں میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ تنہا ہونے کی بے بسی اس کے ہر نقش سے عیاں ہونے لگی جسے محسوس کر کے وہ پھر کہہ اٹھا۔

''آپ اپنی دوست پہ اتنا ڈیپنڈ کیوں کرتی ہیں؟''

''ڈیپنڈ؟ جی نہیں میں صرف اس کی عادی ہوں اور کوئی بات نہیں، ہمارا ساتھ کئی برسوں پرانا ہے اور پھر میری کسی سے کوئی خاص دوستی بھی نہیں اس لیے اس کا میرے پاس نہ ہونا مجھے کچھ ڈسٹرب کر جاتا ہے۔'' وہ اس کے سوال کا جواب دینے کی پابند تو نہ تھی لیکن اس کے ڈیپنڈ کرنے والے الزام نے اسے جز بز کر دیا تھا۔

''اور یہ ڈسٹربنس تو آپ پہ مکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔'' وہ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی جھنجھلاہٹ دیکھ کے خاموش ہی رہا۔

☆☆☆

اسے خان افراسیاب خٹک کے گھر آئے دو روز گزر چکے تھے۔ اس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ دراب کو اسے اس طرح باچا خان کے سامنے لے جاتے ہوئے خوف محسوس ہوا اسی لیے بڑے لالہ کی ہدایت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھا زریاب کو یہاں لے آیا تھا۔ خود افراسیاب بھائی کا شکستہ وجود دیکھ کے ڈھے گئے۔ ان گزرے دو عشروں میں انہوں نے بھائی کی ایک جھلک تک دیکھنے سے اجتناب کیا تھا۔ شروع شروع میں جب بھی کوئی زریاب سے ملنے کی کوشش کرتا اس کی دیوانگی بڑھ جاتی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ افراسیاب کی ہر اس کوشش کو بھی اس نے سختی سے رد کر دیا جو انہوں نے اسے بچانے کے لیے کرنا چاہی، وہ اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کی سزا کم سے کم کروانا چاہتے تھے لیکن زریاب نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

"میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا لیکن لالہ مجھے اس کے لیے مجبور مت کرو۔ اس وقت جس چیز کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ زندگی ہے۔ مجھے ان بوسیدہ دیواروں کے اندر گلنے سڑنے دو۔ یہاں قید میرے وجود کے زندہ ہونے کی خبر تو کسی کو نہ ہوگی۔ خدا کے واسطے لالہ مجھے اشتہار مت بناؤ...... مجھے روشنی میں مت لاؤ...... اندھیرے میں پڑا رہنے دو اور دعا کرو کہ یہ دیواریں میرا بھرم رکھ لیں۔ مجھے زندگی کی طرف کھینچ کے لانے کی کوشش مت کرو...... میری موت کی دعا کرو۔ باعزت موت کی...... ورنہ...... اگر مجھے دوبارہ باہر لانے کی کوشش کی تو...... میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ مجھے حرام موت کی طرف بڑھنے پہ مجبور مت کرو لالہ۔" اس کے جنون اور دیوانگی سے گھبرا کے خان افراسیاب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا لیکن وہ اس کی موت کی دعا نہ مانگ سکے۔ بس بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے......

وقت جو تلخ سے تلخ زہر کو بھی بے اثر کر دیتا ہے۔ وقت جو بھیانک سے بھیانک تر عکس پر بھی گرد کی تہہ جما دیتا ہے۔
وقت جو گہرے سے گہرے گھاؤ کو بھی بھرتا نہیں تو کھرنڈ تو ضرور لے آتا ہے۔

اور شاید زریاب کے زخموں پہ بھی کھرنڈ آ چکے تھے۔ ان سے خون تو اب بھی رستا تھا لیکن اس طرح بہتا نہیں تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں دیوانگی اب بھی ٹکریں مارتی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ شدتیں ناپید تھیں جو اسے دیواروں سے سر ٹکرانے پہ مجبور کرتی تھیں۔ اس کے لب سسکیاں دبا دبا کے صحرا ہو چکے تھے۔ آہیں بھر بھر کے اس کی سانس کے رستے زخمی ہو چکے تھے۔ لیکن چیخیں گونگی ہو گئی تھیں، دعائیں گنگ رہ گئی تھیں اور...... موت کی خواہش خود ہی مر چکی تھی۔

افراسیاب نے قسمت سے ہارے اپنے ماں جائے کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ اپنے خون کی حرارت نے زریاب میں زندگی کے کچھ آثار پیدا کیے۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو سب سے پہلے اسے یہ خیال آیا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو دراب؟ وہ باچا خان...... بی بی جان؟" اسے اندیشہ سا گزرا...... کہیں......"آہ...... اپنی ذات کے ساتھ الجھتے ہی اتنے برس گزار دیے، ان ہستیوں کا کوئی خیال تک نہ آیا جو اس ذات سے وابستہ ہیں۔" اسے ندامت نے آن گھیرا۔

"باچا جان اور بی بی جان، کیا وہ تمہیں اس حال میں دیکھ پائیں گے زریاب، بیس سالوں کا صبر ایک ہی پل میں کھو دیتے وہ تمہارا یہ حال دیکھ کر، کتنے بدل گئے ہو تم۔"

اس نے اپنے سامنے بیٹھے افراسیاب لالہ کو نظر بھر کے دیکھا جن کا کبھی وہ باچا جان کے بعد سب سے زیادہ احترام کیا کرتا تھا اور ان سے ڈرتا تو وہ شاید باچا جان سے بڑھ کے تھا۔ آج بھی ان کی شخصیت کے رعب کا وہی عالم تھا۔ ہلکے ہلکے بھورے بالوں میں جگمگاتے چاندی کے تاروں نے اور بھی دبدبہ قائم کر دیا تھا۔ سنجیدہ تاثر دیتی آنکھیں، کناروں پہ پھیلی لکیروں کے ساتھ اور بھی سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

زریاب نے نظر اٹھا کے ذرا فاصلے پہ کھڑے دراب کو دیکھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں بھر چکا تھا۔ نوکدار مونچھیں تو اس کی پہلے سے تھیں اب داڑھی کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ البتہ سر کے بال خاصے جھڑ چکے تھے جن کی وجہ سے ماتھا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ رنگت پہلے کی بہ نسبت سنولا چکی تھی۔

''شاید شکار کا شوق عروج پہ ہے۔''

زریاب نے اس کے کھردرے ہاتھوں اور سانولے ہوتے چہرے کو دیکھ کے اندازہ لگایا۔ دراب ایک بار پھر کرسی پہ بیٹھ گیا تو وہ مسکرایا۔ پچھلے دس منٹوں میں وہ چار بار اٹھ اور بیٹھ چکا تھا۔

''تو خان دراب خٹک اتنی تبدیلیوں کے بعد بھی ایک چیز ہے جو اب تک ویسی کی ویسی ہے۔ تمہاری طبیعت کا بے صبرا پن اور بے چینی۔''

''کیا سوچ رہے ہو لالہ؟'' اس نے سوال کیا تو زریاب دونوں کے چہرے باری باری دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

''آپ دونوں بھی تو کتنے بدل گئے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے لگ رہے ہیں۔''

''صرف بڑے.....'' افراسیاب نے اسے احساس دلایا۔

''کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے ذرا، تم بوڑھے دکھنے لگے ہو۔'' زریاب نے بھائی کے ہاتھوں کی مضبوط اور محفوظ گرفت سے اپنا استخوانی ہاتھ آہستگی سے نکالا۔ لمبی لمبی انگلیوں پہ زرد کھال منڈھی تھی اور فراخ ہتھیلی مشقت کے تمام ثبوت سجائے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کے یہ سچ محسوس کرنا چاہا وہاں جھریاں ہی جھریاں تھیں۔

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ تو حیرت کیسی
زندگی نے مجھے تم سے زیادہ ہے پہنا

☆☆☆



خوشبو ہے، دھنک ہے چاندنی ہے

وہ اچھے دنوں کی شاعری ہے

بھیگے ہوئے پھول حرف اس کے

وہ رم جھم کی زباں میں بولتی ہے

باتوں میں تھکن ہے شام جیسی

لہجے میں سحر کی تازگی ہے

چہرے پہ حیا کا روپ جیسے

دریا میں شفق گھل گئی ہے

برسا ہے خمار چاندنی کا یا

اس کی جبیں دمک اٹھی ہے

کیا جانے وہ کیسے مسکرائی

چہرے پہ بکھر کے زلف اس کی

سورج سے خراج مانگتی ہے

پل بھر کو سرک گیا جو آنچل

کلیوں کی طرح سمٹ گئی ہے

اے مشتریان حسن عالم!

وہ دونوں جہاں سے قیمتی ہے

خوشنود نے ”طلوع اشک“ بند کی اور سینے پہ دھر کے یونہی نیم دراز سوچنے لگا، خوشبو ہے، دھنک ہے، چاندنی ہے......

خوشبو، دھنک اور چاندنی کا امتزاج بھی بھلا کہیں ہوا ہے...... ہزار بار یہ بات اس کے ذہن میں آتی تھی اس غزل کو پڑھ کر اور ہر بار ہی وہ سر جھٹک کے مسکرا دیا تھا لیکن اب کون سی بات ہے جسے وہ جھٹلا سکتا ہے۔ کیا اس کے مسکرانے سے کرنیں نہیں چھن پڑی تھیں؟

کیا اس کے لہجے میں سحر کی سی تازگی نہیں ہے؟ کیا اس کی جبیں چاندنی میں نہائی ہوئی نہیں لگتی؟

اور کیا وہ...... دونوں جہاں سے قیمتی نہیں لگتی؟

اور یہ آخری سوال وہ خود سے کر کے چونک گیا تھا۔

”کچھ تو اس میں ہے خوشنود جس نے تمہیں اتنا بے خود کر دیا ہے ورنہ جن حالات میں تم یہاں آئے ہو ان کی سنگینی کیا اس بات کی اجازت

دیتی تھی کہ تم سب کچھ فراموش کیے آرٹ گیلری میں ایک مشکل سی الجھی ہوئی سی لڑکی کے پیچھے خوار ہوتے رہے؟''

اس کے دل نے اسے مزید کریدا تو وہ چپکے سے اقرار کر گیا۔

''ہاں...... کچھ نہیں بہت کچھ ایسا ہے جو مجھے اس کی جانب کھینچتا ہے۔ جو مجھے وقتی طور پر ہی سہی مگر بھلا دیتا ہے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔ کاش کہ وہ بھی یہ جان لے کہ وہ کسی کے لیے کتنی ضروری بن گئی ہے۔'' اس نے خدا سے دعا کی، کوئی معجزہ ہی ہوتا جو اسے مقدس کے آگے اظہار کی طاقت دے پاتا، ورنہ اس کی حد درجہ بے نیازی اور لاتعلق سا رویہ خوشنود کی ہمتیں پست کر دیتا تھا۔

پرواہ ہی نہیں اسے کسی کی
اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے
وہ غنچہ دہن سکوت زادی
کھلنے پہ بھی کم ہی بولتی ہے

☆☆☆

''تمہیں کیا میری بات کا بالکل بھی اعتبار نہیں رہا جو خود چلی آئی ہو'' شناور اسے اپنے انتظار میں ٹہلتا دیکھ کے جل ہی تو گئی۔

''پھر کیا کروں میں؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''تین دن سے تم یہی کہہ رہی ہو کچھ پتا نہیں چلا، کوئی خبر نہیں ملی۔ آخر کب تک میں......''

''وہ اماں برکتے تو اب میری صورت دیکھ کے بھڑک جاتی ہے۔ ویسے جس انداز میں وہ جھنجلاتی ہے میرے سوال پہ اس سے مجھے تمہارا شبہ کچھ کچھ یقین میں بدلتا نظر آتا ہے کہ واقعی وہ جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ صبح بھی مجھے دیکھتے ہی رخ بدل کے دوسری جانب چل پڑی۔ صاف لگ رہا تھا مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ کسی کام سے ہاسٹل سے باہر چلی گئی ہے۔''

''اوہ، تو تمہیں پیچھا کرنا چاہیے تھا ناں اس کا، کیا پتا وہ انہیں سے ملنے گئی ہو۔''

''پیچھا کرنا چاہیے تھا، پاگل ہوئی ہو کیا، اب میں مائیوں کا پیچھا کرتی پھروں۔'' وہ بگڑ کے بولی۔

''تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں خود آئی ہوں آج۔ کاش کچھ دیر پہلے آ جاتی تو...... مجھے یقین ہے وہ اماں ہم سے کچھ چھپا رہی ہے۔ لیکن میں بھی اس سے ضرور اگلوا کے رہوں گی۔ بس ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ کیا واقعی وہ...... میری مما ہیں یا نہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ کچھ کھاؤ پیو گی یا یہی باتیں کرنے آئی ہو؟'' شناور نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

''میرے پاس فی الحال اس موضوع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سچ پوچھو تو میں اس بار لاہور بھی صرف اس لیے آئی تھی شناور ورنہ جس ذہنی کیفیت سے میں گزر رہی ہوں اس میں کالج جانا محض وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ کہیں میرا یہاں آنا اک کار زیاں نہ ثابت ہو۔''

''اف خدایا، کس قدر مشکل الفاظ بولنے لگی ہو تم، غالباً تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ خاتون تمہیں نہ ملیں تو تمہارا لاہور آنا بے کار جائے گا، ہے ناں۔'' وہ تصدیق کے لیے رکی۔

''تو مائی ڈیئر کزن یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بار کے تمہارے لاہور کے سفر نے تمہاری تقدیر میں کچھ اور لکھ دیا ہو۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً......'' وہ رک کے سوچنے لگی کہ کہے یا نہ کہے حالانکہ یہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ شناور اور کچھ کہنے سے قبل سوچنے کی زحمت کرے۔ پھر اپنے ازلی بے دھڑک انداز میں کہہ اٹھی۔

''مثلاً ڈاکٹر خوشنود۔ نہ تم لاہور آنے کا اتنا اچانک فیصلہ کرتیں، نہ ہم بائی روڈ سفر کی مصیبت مول لیتے اور نہ ہی وہ...... مانوس اجنبی ٹکراتا۔''

''واٹ ربش؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟'' حسب توقع مقدس کی گلابی رنگت غصے کی حدت پا کے اناری ہو گئی۔

''سب پتا ہے۔'' وہ اس کے بلند لہجے کے رعب میں قطعی نہ آئی۔

''اور تم جانتی ہو کہ تمہاری ہر بات کا پتا پہلے مجھے چلتا ہے بعد میں تمہیں۔ بلکہ جب تک میں تمہیں نہ بتاؤں تمہیں تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ تم سوچ کیا رہی ہو اور چاہتی کیا ہو۔''

''تو تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں تم پہ ڈیپنڈ کرتی ہوں۔'' اس کے اس قدر درست اندازہ لگانے پہ مقدس تلملا گئی۔

''میں بھی......؟'' شناور ''بھی'' پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔

''تو گویا کوئی اور بھی ہے جو اس راز سے واقف ہے۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ بات کوئی ہو رہی ہو تمہیں ضرور بیچ میں اپنی بے ہودہ ریسرچ پیش کرنی ہوتی ہے۔''

''تم چاہے اسے بے ہودہ کہو یا فضول لیکن دیکھ لینا میری اس ریسرچ کا رزلٹ سو فیصد درست نکلے گا۔ ڈاکٹر خوشنود کا بار بار تم سے ٹکرانا بے مقصد نہیں ہے۔''

''مت بھولو کہ ہر بار میرے ساتھ تم بھی ہوتی ہو۔'' اس نے باور کرایا۔

''میں تو نہیں بھولی، لیکن کیا کروں ڈاکٹر صاحب کو بھی یاد نہیں رہتا کہ تمہارے ساتھ میں بھی ہوتی ہوں بلکہ وہ تو تمہیں دیکھ کے شاید خود کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔''

''تم یہاں بیٹھ کے اس خود ساختہ فلمی کہانی میں رنگ بھرو اور چسکے لے لے کے سوچو جو بھی سوچنا ہے۔ کم از کم میرے سامنے یہ بات اب مت کہنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھیں۔'' وہ بیگ کاندھے پہ لٹکا کے کھڑی ہو گئی۔

''ارے......ارے رکو تو......'' اور وہ رک گئی۔ شناور کی آواز پہ نہیں پارکنگ میں کھڑی سلور گرے کرولا سے اترتی اماں برکتے کو دیکھ کے۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ اور کوئی نہیں، خوشنود تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اس کا دراز قد، اور غیر معمولی چوڑے شانے اسی کا شائبہ دلا رہے تھے۔ باہر کی طرف نکلتی مقدس نیم وا بڑے سے گیٹ کی اوٹ میں ہوگئی۔ اماں کار سے نکلنے کے بعد بھی ہنوز پچھلی سیٹوں سے کچھ سامان نکالنے میں مصروف تھی۔ آخر کار وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔ ڈارک گرے ٹو پیس سوٹ کے ساتھ بلیک شرٹ اور بلیک ہی سن گلاسز میں وہ واقعی خوشنود تھا۔ اس نے جھک کے اماں کو سامان اٹھانے میں مدد دی دو شاپنگ بیگز میں زنانہ سوٹ تھے جو شاید استعمال شدہ لگ رہے تھے باسکٹ میں تھرماس اور چند برتن، ایک ٹشو پیپر کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد اماں اچانک رکی جیسے کچھ یاد آگیا ہو، پھر اپنی عادت کے مطابق بلند آواز میں پوچھنے لگی۔

''میں کہیا پتر، اجے اس کج کھانا پینا تے نئیں، کہ میں سویرے یخنی تے دلیہ بنالیاواں؟'' (میں نے کہا بیٹا، ابھی اسنے کچھ کھانا پینا تو نہیں؟ یا پھر میں صبح یخنی اور دلیہ بنالاؤں) نجانے خوشنود نے کیا جواب دیا تھا۔ مقدس اماں کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ کے پیچھے ہو جانے کی وجہ سے صحیح طرح سن نہیں پائی۔

''کون سے ہاسپٹل سے آرہی ہیں آپ اماں؟''

مقدس نے اچانک سامنے آکر اماں برکتے کو گڑبڑا کے رکھ دیا۔

''کدوں؟ میں کدھوں گئی کتھے؟'' (کب میں کب کہیں گئی ہوں؟) وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔

''آپ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہیں۔ کیوں نہیں مجھے بتا دیتیں ان کے بارے میں۔'' وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ شناور بھی قریب چلی آئی۔

''اور اماں، یہ شخص کون تھا، تمہارا کیا لگتا ہے؟ کہاں گئی تھیں تم اس کے ساتھ؟'' اس نے بھی اماں برکتے کو گھیر لیا تو وہ بھتے سے ہی اُکھڑ گئی۔ اچانک مقدس کے حملے نے اسے چونکا ضرور دیا تھا لیکن ذرا سنبھلنے کے بعد وہ پھر اپنی جون میں آگئی۔

''پراں ہٹو کڑیو، تھانے دارنیوں، کتھوں آگئیاں نیں میرے نال پچھ پریت کرن والیاں، تمیزای نئیں دسی کسے نیں۔ ماما لگدا اے او بندہ تہاڈا تے نانی لگنی آں میں جیہڑی تہانوں تسلی کراواں۔'' (پرے ہٹو لڑکیوں، تھانے دارنیوں، کہاں سے آگئی ہیں، مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔ کسی نے تمیز نہیں سکھائی تمہیں۔ وہ تمہارا ماما لگتا ہے یا میں تمہاری نانی لگتی ہوں جو تمہارے سوالوں کے جواب دوں) وہ بری طرح جھڑکتی آگے چل پڑی۔

''لو کروالی عزت افزائی۔'' شناور نے اسے جتایا۔

''ویسے یار، واقعی سوچنے والی بات ہے ڈاکٹر خوشنود کا اس مائی سے کیا تعلق؟ تمہارے پاس تو کارڈ بھی تھا ناں ان کا۔ اس بھڑکیلی اماں سے سر پھوڑنے کے بجائے تم انہیں سے پوچھ لو۔ شاید کوئی سرا ہاتھ لگ جائے۔ نہ بھی ہو تو کم از کم تمہاری تسلی تو ہو جائے گی۔ ہوسکتا ہے وہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پر اسے لفٹ دے بیٹھے ہوں یا اس کی کسی عزیزہ کا مفت علاج معالجہ کرا رہے ہوں۔'' شناور کی عادت تھی وہ ہمیشہ مسئلہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کئی ایک حل بھی بتا دیتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ کسی بھی بات کے مثبت و منفی پہلو دونوں ہی سامنے رکھ دیتی تھی۔

''ڈاکٹر خوشنود علی وردگ۔''

کارڈ پہ لکھے نام پہ سرسری سی نگاہ ڈال کے وہ نیچے درج فون نمبرز کی جانب متوجہ ہونا چاہتی تھی لیکن خوشنود کے نام کے آگے لگے حوالے نے اسے منجمد کر دیا۔خوشنود کا ''وردگ'' ہونا پراسرار خاتون کا مومنہ ہونا، ثابت کر رہا تھا۔

''ہیلو ڈاکٹر خوشنود اسپیکنگ۔''

''ہیلو......'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''آپ......'' اسے گمان سا گزرا لیکن اپنی خوش بختی کا اتنا یقین نہیں تھا کہ وہ پورے وثوق سے اس کا نام لے سکتا۔

''السلام علیکم۔'' اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اپنا تعارف کیسے کرائے۔

''وعلیکم اسلام مقدس؟'' اس نے آس وامید سے چور چور لہجے میں پوچھا۔

''جی......'' اسے اپنے ہونے پہ شرمندگی تھی یا پھر شاید فون پہ ہونے کی۔

''زہے نصیب، کہیے کیسے یاد کیا؟''

''مجھے آپ سے ایک کام تھا'' وہ براہ راست اپنے مدعا پر آ گئی۔

''میری خوش نصیبی کہ اب آپ کو بھی مجھ سے کام پڑنے لگے۔'' اس کا چہکنا مقدس کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔اس نے چڑ کے موبائل آف کر دیا۔خوشنود کے مسلسل مسکراتے لب یکدم سکڑ گئے۔

''تف ہے تم پہ ڈاکٹر وردگ، ایک لڑکی کا فون کیا آ گیا، باچھیں چیر چیر کے ڈائیلاگ جھاڑنے لگے، یہ احساس کیے بغیر کہ مخاطب ایک مقدس ہستی ہے۔'' اسنے اپنے اندر گنگناتے جذبے کو ڈپٹا اور پھر سے اپنی سوبر و سنجیدہ جون میں آتے ہوئے سی ایل آئی پہ نمبر چیک کیا۔

''ہیلو'' زندگی سے بھرپور آواز شناور کی تھی۔

''مس شناور میں ڈاکٹر خوشنود بول رہا ہوں۔ابھی چند منٹ قبل اس نمبر سے مس مقدس نے مجھے کال کی تھی۔''

''جی جی......وہ بس......اچھا آپ بات کیجیے۔'' اس نے زبردستی مقدس کے کان سے موبائل لگایا۔شناور کی بے موقع مسکراہٹیں اسے زہر لگ رہی تھیں

''جی مس مقدس، کہیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' دوسری طرف سے آتی سنجیدہ آواز نے اسے دوبارہ بولنے پہ آمادہ کیا۔

''میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی ڈاکٹر خوشنود کہ اماں برکتے......شناور کے ہاسٹل کی ملازمہ کے ساتھ آپ کون سے ہاسپٹل گئے تھے؟'' بغیر کسی تمہید کے اس نے سوال کر دیا۔

''جی......؟'' حیران تو وہ پہلے ہی تھا کہ ریزروی رہنے والی اس محتاط مزاج کی لڑکی کو اس سے کیا کام ہو سکتا تھا۔لیکن اس کے لہجے میں موجود استعجاب یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مقدس کا یہ اچانک سوال اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔اس کو سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے لیکن وہ دوسرے سوال سے خود کو

روک نہ پائی۔

''اگر میرا سوال بہت زیادہ ذاتی نہ ہو تو کیا میں یہ جان سکتی ہوں کہ اماں برکتے کے ساتھ رہنے والی خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟'' اس کے چبھتے ہوئے لہجے پہ وہ مزید ٹھٹھکا۔

''یہ سوال تو میں بھی کر سکتا ہوں، لیکن چونکہ آپ نے پہلے پوچھا ہے تو میں بتا دوں کہ میں شیخ زید ہسپتال میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمود غوری سے ملنے گیا تھا وہاں ایک مریضہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ میرے علاقے کی ہیں اور ہم لوگ اپنے علاقے کی رعایا کا خیال رکھتے ہیں، یہ ہمارے بزرگوں کی روایات ہیں۔ محض انسانی ہمدردی اور کچھ اپنی ذات قبیلے کی ہونے کی وجہ سے، میں نے ڈاکٹر محمود سے ان کے علاج معالجے کی خصوصی درخواست کی اور ان اماں جی کو بھی صرف اخلاقاً ہی ہاسٹل تک لفٹ دے دی تھی۔ اب آپ یہ بتایئے کہ آپ کو اصل اعتراض کس بات پر ہے ان اماں جی کو لفٹ دینے پہ یا ان اماں جی پر توجہ دینے پہ۔''

وہ شاید اس توجیہہ کو مان ہی لیتی اگر خوشنود کا ورد گ ہونا اس پہ کھل نہ گیا ہوتا۔ اس لیے قصداً اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ شیخ زید ہاسپٹل میں کس وارڈ میں مل سکیں گی پلیز......'' اس کے بے تاب لہجے میں جھلکتی التجا ڈاکٹر خوشنود کے کھٹکے ہوئے دل کو پھر سے چونکا گئی۔ اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

''ایسا کیجئے آپ مجھے وقت بتا دیں میں آپ کو لے چلتا ہوں ان کے پاس۔''

''نہیں...... میں صبح دس بجے ہاسپٹل پہنچ جاؤں گی۔ آپ بس مجھے ان سے ملوا دیجئے گا۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے لائن ڈس کنکٹ کی۔ دوسری جانب ریسیور ہاتھ میں لیے ڈاکٹر خوشنود کے چہرے پہ تعجب اور الجھن کے اثرات نمایاں تھے۔

☆☆☆

''زریاب......!''

آج فجر سے ہی بی بی جان کے دل کو جیسے پتنگے لگے ہوئے تھے کبھی ادھر کبھی ادھر۔ اک عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے وہ آج اوپر اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی تھیں۔ ورنہ ہمیشہ ہی وہ مغرب کے بعد اپنے کمرے کا رخ کرتیں۔ ان کا ٹھکانا دن بھر لاؤنج میں بچھا وہ جہازی سائز تخت ہوتا جہاں سے وہ با آسانی دن میں کئی کئی بار اٹھ کے باچا جان کے کمرے تک ہو آتیں۔ لیکن آج تو انہوں نے اپنے خان جی کے کمرے میں بس صبح ایک ہی بار جھانکا تھا۔ بستر پہ بے حس و حرکت پڑے لا نبے مگر نحیف سے وجود کی گدلی آنکھیں چھت پہ لگے پنکھے پہ جمی تھیں۔

''خان جی!'' انہوں نے آواز دی۔

''زریاب!'' تھکی تھکی سانسوں پہ ڈولتا یہ نام ان بوڑھے لبوں سے آزاد ہوا اور منتظر بے بس آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ بی بی جان کو دھچکا سا لگا اور پہلی بار...... پہلی بار وہ خان ارباب خٹک کو کوئی دلا سا دیئے بغیر کوئی خوش آئند خبر سنائے بغیر واپس لوٹ گئیں۔ آج تو انہیں خود کسی تسلی بھرے ہاتھ کی ضرورت تھی۔ مچلتے تڑپتے پہلو پر اپنے تکیے پہ سر رکھا ہی تھا کہ پیچھے مردان خانے سے کچھ شور سنائی دیا۔ عموماً افراسیاب کے آنے پہ اس طرح بھگدڑ مچا کرتی تھی اس کی سرکاری گاڑی کے ساتھ گارڈز اور گن مین کا ایک ریلہ بھی تو ہوتا تھا۔ انہوں نے لیٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اٹھ کے بیٹھ گئیں۔ ابھی اپنی بڑی سی چادر پھیلا کے شانوں پہ ڈال ہی رہی تھیں کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا ان کی پرانی ملازمہ وگمہ حواس باختہ سی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندر گھس آئی۔ بی بی جان نے اس کی جسارت کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ولے جنے؟'' (کیا ہے لڑکی؟)

''زریاب لالہ راغلے۔'' (زریاب صاحب آگئے)

''ولے؟'' (کیا؟) وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''سوخ زریاب؟'' (کون زریاب؟)

''خاہ جی'' (ہاں جی)

انہیں کچھ پتا نہ چلا کب وہ کمرے سے نکلیں کب سیڑھیاں اتریں اور کب وہ اس کے روبرو تھیں۔

''زریاب......!''

انہوں نے سامنے کھڑے شکستہ وجود والے ہارے ہوئے انسان میں وہ شہزادوں کی سی چھب ڈھونڈنا چاہی۔ ان چمکتی آنکھوں میں ہر دم ہلکورے لیتا وہ معصومیت بھرا تجسس تلاشنا چاہا وہاں فقط ٹوٹے ہوئے آئینے کی کرچیاں تھیں۔ وہ متذبذب سی کھڑی رہ گئیں دل کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا یہ وہی خان زریاب خٹک ہے جسے وہ آنکھ بھر کے دیکھتے ہی گھبراتی تھیں۔ مبادا اپنی ہی نظر لگ جائے۔ زریاب اپنا کرچی کرچی وجود خود ہی سمیٹ کے بی بی جان کے گلے لگ گیا۔ ان کے بازوؤں نے بڑھ کر اسے سمیٹا۔ ممتا کے گرم جوش سینے سے لگ کے برسوں سے ٹھنڈا پڑتا خون پھر سے اُبل پڑا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اپنے ہی آنسو اس کے لیے اجنبی اجنبی سے تھے۔ وہ تو کب سے نہیں رویا تھا کب سے نہیں ہنسا تھا۔ بلکہ اس نے تو بہت عرصہ پہلے ہی وہ سب کرنا چھوڑ دیا تھا جس سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا۔ حضر بی بی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور

کپکپاتے لہجے میں کہا۔

''میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ خان جی کا سامنا کیسے کروں۔ ان کی آنکھوں کے سوال اب مجھ سے ٹالے نہیں جاتے تھے۔ اللہ نے مجھ پہ کرم کردیا اب میں خان جی کے پاس جاؤں گی ان کا زریاب لے کر۔''

☆☆☆

طویل کوریڈور سے گزرتے ہوئے خوشنود اور مقدس دونوں ہی متضاد کیفیات کا شکار تھے۔ خود سے دو قدم کے فاصلے پہ موجود مقدس کا سمٹا سمٹا وجود خوشنود کو اک خواب سا لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے تھے، لیکن ان مبہم سوالوں کو زبان دے کر وہ اس خواب سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے سنگاپور روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہی اس خط کا ملنا شاید اس خواب کی تمہید تھی۔

لاہور پہنچنے سے قبل ہی اس اتفاقیہ ملاقات نے اسے پہلی بار اک خواب دیکھنے پہ اُکسایا۔

ابھی تو اس نے دل کی باتوں میں نہ آتے ہوئے خواب دیکھنے سے ہر ممکن احتراز کیا تھا کہ چند اور حادثاتی ملاقاتیں آنکھوں کو خوابوں کا ذائقہ زبردستی سونپ گئیں۔

اس کو خود سے ہمکلام ہوتے دیکھنے کا خواب......

اس کے ہمراہ قدم بہ قدم چلنے کا خواب......

اور......اور وہ دیکھنا چاہتا تھا یہ خواب اُسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔

مقدس کا ہر اُٹھتا قدم اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا تھا۔ آج وہ ایک ایسی ہستی کو دیکھنے جا رہی تھی جو شاید کسی بھی انسان کی دنیا میں سب سے قریبی اور عزیز ترین ہستی ہوتی ہے۔

آج سے کچھ دن پہلے اس نے بھولے بھٹکے بھی کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اس ہستی سے مل پائے گی......اس ہستی کا اس دنیا میں وجود ہے بھی یا نہیں۔

اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ اُٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے، اسی ایک ہستی کو سوچ رہی تھی اس کے پیکر کو تصور میں تراش رہی تھی اور آج......آج......محض چند قدم کے فاصلے پہ......چند ساعتوں کے بعد وہ اس کے روبرو ہوگی۔ خوشنود کے تھمتے قدموں نے اسے بھی رک جانے پر مجبور کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے اشارے پہ آئی سی یو کی گلاس وال کے آگے کھڑی ہوگئی۔

ایک......دو......تین اور نمبر تین بیڈ پہ اس کی متلاشی نظریں جم گئیں۔ آکسیجن ماسک سے ڈھکا وہ چہرہ صرف ایک ہی رخ سے نظر آ رہا تھا لیکن مقدس کو اس چہرے سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک ہی نقش کافی تھا۔ وہ شیشے سے چپکتی ہوئی چند قدم آگے سرکی لیکن وہاں سے یہ ادھورا عکس بھی نظر آنا بند ہوگیا وہ پلٹ کے پھر سے اپنی جگہ پہ آئی۔ خوشنود حیرت زدہ سا اس کی بے تابیاں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھا

کے ڈیوٹی پہ موجود نرس سے اجازت طلب کی اور اسے اندر لے آیا وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چلتی بیڈ نمبر تین کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کھڑی مغرور ناک اور گداز کٹاؤ دار لبوں والے چہرے پہ عمر نے اتنے اثرات نمایاں نہیں کیے تھے جتنے کہ بیماریوں نے، یہ اس چہرے کی جھریوں سے پاک شفاف جلد سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن نیلے پڑتے ہونٹ، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور ہاتھوں پیروں کا لاغر پن اس بات کا گواہ تھا کہ دل کا یہ شدید دورہ پہلا حملہ نہیں تھا اور ایک طرف کا رخسار...... جلے ہوئے نشانات لیے نجانے کن کہانیوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے ہولے سے اس چہرے کو چھونا چاہا۔ ان سیاہ پڑتے تھکے ماندے لرزتے پپوٹوں کے نیچے کیا اب بھی شہد کی جھیلیں آباد ہیں۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

''مما......!''

اور...... خوشنود علی وردگ کا خواب ٹوٹ گیا۔

اپنے خیالوں میں گم کھڑی مقدس خوشنود کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ سکی نہ جھجک کے دو قدم پیچھے ہٹنا محسوس کر سکی۔ اس کی تمام تر حسیات تو سامنے موجود مومنہ علی کی طرف متوجہ تھیں۔ اپنے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھر کے واپس جاتے ڈاکٹر خوشنود کی طرف تو اس کا دھیان ہی نہ گیا۔

☆☆☆

''سب کچھ کتنا واضح تھا، بالکل صاف...... نجانے مجھے سمجھنے میں وقت کیوں لگا۔ اتنا وقت...... اتنے وقت میں تو اب...... اب کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔'' پی سی میں بک اپنے کمرے میں آ کے خوشنود نے نئے سرے سے اس سارے قصے کو سمجھنا چاہا۔

''تو وہ ان کی بیٹی ہے یعنی صرف ان کی نہیں بلکہ خان زریاب خٹک کی۔

کیا ضرور اسے ہی خٹک خاندان کی بیٹی ہونا تھا؟

اور کیا یہ بھی ضروری تھا کہ اس شخص کا حوالہ اس کے ساتھ ہوتا؟

اور ضروری تو یہ بھی نہیں تھا کہ ساری دنیا چھوڑ کے تمہارا دل ایک اسی لڑکی پہ آتا ڈاکٹر خوشنود علی وردگ......

لیکن......

تقدیر اپنے فیصلے، سارے نفع نقصان ذہن میں رکھ کے نہیں کرتی۔ اسے پیچیدگیاں پیدا کرنے کا شوق ہے۔ اچھی بھلی سیدھی سادی چلتی کہانی میں موڑ لانا تو قسمت کی پرانی عادت ہے۔'' وہ بے بسی سے آنکھوں پہ بازو رکھ کے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ خون کا معاملہ تھا...... خون کا نہ رنگ بدلا جا سکتا ہے نہ تاثیر۔

مقدس کی رگوں میں دوڑنے والا خون اس شخص کا تھا جس کے ہاتھوں میں فیروز علی وردگ کا خون لکھا تھا۔ اور فیروز علی وردگ کا خون خود خوشنود علی وردگ کے جسم میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

خون کی یہ تاثیر تھی کہ جس کے خوف سے اس کی ماں لالئی بی بی نے اسے اپنی آنکھوں سے دور کر لینا گوارا کر لیا۔ وہ ڈرتی تھیں کہ سیدو شریف کی فضاؤں میں موجود فیروز کی جوان اور المناک موت کے نوحے کہیں اس کے کچے ذہن کے خوشنود کو اس راہ پہ نہ چلا دیں جس پر چلنا پختون اپنی شان

تصور کرتے ہیں ایسے میں وہ خود کو صرف ایک غیرت مند پختون کی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی کا سہاگ بھی ہیں، کسی کی گود کا پھول بھی ہیں، کسی بہن کی تمام تر امیدوں کا مرکز بھی ہیں۔

لائی بی بی خود بھی ایک سچی پختون زادی تھی، آن، بان اور وقار پہ سب کچھ نچھاور کر دینے والی لیکن ممتا کا جذبہ کب اس کے سارے جذبات پہ حاوی ہو گیا اسے پتا ہی نہ چلا وہ شوہر کے بعد اب بیٹے کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی، پھر فیروز کے ساتھ سات سالہ رفاقت نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ خود فیروز اپنے قبیلے کے دیگر مردوں سے کس قدر مختلف المزاج ہے۔ اپنے بھائیوں کی بانسبت وہ اپنے کمسن بیٹے کے پہلے بار فائر کرنے پہ جشن منانے کے بجائے اس کی تعلیم پہ زیادہ توجہ دیتا۔ اس نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا کے کچھ بنانے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔ اس حقیقت سے سب ہی واقف تھے۔ لائی بی بی نے سسر اور باپ کے آگے گڑگڑا کر فیروز کے خوابوں کو پورا کرنے کی بھیک مانگی، انہیں احساس دلایا کہ فیروز جیسے محبتوں سے گندھے حساس شخص کی رُوح کی تسکین اس کے خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہے، نہ کہ خون کی ندیاں بہا کے جذبہ انتقام کو پورا کرنے میں، لڑکپن میں ہی بیرون ملک حصول تعلیم کے لیے چلے جانے والا خوشنود علی تمام تر حقیقتوں سے آگاہ تھا۔ اس کا باپ عین عالم شباب میں محض ایک عہد کی پاسداری میں اپنے سب سے قریبی دوست کے ہاتھوں، غداری اور بے وفائی کا مکروہ الزام لے کر مارا گیا۔ لیکن وہ عہد کیا تھا اور وہ الزام کیا تھا اس سے وہ اب تک انجان ہی رہا۔ اس کی ماں اسے ہر بات سے انجان ہی رکھنا چاہتی تھی، وہ تو شاید یہ سب بھی اس تک نہ پہنچنے دیتی لیکن دادا اور چچاؤں کی جانب سے اسے ہمیشہ اُکسا دینے والی معلومات ملتی رہتیں، وہ خود بھی اب تک دل میں بدلے کی چنگاری سلگائے بیٹھے تھے اور فیروز کے اکلوتے بیٹے کی جانب سے بھی ایسی ہی خاندانی شان و جلال کی توقع رکھتے تھے لیکن لائی بی بی کا فیصلہ بروقت تھا اور اقدام بالکل درست۔ آزاد فضا کی وسیع النظری نے اس کے اندر جذبہ کو زیادہ پنپنے نہ دیا۔ وہ مسیحائی کا وصف لے کر وطن لوٹا تھا۔

حویلی میں ہونے والی چہ میگوئیوں کو وہ سر جھٹک کے نظر انداز کرتا رہا۔ اسے احساس تھا کہ اتنے سالوں بعد بھی اس کے ضعیف دادا یہ کاری ضرب بھلا نہیں پائے اور چچا، تایا اپنے اپنے کنبوں اور کاروباروں میں مشغول ہو گئے پھر بھی اب تک گھات لگائے بیٹھے ہیں اس نے اپنے رویے سے ان کی ہر طرح کی توقع کو مسترد کر دیا اور پورے دھیان کے ساتھ ''فیروز ہاسپٹل'' کی تیاری میں مگن ہو گیا۔ لائی بی بی نے اسے جو تربیت دی تھی اور روشن خیال باپ کے خون کی جو تاثیر اس میں موجود تھی اس کے زیر اثر باپ کی محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کا اسے اس سے بہتر حل کوئی نظر نہ آیا۔ اسے نہ تو باپ کے قاتل سے کوئی سروکار تھا نہ ہی بدلہ لینے کی تڑپ تھی اور یہ تو اسے اس دن پتا چلا کہ بظاہر انجان بنے رہنے کے باوجود اس کے اندر کہیں بہت اندر نفرت کی جڑیں موجود ہیں۔

وہ کچھ مشینری کے سلسلے میں سنگاپور روانہ ہونے والا تھا کہ سیدو شریف سے جان محمد اپنی خان بی بی کا رازدارانہ پیغام لے کر پہنچا۔

''اس خط کے ساتھ موجود دوسرے رقعے میں اس عورت کا پیغام اور پتہ موجود ہے جس کی مرتے دم تک مدد کرنے کا تمہارے مرحوم باپ نے عہد کیا تھا۔ فیروز علی وردگ کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے میں اس کے تمام عہد نبھانے کی پابند ہوں اور تمہاری ماں ہونے کی حیثیت سے تمہیں حکم دینے کی مختار بھی۔ یہ عورت جسے تمہارے مرحوم باپ نے تحفظ اور عزت دینے کا عہد کیا تھا اور اسی عہد کو نبھاتے وہ اپنی جان بھی گنوا بیٹھا، تمہارے لیے

قابل احترام ہے۔ اس تک فوراً پہنچو اور اپنی خاندانی روایات کے مطابق عہد کی پاسداری کا فریضہ نبھاؤ۔''

وہ الجھا اور ساتھ میں موجود شکستہ تحریر والے مختصر سے خط کو پڑھنے لگا۔

''تم سے رخصت ہوتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ تمہیں ضرور پکاروں گی۔ میں شاید اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہوں اور میں نے یہ جان لیا ہے کہ انسان کی اپنی شناخت اور کچھ نہیں، سوائے اس کے اپنوں کے، نہ مٹی نہ خون، محبت کے جذبے کے رسوا ہونے کے بعد میں نے خون کے رشتوں میں پناہ لینا چاہی۔ انسانوں کے اس جنگل میں محض اس لیے آن بسی کہ یہاں میری جڑیں ہیں۔ میرے باپ کی میرے دادا کی...... یہ شہر مجھے قبول کرلے گا۔ اس شہر نے میرے وجود کو دنیا سے چھپا تو لیا لیکن گلے نہ لگایا۔ گلے لگانے کے لیے مجھے آج بھی اپنی مٹی کی ضرورت ہے اور اس مٹی کو ڈالنے کے لیے کسی اپنے کی مٹھی کی۔

میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی بس تمہیں اس عزت کا واسطہ جو فیروز لالہ نے مجھے دی تھی اور اس محبت کا واسطہ جو اس کے حوالے سے میں نے تمہیں دی تھی، مجھے بے یار و مددگار مرنے مت چھوڑنا۔ میں چاہتی ہوں کہ پہاڑوں کے بیچ ہی سہی میری بھی ایک قبر ہو، اپنے بات کی طرح۔ جہاں چند لوگوں کو ہی سہی مگر کسی کو خبر تو ہو کہ اس مٹی کے نیچے میں سو رہی ہوں......

فقط ایک فاتحہ اور ذرا سی زمین کی طلب گار۔

مومنہ

اس نام سے تو وہ بخوبی واقف تھا اور اس نام کے ساتھ ایک اور نام بھی تازہ ہو جاتا تھا، خان زریاب خٹک کا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خان زریاب کے ہاتھوں اس کے بابا جان کے مارے جانے میں اس عورت کا کردار کیا رہا ہے۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ ماں نے ہمیشہ مومنہ نامی خاتون کا غائبانہ تعارف اس سے بڑے احترام اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ زریاب خٹک جیسے درندے سے اتنی نفرت تو پھر اس کی بیوی کا ذکر اتنے اچھے الفاظ میں کیوں؟

اب بھی ماں کا حکم نامہ پڑھ کے وہ اُلجھ گیا۔ اسے لائی بی بی کی یہ بے مقصدی خواہش سراسر فضول لگ رہی تھی۔ اگر وہ لب گور پڑی اس عورت کے کفن دفن کا بندوبست ہی کرنا چاہتی ہیں تو کسی بھی قابل اعتماد ملازمہ کے ہاتھوں یہ فریضہ ادا ہوسکتا ہے۔ جان محمد بھی یہ کام کرسکتا ہے۔ اس نے فون پہ ہلکا سا احتجاج کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔

''اس نے کسی اپنے کی خواہش کی ہے خوشنود اور بھائی کے بعد اس کی اولاد سے زیادہ اور کون اپنا ہوسکتا ہے۔ تم بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً لاہور پہنچو، ہوسکتا ہے اسے تمہاری ہی ضرورت ہو اور اس کی سانسیں کچھ دن اور رہ جائیں۔''

بڑی ہی بے دلی سے وہ اپنا سارا پروگرام اپ سیٹ کرکے لاہور جانے کے لیے نکلا۔ وہاں دیئے گئے ایڈریس پہ پہنچ کر ایک اجنبی زبان والی کرخت مزاج عمر رسیدہ خاتون سے بڑی دقت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کر پایا۔ وہ اسے لے کر سروسز ہاسپٹل لے آئی جہاں کوریڈور میں زمین پہ پڑی اس عورت کی حالت دیکھ کے وہ دہل گیا یہ تو وہ جانتا تھا کہ سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کا ''مفت علاج'' کس طرح ہوتا ہے لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اگر غریب کے ساتھ ساتھ کسمپرسی اور لاوارثی بھی ہو تو مریض کو اس طرح بے یار و مددگار ننگے فرش پہ مرنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

اس وقت اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا مریض ہے جیسے مریضوں کے لیے اس نے فیروز ہاسپٹل بنانے کا خواب دیکھا ہے۔ شیخ زید ہاسپٹل میں محمود غزنوی کو وہ جانتا تھا جو اس کے ساتھ لندن میں ہوتا تھا وہ بچی کھچی سانسیں لیتے اس نڈھال سے وجود کو وہیں لے گیا۔ محمود کے دماغ میں بھی موت سے لڑنے کا سودا سمایا تھا۔ اس نے ایک چیلنج کی طرح اس مریضہ کو قبول کیا جس کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ تھا اور جو دل کے انتہائی شدید دورے کے بعد کوئی مناسب طبی سہولت میسر نہ ہونے کے بعد بھی زندہ تھی اور اسے مزید کچھ دن بھی زندہ رکھنا ایک امر دشوار تھا لیکن شاید خدا نے اس کی عمر بڑھا رکھی تھی یا اس کے حصے کے کچھ مزید تماشے دیکھنے رہتے تھے کہ خوشنود اور محمود کے اندر کے ضدی ڈاکٹر تھک کے ہار نہ مان رہے تھے۔

سنگاپور جانا، ہاسپٹل کے دیگر معاملات، خوشنود کو کچھ بھی نہ یاد رہا۔ رہی سہی کسر اتفاقیہ ملنے والی مقدس نے پوری کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے اس نئے اور خوش کن موڑ پہ حد سے زیادہ حیران تھا۔ ابھی تو وہ دل میں پنپنے والے نئے نویلے سہانے سے جذبے کو محسوس کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا ابھی تو وہ آنکھوں کی چتلیوں میں ڈولتے اس عکس کے رنگ بھی نہیں گن پایا تھا کہ یہ ایک جھٹکا......

اس کی ذہنی رو پھر سے چند منٹ پہلے ہاسپٹل میں پیش آنے والے واقعے کی طرف چلی گئی۔

''مما......!'' یہ ایک لفظ اسے خود سے کتنی دور لے گیا تھا جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنی اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

جب وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے پانا کتنا سہل لگتا تھا۔

اور اب جب وہ اس کے بارے میں سب جان گیا ہے تو اسے سوچنا بھی ایک ناگوار امر محسوس ہو رہا ہے۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ بدلے اور انتقام کی تپش اس کے دل تک نہیں پہنچ پائی۔ یہ بھی درست کہ اس کی مسیحائی کی طرف مائل فطرت کسی کا خون بہانے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت کہ ماں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم نے اسے عداوت و حقارت کے جذبے سے کوسوں دور ہی رکھا لیکن پھر بھی...... پھر بھی کیا وہ اپنے اندر یہ تسلیم کرنے کی ہمت پا سکے گا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کی بیٹی سے محبت کرنے لگا ہے۔ ''نہیں ہرگز نہیں۔'' اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''میں کچھ بھی کر لوں اتنا اعلیٰ ظرف تو کبھی نہیں ہو سکتا۔'' اس نے خود سے ہار مان کے اپنی کمزوری تسلیم کی۔

ٹرن......ٹرن فون کی بیل پہ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے۔ دوسری جانب ڈاکٹر محمود غزنوی کی پر جوش آواز تھی ''خوشنود علی، معجزہ ہو گیا...... میں اسے معجزہ ہی کہوں گا۔ تمہاری پیشنٹ مومنہ خاتون آج آئی سی یو سے پرائیویٹ روم شفٹ کر دی گئی ہے۔ انہیں ہوش آ گیا ہے۔ میرے خدشے کے برعکس وہ کومے میں نہیں گئیں اور نہ ہی ان کی ذہنی حالت کو کوئی فرق پڑا ہے تم چاہو تو ابھی ان سے مل سکتے ہو۔''

نڈھال سا پڑا خوشنود نئے سرے سے پر عزم ہو گیا۔ وہ یہاں ایک مرتی ہوئی عورت کی آخری خواہش پوری کرنے آیا تھا، لیکن قدرت نے اسے سالوں سے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ اس موقع کو گنوانا نہ چاہتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ اس کے روبرو تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں گھٹنوں میں سر دیئے زاروقطار روئے جا رہی تھی اور شناور اسے خاموش کرانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کے اب خود رو دینے والی ہو رہی تھی۔

''مقدس، اپنی جان لے لوگی تم یوں رو رو کے۔ آخر بتاتی کیوں نہیں؟ کہاں گئی تھیں تم؟''

''میں ہاسپٹل گئی تھی شانو اور...... اور وہ میری مما ہی ہیں۔'' اس نے بدقت چند الفاظ کہے اور پھر سے ہچکیاں بندھ گئیں۔

''وہی میری مما ہیں...... میں فوراً پہچان گئیں انہیں دیکھتے ہی۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتیں ورنہ شاید وہ بھی مجھے پہچان لیتیں، لیکن نہیں...... پہچانتے تو انہیں ہیں جنہیں یاد رکھا جائے، وہ بھلا کہاں یاد رکھ پائی ہوں گی کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اگر وہ تمہاری ماں ہیں تو پھر...... خیر یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کیسے جانتے ہیں اماں مومنہ...... میرا مطلب ہے آنٹی کو؟'' اس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔

کچھ اندیشے تھے جو اسے کھل کے ماں کے ملنے کی خوشی بھی نہ منانے دے رہے تھے۔ وہ ان خدشات کا اظہار کر کے اپنی ذات کو کسی کی نظروں میں بے وقعت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مقابل شناور گل تھی جو اس کی تہہ سے بھی اصل بات کھوج لاتی۔ مسلسل سوال کر کر کے اس نے یہ اگلوا ہی لیا کہ ڈاکٹر خوشنود علی، فیروز وردگ کا بیٹا ہے۔ اس فیروز وردگ کا جس کے بےلوث دوستی کے قصیدوں سے اس کے بابا جان کی ڈائری بھری پڑی ہے اور اس فیروز وردگ کا بیٹا جس کے ذکر سے اس کے گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ جس کے نام کی دہشت سے بی بی جان اور تایا جان اپنے لاڈلے زریاب خٹک کی خیر مانگتے ہیں۔

''واٹ، ہاؤ سرپرائزنگ، کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ یوں پیچ در پیچ اتفاقات کی کڑی ملتے جانا۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قدرت خود تمہاری رہنمائی کر رہی ہے وہ خود ان رازوں کو تمہارے سامنے کھولنا چاہتی ہے اور تم بےوقوف یوں منہ اٹھائے واپس چلی آئیں کہاں تو ماں کی تلاش میں دیوانی ہو رہی تھیں اور کہاں ان کے ملتے ہی سب چھوڑ چھاڑ یہاں اندھیرے میں آنسو بہانے میں مگن ہو۔''

''تو کیا کرتی، میں جانتی ہوں اس اسرار کے پردے میں میرے لیے کوئی خوش کن انکشاف نہیں ہے۔ کاش مما مجھے ملتی ہی نہیں یا پھر...... یا پھر وہ مجھے زندہ نہ ملتیں۔'' اس نے بےرحمی سے کہا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بابا کی ڈائری نے میرے ذہن میں ان کا ایک پیکر تراش دیا تھا۔ خاندان بھر کی باتوں کو نظرانداز کر کے میں نے انہیں ہمیشہ ہی اپنے تصور میں ایک باوقار اور باوفا خاتون کی حیثیت سے سوچا۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کبھی اس کا یقین نہ آیا۔ لیکن...... شانو...... تم خود سوچو...... سارے زمانے سے کٹ کر...... اولاد اور شوہر کو بھلا کے...... زندگی کے اس انتہائی موڑ پہ آج اگر کوئی ان کے پاس ہے تو اسی شخص کا بیٹا جس کا نام ان کے ساتھ اتنی ذلت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں شناور کہ کہیں یہ سب سچ ثابت نہ ہو جائے۔''

''خوامخواہ کے اندیشے ہیں تمہارے دل میں، میری یہ بات یاد رکھو مقدس زریاب کہ ادھورا علم ہمیشہ تکلیف دیتا ہے۔ اگر تم اس گتھی میں

ہاتھ ڈال ہی چکی ہو تو اب اس کے تمام سرے سلجھانا تم پہ فرض ہے۔ اب سچ چاہے جو بھی نکلے اسے ہمت اور حوصلے کے ساتھ قبول کرو۔ لیکن پہلے سچ کی تلاش تو کرو ہو سکتا ہے سچ اس سے بالکل مختلف ہو جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اب تک ایسا کتنا کچھ ہو چکا ہے جو تمہاری توقعات کے بالکل برخلاف ہے۔ پھر اب ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ خود سے ہی منفی انجام فرض کر کے بیٹھ جانا حماقت ہے اور ماں جیسے رشتے پہ بغیر کسی واضح ثبوت کے اتنی بدگمانی سراسر گناہ ہے۔'' اس کے سمجھانے بجھانے پہ وہ پھر سے نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے پہ تیار ہوئی۔

☆☆☆

''فیروز لالہ......''

دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سامنے موجود اونچے لمبے سراپے کو دیکھ کے اس کے لبوں سے سرسراتا ہوا نام نکلا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلا مانوس چہرہ تھا جو اس نے دیکھا اور جسے دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ شاید ہوش میں وہ اب بھی نہیں آئی ہے۔ بے یقینی سے پلکیں جھپک کے اس نے دوبارہ غور کرنے کی کوشش کی، وہ چہرہ اور قریب آیا۔

''میں خوشنود علی ہوں اور میری ماں نے کہا تھا کہ میں آپ کو پھوپھی جان کہہ کے پکاروں۔'' بیڈ کے کنارے بیٹھ کے اس نے آہستہ آواز میں کہا تو اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی ہوش میں ہے۔ ڈرپس لگے ناتواں ہاتھ اٹھا کے اس نے اس چہرے کو چھونا چاہا۔

''خوشنود......اتنا بڑا......کتنا وقت گزر گیا......آہ۔'' اس کی ہلکی بھوری شہد رنگ آنکھوں کے گوشوں سے چند آنسو پھسل کے اس کے الجھے بالوں میں جذب ہو گئے۔ دھندلائی آنکھیں مسکرائیں۔

''تو تمہیں لالئی نے بھیجا ہے۔ میں نے اس سے کیا مانگا تھا اور اس نے کیا بھیج دیا۔ تم نے میری سزا اور بڑھا دی ہے لالئی۔ مجھے زندگی نہیں چاہیے تھی۔ مجھے چار پھولوں اور ایک عدد دعائے مغفرت کی حاجت تھی تم نے تو مسیحا بھیج دیا۔''

اس کا لہجہ حد درجہ صاف تھا۔ خوشنود کو حیرت ہوئی۔ خود اس کی ماں واجبی سا پڑھنے لکھنے کے باوجود اتنی صاف اردو نہ بول پاتی تھی جب کہ یہ پہاڑی علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی رواں اور شستہ اردو......شاید لاہور اتنا عرصہ رہنے کی وجہ سے ہے۔

''میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں پھوپھو جان۔'' مٹھی بھر ہڈیوں والا یہ بے بس وجود خود بخود اسے تکریم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''آہ......میں جانتی تھی کہ زندہ رہی تو ضرور کوئی نہ کوئی کچھ پوچھنے والا آئے گا۔ لیکن میرے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں، میں تو اب تک یہ بھی نہیں جان پائی کہ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں۔'' اس کی ذہنی رو نجانے کہاں بھٹک گئی۔ وہ کچھ نہیں سمجھا پھر کچھ لمحے رک کے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

''میں نہیں جانتا کہ خود کو چھپا کر رکھنے میں آپ کی کیا مصلحت تھی لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کے سینے میں چھپے چند حقائق بہت سی زندگیوں کو بھٹکنے سے بچا لیں گے۔ سالوں سے یہ سوال مجھے بے چین کیے ہوئے تھے۔ مختلف لوگوں کے پاس اس کے مختلف جواب تھے میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔ فیروز علی کا بیٹا ہونے کے ناتے مجھے اتنا حق تو ہے ناں۔'' اسے بولنے پہ آمادہ دیکھ کے خوشنود نے مزید کہا۔

''سب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ آپ کا بچ جانا ایک معجزہ ہے لیکن میں مانتا ہوں کہ یہ معجزہ صرف اس لیے رونما ہوا کہ آپ سچائی کو دنیا کے سامنے لاسکیں۔''

''ہر سچ سامنے لانے کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ سچ کڑوے گھونٹ کی طرح پی جانا پڑتے ہیں۔''

''نہیں، کرواہٹ کو پی جانا دانشمندی نہیں۔ اسے تھوک دینا چاہیے۔'' خوشنود نے کہا۔

☆☆☆

وہ کمرہ جو عرصے سے موت کی آہٹیں سن رہا تھا یک بیک چہکاروں سے گونجنے لگا۔ خان ارباب خٹک کا اجڑا ہوا بیمار کمرہ آج آباد تھا۔ ان کا بلڈ پریشر لخت جگر کو سامنے پا کے خوشی اور حیرت سے بلندی کو چھو رہا تھا۔ بوڑھا جھریوں زدہ چہرہ سرخ ہو کے دہکنے لگا تھا۔ جذبات کی زیادتی ان کی لکنت زدہ زبان کو اور بھی مجبور کر رہی تھی۔ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتے۔ زریاب باپ کا ہاتھ نم لبوں سے چوم کر رہ جاتا۔ ہر بار اس کی آنکھوں سے معافی کے خواستگار چند پشیمان سے آنسو ان کے ہاتھ تر کر دیتے۔

حضرتی بی بی کے چہرے سے وہ گھبراہٹ مفقود تھی جس نے گزشتہ کئی دنوں سے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ خان افراسیاب اور خان دراب سرخرو سے کھڑے باپ بیٹے کے والہانہ ملن کو دیکھ رہے تھے۔ نئی نسل کے بہت سے نمائندہ جنہوں نے اپنے ہوش میں پہلی بار خٹک فیملی کے منجھلے بیٹے کو دیکھا تھا فرط اشتیاق سے گھیرا بنائے کھڑے تھے۔

ان میں خان دراب کی بیگم بھی تھیں، واحد وہ تھیں جنہیں اس موقع پر مقدس کی غیر حاضری بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ بار بار زریاب کے چہرے کی جانب دیکھتیں شاید اب وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ پوچھے۔ انوشہ اور پلوشہ کو دیکھ کے اس کی آنکھوں میں تجسس اور اشتیاق کی ایک لہر آتے ضرور دیکھی گئی تھی لیکن اب باچا جان کی ناگفتہ بہ حالت شاید اس کا دھیان بٹنے نہ دے رہی تھی۔

''جی باچا جان، کہیے، کیا کہنا چاہتے ہیں، میں آپ کا مجرم ہوں، جو کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجئے۔ میں اس سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں۔''

لاغر باپ کی بے بسی اور بے چینی محسوس کر کے زریاب نے دونوں ہاتھوں سے انہیں تھام کے خود کو سزا کے لیے پیش کیا وہ باپ کی اس حالت کا سراسر قصوروار خود کو سمجھ رہا تھا۔ باچا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہ...... میں تم...... تمہارا...... تمہارا مجرم...... بس اس لیے زندہ...... تم...... تمہیں بتا دوں...... معافی...... معاف کر دو۔''

یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ تمام افراد کو ساکت کر گئے شاید باچا جان کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں۔ اس کا اندازہ کر کے افراسیاب خٹک نے انہیں آرام کا مشورہ دیتے ہوئے بی بی جان اور زریاب کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ارباب خٹک نے التجائیہ انداز میں بیٹے کا ہاتھ تھام لیا اور منت کے ساتھ اپنی شریک حیات کو دیکھنے لگے۔

''نہ...... نہ جاؤ...... میں ایسے نہیں مرنا...... پہلے یہ بوجھ...... موت...... آسان...... کر دو...... حضر...... حضرتی...... خدا کے لیے حضرتی......''

بی بی جان کا نظریں چرانا تینوں بیٹوں کو ٹھٹکنے پر مجبور کر گیا۔ زریاب تو ابھی خود سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا البتہ افراسیاب نے کسی

انہونی کے خدشے کے پیش نظر بچوں اور خواتین کو باہر جانے کا حکمیہ اشارہ دیا۔تائی جان سب کو لے کر خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔بی بی جان لرزتی ٹانگوں پہ ہاتھ رکھ کے صوفے پہ گر گئیں۔

''باچا جان کیا کہنا چاہتے ہیں بی بی جان؟'' خان افراسیاب خٹک کے لہجے میں کچھ تھا جو حضرتی بی بی کے سرخ وسفید چہرے پہ زردی چھا گئی۔

''حضرتی...... بتادو...... تم کو اللہ کا واسطہ...... یہ اولاد...... کا بھلا...... گناہ...... گناہوں کا کف...... کفارہ...... سب بتادو...... اب تو سب...... کچھ...... بتادو......'' بولتے بولتے وہ ہانپنے لگے۔اچانک بی بی جان دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگیں۔زریاب مچل کے اٹھا۔

''بس کریں بی بی جان...... خدارا یوں مت روئیں اور آپ لالہ...... آپ بھی بس...... باچا جان بیمار ہیں...... کمزور ہیں ہم نہیں جانتے وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ بی بی جان پر تو دباؤ مت ڈالیں وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔''

''نہیں زریاب، میں پریشان نہیں، پشیمان ہوں...... خان جی ٹھیک کہتے ہیں کم از کم اب تو...... زندگی کے ان آخری دنوں میں اب تو مجھے سچائی سب کے سامنے لے آنی چاہیے۔کاش میں نے پہلے ہی ان کی بات مان لی ہوتی تو اتنا کچھ نہ کھونا پڑتا۔اک ذرا کچھ بچانے کے لیے میں نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔اپنا گھر، تمہارا گھر، تمہیں، خان جی کو...... اب بھی شاید میرے بتانے سے کچھ بچ جائے میرے پاس نہ سہی تمہارے پاس ہی سہی۔''

ان کی نظریں بیٹے کے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔

''بی بی جان...... میں بہت شکستہ ہو چکا ہوں...... کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی یہ دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔مجھے مزید مت الجھائیں میرا دماغ پھٹ جائے گا۔جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔''



عشق کا قاف

عشق کا قاف سرفراز راہی کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ع ش ق...... عشق...... ازل سے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا یہ جذبہ جب جب اپنے رخ سے حجاب سرکاتا ہے' انہونیاں جنم لیتی ہیں۔مثالیں تخلیق ہوتی ہیں۔داستانیں بنتی ہیں۔''عشق'' کی اس کہانی میں بھی اسکے یہ تینوں حروف دمک رہے ہیں۔''عشق کا قاف'' میں آپ کو عشق کے عین' شین اور قاف سے آشنا کرانے کے لئے سرفراز راہی نے اپنی راتوں کا دامن جن آنسوؤں سے بھگویا ہے۔اپنے احساس کے جس الاؤ میں پل پل جلے ہیں' ان انگارہ لمحوں اور شبنم گھڑیوں کی داستان لکھنے کے لئے خون جگر میں موئے بیان کیسے ڈبویا ہے' آپ بھی اس سے واقف ہو جایئے کہ یہی عشق کے قاف کی سب سے بڑی دین ہے۔

''میرا سب سے پہلا رشتہ اجنبیت کا تھا۔'' مومنہ نے بتانا شروع کیا۔

''سب سے پہلے جو احساس میرے دل میں جاگا وہ اجنبیت کا تھا۔ جو فضا میرے آس پاس موجود تھی وہ اس فضا سے الگ تھی جس کی باس مجھے اپنے باپ سے آتی تھی۔ میرا باپ جس زبان میں مجھے گلے یاد کراتا تھا جو اس زبان سے الگ تھی جس میں میری ماں مجھے لوریاں دیتی تھی۔ اپنے گرد و پیش سے یہ اجنبیت اور بڑھ گئی جب بہت پہلے میری ماں کا انتقال ہوا میرے باپ نے میرے گرد اپنا دائرہ اور محدود کر دیا وہ مجھے اجنبی ہواؤں، اجنبی صداؤں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

میری ماں کالاش کے پہاڑوں کی رہنے والی تھی، کافر قبیلے سے تعلق تھا اس کا اور میرا باپ پنجاب سے تعلق رکھتا تھا، اپنی جوانی میں لاہور سے کالام گھومنے آیا اور میری ماں کا اسیر ہو کے یہیں کا ہو رہا۔

یہ وادی پیار محبت کے متوالوں کے لیے بڑی سازگار ہے۔ دیوار نہیں بنتی فقط چند پابندیاں لگاتی ہے۔ میرے باپ نے یہ پابندیاں قبول کر لیں جو اس وقت اسے بہت سہل معلوم ہوتی تھیں لیکن میری پیدائش سے وہ سہم گیا اس کے اندر کا مسلمان باپ فکر مند ہو گیا۔ وہ ہر وقت مجھے کافر رسم و رواج سے بچانے کی سعی میں مگن رہتا۔ میری ماں کی موت نے اس کے لیے واپسی کی راہ کھولی لیکن نجانے وہ کون سی نادیدہ بیڑیاں تھیں جنہوں نے اس کے پیر بمبوریت کی وادی سے باندھ دیے تھے۔

میں اس وادی میں رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھی۔ سب سے کٹ کے رہنے میں جو اذیت ہے اس کا مزا میں آج سے نہیں لے رہی یہ تو میرے بچپن کا تجربہ ہے۔ تنہائی نے ایک نشے کی طرح ایک لت کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ یہ تنہائی تب اور تکلیف دہ ہو گئی جب ابا بھی مجھے چھوڑ کے چلا گیا اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی نہ مرتا۔ آخری دنوں میں ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے یہ شرمندگی کہ محض میری ذات کی وجہ سے ابا اپنے عشق کو غلطی کہنے پہ مجبور ہو گیا۔

مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی صرف میری وجہ سے اس لازوال عشق پہ یہ دھبا۔

ابا پچھتا رہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کیوں نہ مجھے لاہور لے گیا۔ شاید اس کے رشتے دار بھی مجھے تسلیم نہ کرتے لیکن ابا کو یہ اطمینان تو رہتا کہ وہ کلمہ گو لوگوں میں اپنی بیٹی چھوڑے جا رہا ہے۔ میرے ہر طرح سے یہ یقین دلا دینے پر کہ میں ہر حال میں اسلام پہ قائم رہوں گی کسی کافر سے شادی نہیں کروں گی، ابا نے سکون سے آنکھیں موندیں بعد میں مجھے لگا ابا کے خدشے تقریباً بے بنیاد تھے۔ بستی کے لوگ جاہل تھے، کافر تھے، جنگلی تھے مگر پیارے تھے۔ جو پیار کرتے ہیں انہیں پیارے ہی کہا جاتا ہے ناں، کسی نے میرے ایمان کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔

میں اجنبیوں کے درمیان بھی بڑی سہولت سے زندگی گزار رہی تھی کہ ایک دن وہ آیا جسے پہلی نظر دیکھ کے ہی مجھے سالوں سے روز فجر سے مانگی اپنی دعاؤں کے پورا ہونے کا یقین آنے لگا۔ وہ زریاب تھا۔ جس نے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھ کے مجھ سے اپنا رشتہ اور پکا لیا۔ میں اسے چاہنے لگی ویسے ہی جیسے کوئی بھی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ بغیر کسی طلب کے، بغیر کسی چاہ کے، بغیر کسی صلے کے...... میں اسے چپ چاپ چاہتی رہتی تا عمر، چاہے وہ چاہتا یا نہ چاہتا، چاہے یہاں رہتا چاہے چلا جاتا۔ مجھے کوئی فرق نہ پڑنے والا تھا۔ لیکن ایک عجیب سی بات ہوئی اسے بھی مجھ سے چاہت ہو گئی۔ لیکن

یہ ویسی چاہت نہ تھی جیسی کسی کو بھی کسی سے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ضدی خان زادے کی چاہت تھی جو ہر من چاہی چیز کو اپنا دیکھنا چاہتا ہے۔

میری محبت ایک بنجارن محبت تھی، عاجز، مسکین، ہر حال میں راضی خوشی رہنے والی صابر شاکر محبت اور اُس کی محبت نوابی تھی، جلالی تھی، طوفانی تھی سب بہا کے ساتھ لے جانے والی۔ اسے اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ میں اس کی ہو کے رہوں یا اس وادی کی۔ یہ فخر مجھے اونچا کر گیا لیکن میں کم ظرف نہ تھی اپنے ابا کا حشر دیکھ چکی تھی۔ مرتے دم بھی اس کی آنکھوں میں جو پچھتاوے تھے اس نے مجھے محتاط کر دیا تھا اور میں نے عشق اور ذہن کو الگ الگ رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن زریاب کے لیے عشق ہی سب کچھ تھا، عشق ہی سانس، عشق ہی آس، عشق ہی زندگی اور عشق ہی موت، وہ وصال کے بغیر عشق کو سوچنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔

اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ میں چاہتی تو ایک جست لگا کر اس اجنبی دنیا سے نکل سکتی تھی لیکن میں نے اور بھی بہت کچھ سوچا۔ اگر میں زریاب کو اپنے ابا کی طرح یہاں رہنے پر مجبور کرتی تو ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جاتی۔ میں جانتی تھی وہ اپنے عشق اور طلب میں اتنا دیوانہ تھا کہ سب عیش و آرام ترک کر کے میرے پاس پہاڑوں پہ بنے لکڑی اور گارے کے مکان میں زندگی گزارنے پہ تیار ہو جاتا لیکن میرا عشق اپنی ماں کی طرح خود غرض نہ تھا۔

میں جانتی تھی چند سال بعد اپنے خون کے رشتوں سے جدائی اسے ابا کی طرح ادھورا انسان بنا دے گی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس کے دل پہ تو شاید میں حکمرانی کر لوں لیکن اس کے گھر میں مجھے ایک ان چاہے فرد کی حیثیت حاصل رہے گی۔ مجھے اپنی انا اور ذات کا غرور ہمیشہ بہت عزیز رہا ہے۔ ان سر بلند پہاڑوں اور اونچے پیڑوں کی سنگت نے اپنی ہی خوشبو پیدا کر دی تھی مجھ میں، مجھ سے کسی کی ٹیڑھی نظریں برداشت ہوتی تھیں نہ ہی کسی کی اٹھی انگلی۔ مجھے اکیلا رہنا منظور تھا لیکن کم حیثیت زندگی نہیں۔ میں محبت کے بدلے رسوائی اور بے عزتی قبول کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی وہ صرف مجھے محبت دے سکتا ہے اپنے اعلیٰ نسب گھرانے سے وقار نہیں دلوا سکتا۔ بے توقیر ہو کے رہنا مجھے منظور نہیں تھا اس لیے اس کی ہر درخواست میں نے رد کر دی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا عزیز دوست فیروز اس کی حالت برداشت نہ کرتے ہوئے مجھے سمجھانے چلا آیا۔ بڑے ہی ولولے اور اپنائیت کے ساتھ وہ اپنے دوست کی وکالت کرتا رہا لیکن میرے نقطہ نظر واضح کر دینے کے بعد ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے لگا جو بات زریاب کو سمجھانے میں ناکام رہی ہوں، وہ بات فیروز سمجھ گیا ہے۔ میں نے اسے مزید قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آج اجنبی لوگوں کی یہ بستی میری سرپرست تو ہے میں اسے چھوڑ کے زریاب کے ساتھ چل پڑوں تو بالکل ہی لاوارث اور بے سائبان کہلاؤں گی۔ زریاب کی دنیا میں صرف میں اور وہ ہی نہیں ہوں گے اس کا پورا خاندان ہوگا۔ اس بھری پری دنیا میں میں زریاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی اور مجھ سے مشکل چیز اور کون سی ہے جسے سانس لینے کے لیے بھی عزت کی ضرورت ہے، عزت میری بھوک ہے لالہ، وقار میری پیاس ہے، محبت صرف عادت، عادت اور ضرورت کے بغیر رہا جا سکتا ہے بھوک اور پیاس سے کوئی کتنی دیر لڑ سکتا ہے۔ میں کم فہم یا خوش فہم نہیں ہوں جانتی ہوں میں ایک حقیر بے مایہ سی پہاڑن ہوں اور زریاب کے مقابلے میں تو بالکل بھی کچھ نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر قدم پہ مجھے اپنی کم مائیگی

کا احساس دلایا جائے۔ ان پہاڑی کم حیثیت لوگوں میں میں بہت خوش ہوں۔ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں، میری ماں کو، میرے باپ کو، میری اور میرے خاندان کی تعظیم کرتے ہیں میں پورے وقار کے ساتھ اس بستی میں بغیر کسی دلی وابستگی، خونی رشتے اور محبت کے زندہ ہوں لیکن وہاں زریاب کی عالی شان حویلی میں میں کس حیثیت سے داخل ہوں گی۔''

''فیروز علی وردگ کی بہن کی حیثیت سے۔'' اس کے فیصلہ کن انداز نے مجھے چونکنے پہ مجبور کر دیا اور ابھی میں سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اس کا مضبوط ہاتھ میرے سر پہ ٹھہر گیا۔

''تم نے جتنی بھی بار مجھے لالہ کہہ کر پکارا مجھے خود پہ فخر محسوس ہوا ہے مومنہ۔ زریاب سے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا لیکن خود تم سے مل کر احساس ہوا کہ تم کیسا نایاب گوہر ہو۔ جو عورت محبت پر عزت کو ترجیح دیتی ہو، جو آسائشات سے بھری زندگی محض وقار کے لیے ٹھکرا دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ اس عورت کی عزت بھی کی جاسکتی ہے۔ آج اس لمحے میں نے اپنے دل میں تمہارے لیے بے پناہ عزت واحترام محسوس کیا ہے اتنا کہ جتنا میرے دل میں اپنی ماں کے لیے ہے۔''

اس کی انتہا پسندی مجھے ہواؤں میں اڑانے لگی۔

''لیکن تم مجھ سے چھوٹی ہو اس لیے میں تمہیں بہن کہوں گا۔''

''لالہ.....!'' سسکیوں کے درمیان میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔ اس کا ہاتھ میرے سر پہ ہنوز آسمان کی طرح سایہ کیے ہوئے تھا۔ ابا کے بعد زریاب وہ واحد شخص تھا جس سے لگاؤ اور انسیت سے بڑھ کے کچھ محسوس کیا تھا میں نے، جس کی محبت کو پور پور اتار کر میں شانت ہو گئی تھی لیکن رشتہ اور مان محبت سے کہیں بڑھ کے طمانیت بخش ہوتا ہے یہ مجھے اب اندازہ ہوا۔ فیروز نے مجھ سے یہ مقدس رشتہ جوڑ کے مجھے معتبر کر دیا تھا۔

''اور ایک بھائی ہونے کے ناتے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ تمہارا نکاح آج ہی خان زریاب خٹک سے کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے کہ تم میری نیت پہ شک کرو میں یہ واضح کر دیتا ہوں کہ تم نکاح کے بعد میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ زریاب کے والدین میرے پاس آ کر باقاعدہ تمہارا رشتہ طلب کریں گے اور میں ایک باپ کی طرح اپنے گھر سے تمہیں رخصت کروں گا۔'' اس نے بڑے استحقاق سے فیصلہ سنایا۔

''میں یہ عہد کرتا ہوں مومنہ علی کہ میرا گھر تمہارے لیے ہمیشہ میکے کی طرح آباد رہے گا، چاہے میں رہوں یا نہ رہوں۔ اس گھر سے تمہیں میکے کا تمام تر مان اور وقار ملے گا۔ تمہارے نام کے ساتھ اب فیروز علی وردگ کا بھاری بھر کم حوالہ ہے۔ تم زریاب خٹک کے گھر کم حیثیت اور ان چاہے فرد کی حیثیت سے داخل نہیں ہو گی۔ یہ میرا، ایک خالص پختون زادے کا عہد ہے۔''

اور میں اس عہد پہ ایمان لا کے ہامی بھر بیٹھی، عورت بھی کتنی عجیب چیز ہے، محبتوں کے بارے میں لاکھ شدت اور انصاف پسندی کا دعویٰ کرے، کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار ہی دیتی ہے، میری ماں اپنے عشق میں اتنی سچی تھی کہ موت کو گلے لگا بیٹھی لیکن جیتے جی ابا کے لیے اپنے رشتے داروں کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ کر سکی اور میں...... زریاب خٹک کے لیے...... اپنے محبوب کے لیے اتنی بے لوث ہو کر سوچتی تھی کہ خود کو تباہ کر لینا منظور تھا، اسے کسی امتحان میں ڈالنا گوارا نہ تھا، میں ڈرتی تھی میری شدت پسندی اور انا پرستی اس کے لیے مسائل کھڑے نہ کر دے اس لیے خود کو محروم کرنا گوارا کر

لیا تھا میں نے اور فیروز خان اس کی بارے میں کتنی خود غرض بن گئی...... یہ نہ سوچا کہ مجھے تحفظ دینے کا عہد کرنے والا کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔اس نے میرا اعتماد بحال کیا اور میں نے بڑی آسانی سے اپنا ہر اچھا برا اسے سونپ کر خود کو بے فکر کر لیا۔ پھر وہی سب ہوا جیسا اس نے طے کیا تھا۔ چند مشکلات کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میں چند ہی دنوں میں بیاہ کر زریاب کی حویلی آ گئی اور پھر وہ دور شروع ہوا جو میری زندگی کا سب سے حیران کن دور تھا۔

تم جاننا چاہو گے کہ حیران کن کیسے؟ تو وہ اس طرح کہ میرے تمام تر خدشے بھر بھری ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ نہیں ایسا نہیں تھا کہ زریاب کے گھر والوں نے مجھے با آسانی اور کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ وہاں میرے لیے سرد مہری تھی، اجتناب تھا۔ زریاب کی بی بی جان مجھے مسلمان ماننے پہ تیار نہ تھیں وہ اور ان کی خاص ملازمائیں تک باقاعدہ مجھ سے کتراتیں۔ کوشش کی جاتی کہ میں اپنے کمرے تک محدود رہوں لیکن جانتے ہو حیران کن بات کیا تھی...... وہ یہ کہ یہ تمام اہانت آمیز رویے بھی مجھے بھڑ کا نہ سکے۔ میں جو اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں سرد رویے مجھے بے موت نہ مار دیں ہر کسی سے انجان ہو کر رہ گئی عجیب کھوئے کھوئے دن تھے۔

مجھے سوائے زریاب کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا، کچھ سنائی نہ دیتا۔ کون مجھے ہندنی کہہ کے پکارتا کہ کوئی کافر کہہ کر، احساس ہی نہ ہوتا مجھے برتنوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی لیکن مجھے اس میں بھی کوئی ہتک محسوس نہ ہوتی۔ میری نماز روزے کو ڈھکوسلا کہا جاتا، میں پروا نہ کرتی، شاید اسی کو نشہ کہتے ہیں اور شاید اسی لیے نشے کو بے غیرتی اور ذلت کہا جاتا ہے۔ نشہ چاہے محبت کا ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جو جنگلی پیڑوں کی طرح سربلند اور اکھڑ تھی، وادی کے بادلوں جیسی شفاف تھی، اتنی بے گانگی اور ذلت و تحقیر برداشت کرتی رہی، زریاب سے کبھی ایک لفظ تک نہ کہا۔ وہ پاس ہوتا تو مجھے کسی بات کا ہوش ہی کہاں ہوتا تھا۔

میں بنجارن تھی تو محبت بھی کشکول کے سکوں کی طرح گن گن کر کرتی تھی، حویلی میں آئی تو مٹھیاں بھر بھر کے نچھاور کرنے لگی۔ زریاب کی طرح میرا عشق بھی بلاخیز ہو گیا۔ میں...... مومنہ علی جو عزت کو اپنی بھوک اور تعظیم کو اپنی پیاس قرار دیتی تھی۔ اب سانس بھی لیتی تو صرف اس لیے کہ فضا سے آتی زریاب کی خوشبو کو اپنی نس نس میں اتار سکوں۔ زریاب کی دیوانگی بھی جوں کی توں تھی بلکہ جب سے اسے پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں اور وہ میرا پہلے سے بڑھ کے دھیان رکھنے لگا۔

انہیں دنوں زرسانگہ، زریاب کی بڑی بہن بھی ڈلیوری کے لیے میکے آئی۔ میری اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ زریاب کو بے حد عزیز تھی اس لیے میں نے بھی بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے ملنا چاہا لیکن اس کے رویے میں بھی میرے لیے سرد مہری اور گریز کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جتنے دن رہی مجھ پہ طنز کے تیر تاک تاک کے چلاتی رہی۔

بی بی جان کا رویہ ایک خاموش اجتناب تھا لیکن ان کی بیٹی کے رویے کا جارحانہ پن مجھے کبھی کبھی نشے سے جھنجھوڑ ڈالتا تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی تلخ مزاجی اور ترش روی کو اس کی صحت کی خرابی پہ محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کی صحت مزید بگڑ گئی جس کی وجہ سے اس کا میکے میں قیام طویل ہوتا چلا گیا انہی دنوں فیروز لالہ کی بیوی لالئی بی بی یعنی تمہاری ماں اپنی دیگر رشتہ دار خواتین کے ساتھ مجھے لینے آئی۔ وہ

چاہتی تھی کہ فیروز کی خواہش کے مطابق میرے بچے کی پیدائش میرے میکے میں ہو۔اس توجہ وعنایت پہ میں کھل اٹھی لیکن زریاب سے پل بھر کی جدائی مجھے قبول نہ تھی اس لیے جانے سے منع کر دیا۔

میری بچی مقدس اسی گھر میں اپنے باپ دادا کے گھر میں پیدا ہوئی۔اس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ نے سوچ رکھا تھا۔جب وہ پیدا ہوئی تو ہو بہو میری تصویر تھی۔زریاب نے کس بے بسی سے کہا تھا۔

''اب میں تم سے کہاں تک بچوں گا مومنہ۔تم کتنے روپ بدل کے مجھے تسخیر کرو گی۔''

فخر سے میرا سر بلند ہو گیا۔مقدس نے باپ کی توجہ بانٹ لی تو میرے بھی کچھ ہوش ٹھکانے لگے اب مجھے زریاب کے علاوہ بھی کچھ نظر آنے لگا۔میں نے پہلی بار سنجیدگی سے گھر والوں کے اکھڑے رویے اور گریز کو محسوس کیا۔غیر جانب داری سے سوچتے ہوئے مجھے کچھ قصور اپنا بھی نظر آیا۔میں نے خود کو صرف اپنے شوہر تک محدود کر رکھا تھا صرف اس کی محبوبہ کی حیثیت سے یہاں رہ رہی تھی۔میں نے ایک بہو ہونے کے ناتے خود کو منوانے کی کوشش کی ہی نہیں تھی، اگر بی بی جان مجھے کافر سمجھتی تھیں تو مجھے اپنی حیثیت ان پہ واضح کرنا چاہیے تھی، اپنی جگہ بنانے کے لیے کوئی قدم تو اٹھانا چاہیے تھا۔میں نے حقیقت پسندی سے سوچتے ہوئے اپنا احتساب کیا۔

باچا جان مصر تھے کہ اس بار بیرونی ملک کاروباری دورے پہ زریاب ہی جائے جب کہ وہ میری اور اب ننھی مقدس کی کشش سے بندھ چکا تھا۔میں نے ہی اسے جانے پہ آمادہ کیا ایک بیٹا ہونے کے فرائض سے آگاہی دلائی۔ایسا کر کے شاید میں خود ایک اچھی بہو بننے کی تیاری کر رہی تھی۔

بمشکل وہ جانے پہ تیار ہوا اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے فیصلے کی تختی کا اندازہ ہوا۔اس کے ساتھ نے کتنی تیز دھوپ مجھ تک آنے سے روک رکھی تھی۔اس کے جاتے ہی جیسے بھانبھڑ جلنے لگے۔زرسانگہ کے طعنے ناقابل برداشت ہوتے چلے گئے۔میرے اندر کی انا پرست پٹھان پھر سے جاگنے لگی۔اچھی اور قابل قدر بہو بننے کا ارمان کہیں سو گیا اور سمجھوتے کے تمام تر منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

زریاب کے ہمراہ وہ تمام رویے جو میں سرسری جان کے چھوڑ دیتی تھی اب جان کو آ جاتے۔میں نے تنگ آ کے اپنے کمرے تک محدود رہنا شروع کر دیا۔یوں بھی بھرے گھر میں مجھے کوئی منہ لگانے پہ تیار نہ ہوتا تھا۔بی بی جان مجھے دیکھتے ہی وضو کرنے چل پڑتیں۔ملازمائیں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دور دور رہتیں۔باچا جان اپنے کمرے یا پھر مہمان خانے تک محدود رہتے۔زریاب کے بڑے لالہ شہر میں رہتے تھے ان کے گھر والوں سے میری سرسری سی ملاقات ایک آدھ بار ہوئی تھی۔ان کے رویے میں بھی کوئی خوش آئند جھلک نہ تھی۔جب کہ زریاب کے چھوٹے بھائی سے میری کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔

زرسانگہ ابھی تک علیل تھی اور اس کی بدمزاجی اور چڑچڑاپن عروج پہ تھا۔ہر ہفتے اس کا شوہر رحیم گل آفریدی اس سے ملنے آتا۔ہر بار ہی دونوں میں کوئی نہ کوئی تلخی پیدا ہو جاتی جس میں میرے نزدیک سارا قصور زرسانگہ کا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ رحیم گل بڑا مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان نظر آتا تھا۔وہ ہنس مکھ بھی تھا۔خوبرو بھی اور اپنی بیوی سے خاصا کم عمر بھی۔

مجھے تو بیچارے کی قسمت پہ افسوس ہی ہوتا تھا ایک تو بڑی عمر کی بیوی، اوپر سے جاہل، بدزبان اور کم شکل بھی۔پورے گھر میں وہی تھا جو

مجھے خنک خاندان کی بہو والا درجہ دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کے تعظیماً کھڑا ہو جاتا۔ ادب سے سلام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جتنا میں زرسانگہ سے بچ کر رہتی رحیم گل کے آنے پہ اس سے ضرور ملتی۔ وہ تھا ہی ایسا عزت کرنے والا اور عزت کرانے والا۔

اس دن میں حد سے زیادہ بے زار اور اداس تھی۔ مقدس کو سلانے کے بعد میں نے زریاب کو خط لکھا، پہلی بار میں نے اس سے اس کے گھر والوں کے نارواسلوک کا ذکر کیا۔

ورنہ اس سے پہلے میری کوشش ہوتی کہ جتنا وقت بھی وہ میرے پاس رہے ہمارے درمیان کسی دوسرے کا ذکر نہ آئے اور تکلیف دہ ذکر تو ہرگز نہیں۔ لیکن اس دن میں نے اپنی ہر تکلیف اس سے بیان کی۔ اپنی تنہائیوں محرومیوں کا ذکر کیا۔ کس کس طرح میری عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے سب لکھا۔ بیرون ملک خط پوسٹ کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پتہ انگریزی میں لکھا جاتا ہے جب کہ کوشش کے باوجود میں لکھا ہوا پتہ لفافے پہ ہو بہو نہ اتار سکی تو خط لے کر رحیم گل کے پاس چلی آئی۔ وہ رات ہی کی مروت سے آیا تھا۔

''گل لالہ، ذرا یہ انگریزی کا پتہ تو اس لفافے پہ لکھ دو۔''

میں نے لفافہ اور قلم اس کے سامنے رکھا تو وہ سستی سے اُٹھ بیٹھا۔ رتجگا اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ شب خوابی کا لباس بے شکن تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا اس نے ساری رات اسی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے گزاری ہے مجھے اس کی مضمحل حالت پہ افسوس ہوا۔

''کیا ہوا لالہ، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تمہاری۔''

''کچھ نہیں بھابھی، بس سفر کی تھکان ہے اور...... میری قسمت کا ہم سفر تھکان اتارنے والا نہیں، بڑھانے والا ہے۔'' اس نے انگلیوں سے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے کہا رات بھی زرسانگہ کے کمرے سے کافی دیر تک تلخ وتند جملوں کی تکرار سنائی دیتی رہی تھی، میں ان کے درمیان موجود تلخی کی وجہ سے ناواقف تھی پھر بھی میری تمام تر ہمدردیاں رحیم گل کے ساتھ تھیں شاید اس کی وجہ میرے اور میری نند کے سرد تعلقات تھے۔

میں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

''چھوڑو لالہ، ذرا ذرا سی بات پہ یوں منہ لٹکانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔'' میں اس سے چھوٹے بھائیوں کی طرح پیش آتی تھی شاید وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی تھا حالانکہ رشتہ اس کا مجھ سے بڑوں والا ہی تھا۔

''ہاں ٹسوے بہانا تو عورتوں کی عادت ہے نا۔ ذرا کوئی زیادتی ہوئی دریا بہا کے دنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹ لیں گی۔ مرد اپنی مردانگی کے زعم میں دل بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کے پتہ لکھنے لگا۔ میں نے یونہی رواداری میں کہہ دیا۔

''تو تم مجھ سے دل ہلکا کر لیا کرو۔ میں بھی تو تمہاری کچھ لگتی ہوں۔ یقین کرو تمہارے دل کی بات میرے دل تک ہی رہا کرے گی۔''

''ہائے اللہ جی، میں برباد ہوگئی...... یہاں تو دل سے دل تک بات پہنچ گئی۔''

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سینہ کوبی کرتی زرسانگہ اندر داخل ہوئی۔ رحیم گل سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''بکواس بند کرو زر۔''

''ہائے بی بی جی......آپ بھی مجھے کوس رہی تھیں ناں کہ شوہر کو راضی نہیں رکھ پاتی اس لیے دو منٹ پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ آئیں دیکھیں ذرا اس کے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ خود دیکھیں۔'' اس نے شور مچا کے بی بی جان کو بھی بلا لیا ان کے ساتھ ساتھ وگمہ اور سرحدی جیسی ملازمائیں بھی لپک کے تماشا دیکھنے آ گئیں۔

''میں کہتا ہوں زرسانگہ، زبان قابو میں کرلو ورنہ......''

رحیم گل نے دھاڑ کے کہا لیکن اسے ذرا پروا نہ تھی۔

''اسی لیے بہانے بہانے سے روٹھ کے کمرے سے نکل آتا ہے۔ دوسرا کمرہ اس جادوگرنی نے جو آباد کیا ہوتا ہے۔''

میں سن ہو گئی۔ اس رکیک الزام نے میری قوت گویائی ہی سلب کر لی تھی۔ وہ زہر اگلتی رہی۔

''آدھی رات کو میں نے خود اسے بن ٹھن کے اس کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ طبیعت بھری نہیں، جو چند گھنٹے بعد پھر سے اندر گھس گئیں۔

میرا دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لوں لیکن قدم من من بھر کے ہو کر زمین سے اٹھ نہ پا رہے تھے۔ خود رحیم گل بھی بیوی کے سفید جھوٹ پہ ہکا بکا رہ گیا۔

''نہ بی بی......ساری رات میں خود زریاب دلہن کے پاس تھی۔ بچی کو بخار آ رہا تھا۔ بی بی تو ہلی تک نہیں کمرے سے۔'' سرحدی نے خوف خدا سے لرز کے گواہی دی۔

''تو...بڈھی چڑیل......'' زرسانگہ نے عمر رسیدہ ملازمہ کو جھپٹ لیا اس کا منہ نوچتے ہوئے وہ بے تحاشا چیخنے لگی۔ بی بی جان بیٹی کی دیوانگی پہ ہراساں ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ چکی تھیں، بدن پہ لرزہ طاری تھا اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے گھن محسوس کر کے منہ پھیر لیا۔

''وگمہ......اس سنبھالو......نجانے کیسے دورہ پڑا ہے بچی کو جب سے بیاہ ہوا ہے کملا کے رہ گئی ہے نجانے کیسا کسی نے تعویذ پھونکا ہے بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے معصوم بچی کا۔''

''ہونہہ معصوم بچی......'' رحیم گل نے تنفر سے کہا اسے بی بی جان کا بیٹی کے لیے یوں فکرمند ہونا بالکل پسند نہ آیا، انہوں نے داماد اور بہو کے یوں بے عزت ہونے پر اک لفظ تک نہ کہا اور کچھ کہا بھی تو بیٹی کے لیے۔

''دورہ نہیں پڑا......ڈرامے کرتی ہے پاگل پن کے۔ تاکہ جو مرضی آئے کرتی پھرے کوئی کچھ کہہ نہ سکے کہ بیچاری پاگل جو ہے۔'' رحیم گل نے غصے سے کہا۔

''میں پاگل ہوں؟ میں پاگل نہیں ہوں تم مجھے پاگل کر دو گے؟''

''میری بچی پاگل نہیں رحیم گل۔'' بی بی جان نے سخت لہجہ میں کہا۔ رحیم گل آس پاس پڑی چیزوں کو ٹھوکر مارتا غصے سے کمرے سے نکل گیا۔ میں کسی بے جان چیز کی طرح کونے کی دیوار سے سہمی چپکی کھڑی تھی۔ یہ تماشا میرے گمان سے بھی باہر تھا۔ زرسانگہ کی اکثر حرکتیں مجھے عجیب سی لگا کرتیں لیکن وہ اس حد تک جنونی بھی ہو سکتی ہے مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس نے تو شوہر کے ساتھ ساتھ، مجھے......اپنے بھائی کی عزت کو بھی دو کوڑی کا کر دیا۔

غم وغصے نے مجھ سے اتنی ہمت بھی چھین لی تھی کہ میں بھی رحیم گل آفریدی کی طرح اس کمرے سے نکلنے کا سوچتی اور شاید میری بدقسمتی تھی کہ میں اس کمرے میں موجود تھی۔ زرسانگہ نے نفرت سے مجھے دیکھا اور اپنا آپ چھڑا کے مجھ پہ جھپٹی۔ اس نے میری چادر کھینچ کے پھینک دی اور گریبان سے پکڑ کے مجھے زمین پہ لا پھینکا۔ میرے بٹن ٹوٹ کے بکھر گئے میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے سنبھل تک نہ سکی اور آسانی سے اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے میرے بال نوچ کے مجھے گھسیٹنا چاہا۔ بی بی جان کے کہنے پہ ملازمائیں آگے بڑھیں لیکن تب تک اس نے میرے منہ پہ طمانچے مار مار کے میرے رخسار سوجا دیے تھے میری ناک سے خون بہہ رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ میری چیخ وپکار میرے اندر ہی کہیں دفن ہو رہی تھی۔ اس قدر ذلت مجھے فریاد کرنے بھی نہیں دے رہی تھی وگمہ اور سرحدی نے اسے پکڑ لیا لیکن اس نے زور سے لات مار کے میری پسلیوں پہ وار کیا۔ میں درد کی شدت سے دوہری ہو گئی۔

''کافرن...... ہندنی ایک مرد سے تیری تسلی کہاں ہوتی ہوگی۔ چھوڑ میرے بھائی اور شوہر کا پیچھا چلی جا اپنے منحوس پہاڑوں پر وہاں رواج ہوگا چار چار مرد رکھنے کا آزادی سے عیش کرنا۔''

''کافرن ہوگی تو......'' میں پھٹ پڑی۔

''میں مومنہ ہوں...... مومنہ...... خان زریاب کی من چاہی بیوی...... مجھے چار مردوں کا طعنہ دینے والی ڈائن۔ خود ایک مرد کے قابل بن کے تو دکھا مجھے۔'' میں مزید چپ نہ رہ سکی میری للکار پہ اس نے خود کو چھڑایا۔ لپک کے آتش دان سے جلتی لکڑی نکالی۔ اس کا تیور بھانپ کے میں نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن میں خود کو مکمل طور پہ اس سے محفوظ نہ رکھ پائی۔ میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔''

اس وقت تمام تر اذیت مومنہ کے لہجے میں اتر آئی۔ خوشنود آنکھوں میں درد لیے اس نڈھال چہرے کے اس سیاہ پڑے حصے کو دیکھنے لگا جہاں ایک بے رحم داغ پہ چند آنسو سرک رہے تھے۔

''میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔''

مقدس کے قدم اس ایک جملے نے باندھ دیے۔ وہ آئی سی یو سے ہوتی ہوئی اس کمرے تک آ رہی تھی۔ کمرے میں خوشنود کو پا کے وہ ٹھٹکی۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی موجودگی میں اندر چلی جائے یا چپکے سے واپس لوٹ جائے کہ ماں کی آواز نے اس کا دھیان کھینچ لیا۔ وہ درد میں ڈوبی اس آواز سے گرفتار سی ہو کے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سنسان کوریڈور میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ ہاسپٹل کے پرسکون ماحول میں دروازے کے اس پار کھڑی مقدس تک مومنہ کی گفتگو بخوبی پہنچ رہی تھی۔

''میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔''

مقدس کے رخسار دہکنے لگے۔ اس نے شدت ضبط سے لب کچل ڈالے۔ مومنہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

''وہ رات بڑی ظالم تھی۔ ساری شام میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اسی کمرے کے ایک کونے میں پڑی رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے گال کو کوئی چھیل رہا ہے۔ میں نے سوجی ہوئی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ سرحدی ہاتھ میں مرہم کی پیالی لیے کھڑی تھی۔ برتی

آنکھوں کے ساتھ اس نے ہی شاید میرے جلے ہوئے رخسار کو صاف کرنا چاہا تھا اور درد کی تیز لہر مجھے گھنٹوں کی بے ہوشی سے کھینچ لائی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔ مجھے اس کے اور دیگر ملازماؤں کے سامنے ہونے والی تذلیل یاد آ گئی۔ اب ان ہمدردیوں سے اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا میں نے گرتے پڑتے اپنی چادر اٹھائی، ڈولتے قدموں سے کمرے سے نکلی۔ سرحدی نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اسے جھٹک دیا اس وقت مجھے سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ مقدس بستر پر لیٹی کلکاریاں بھر رہی تھی۔ سرحدی کی گیارہ سالہ پوتی اسے کھلا رہی تھی۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ سراسیمہ ہو گئی۔ جھنجھنا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ الٹے قدموں کمرے سے نکل گئی۔ مقدس اس کو نظروں سے اوجھل پا کے رونے لگی۔ میرے کانوں تک اس کے رونے چلانے کی آواز بہت دور سے کہیں آ رہی تھی۔ میں نے خالی خالی نظروں سے اسے بستر پہ ہاتھ پیر پٹخ کے روتے دیکھا لیکن میرے اندر کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی میرا پورا وجود برف ہو رہا تھا صرف آدھا چہرہ جیسے شعلوں کی زد میں تھا۔ میں اس کے برابر لیٹ گئی۔ سرحدی نے آہ بھر کے مجھے دیکھا اور مقدس کو دودھ کی بوتل اور کھلونے سمیت اٹھا کے باہر لے گئی۔ جاتے جاتے وہ میرے سرہانے مرہم رکھ گئی۔ کئی گھنٹے ایسے پڑے رہنے کے بعد میں اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھنا چاہا۔ میری چیخ نکل گئی۔ میرے گال سے چربی باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھ تک جلد جھلس چکی تھی۔ رو رو کے میرا گلا بیٹھ گیا۔ دن چڑھے تک میں بھوکی پیاسی، بخار میں جلتی، درد سے تڑپتی اکیلی پڑی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔

زریاب کے آنے میں ابھی کئی دن تھے۔ اتنے دن تک میں یوں بے یار و مددگار نہیں رہ سکتی تھی میں جانتی تھی اس سنگلاخ حویلی میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں، کوئی میری تکلیف بانٹنے نہیں آئے گا۔ کوئی مجھے سنبھالنے نہیں آئے گا اس طرح تو میں ختم ہو سکتی تھی جب کہ مجھے زندہ رہنا تھا مقدس کے لیے زریاب کے لیے، مجھے خود اپنے لیے کچھ کرنا تھا۔ زرسانگہ نے مجھے اکیلا جان کے میرے ساتھ یہ ستم ڈھایا۔ بی بی جان مجھے لاوارث سمجھ کے یہاں مرنے چھوڑ گئیں، لیکن میں ان سب کو بتا دوں گی کہ میں لاوارث نہیں...... بے یار و مددگار نہیں۔

مجھے فیروز لالہ یاد آئے اور ان کا عہد بھی میرے اندر ایک توانائی سی بھر گئی۔ میں نے اپنے زخم کو مرہم سے ڈھانپا، گرم دودھ منگوا کے پیا۔ ذرا ہمت آ جانے پہ سرحدی کی مدد سے مردان خانے جا کے فیروز لالہ کو فون کیا۔ میری سسکیاں انہیں احساس دلا گئیں کہ بات غیر معمولی ہے اس لیے تین گھنٹے میں ہی وہ میرے پاس موجود تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔

''مومنہ...... تم...... یہ سب کیسے ہوا؟'' وہ گمان بھی نہ کر پائے کہ یہ سب کس نے کیا ہوگا اور جب میں نے خود پہ پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا تو وہ چند لمحے بے یقینی سے بیٹھے رہے پھر ان کی آنکھیں غیرت کے مارے لہو رنگ ہو گئیں۔

''اس گھر میں فیروز خان وردگ کی بہن پہ اتنے گھٹیا الزامات لگائے گئے۔ کیا یہی سب وہ خوشیاں تھیں جنہیں دکھانے کا وعدہ کر کے زریاب تمہیں یہاں لایا تھا۔ وہ میرا دوست ہے لیکن اب میں بھول جاؤں گا کہ وہ میری بہن کا شوہر ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے اسے اس رشتے کے تمام تقاضے پورے کرنا ہوں گے۔''

''نہیں لالہ، زریاب کا کوئی قصور نہیں وہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ تو جب مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو نجانے کیسا محسوس کریں گے۔ یہ

سب ہوا ہی ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو کس کی مجال تھی مجھے ہاتھ لگانے کی، میری چادر کھینچنے کی، مجھ پہ گندے الزامات لگانے کی۔''

''ٹھیک ہے وہ تمہارا شوہر ہے، تمہارا سائبان...... لیکن باقی افراد سے بھی تمہارا کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ سب پہ تمہاری حرمت فرض ہے۔ شوہر کی غیر موجودگی میں تمہارا بے سائبان اور غیر محفوظ ہونا ثابت کرتا ہے کہ زریاب تمہیں یہاں تمہاری شایان شان حیثیت نہیں دلا سکا۔ میں بات کرتا ہوں باچا جان سے، وہ خود چل کے آئے تھے، تمہیں بیاہنے، تمہارے والی ہیں تمہارے سرپرست۔''

وہ میرا ہاتھ تھام کے باچا جان کے کمرے میں لے گئے۔ بستر پہ نیم دراز باچا جان سنبھل کے بیٹھ گئے۔

''السلام علیکم باچا جان'' فیروز لالہ نے غصے کی آخری حد میں بھی تعظیم یاد رکھی۔

''آؤ فیروز آؤ۔'' انہوں نے درزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے فیروز لالہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاید انہیں میرا یوں کمرے میں گھسے چلے آنا پسند نہیں آیا تھا۔ اب تک ان کی کسی بہو کو اتنی جسارت نہ ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت ان کی تنہائی میں مخل ہوتی۔

''باچا جان میں صرف آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا خٹک خاندان میں عورت کی عزت صرف ماں، بہن اور بیٹی کے رشتے کے حوالے سے کی جاتی ہے؟ کیا بیٹے کی عزت گھرانے کی عزت نہیں کہلائی جاتی اور کیا بہو کو بیٹی والی تعظیم نہیں مل سکتی۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو فیروز۔'' باچا جان کے لہجے سے ناگواری جھلک اٹھی۔

''صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں باچا جان۔'' اس نے میرے چہرے سے چادر سرکا کے مجھے آگے کیا۔ باچا جان میرے چہرے پہ یہ گہرا نشان دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

''یہ سب کیسے ہوا اور کب؟''

''آپ یہ پوچھیئے باچا جان کہ یہ سب کس نے کیا اور کیوں؟ اس لیے کہ یہ نشانات حادثاتی نہیں ہیں۔ آپ کی صاحبزادی نے نا صرف اپنی بھابی پہ جسمانی تشدد کیا ہے بلکہ نہایت بے رحمی سے رکیک ترین الزامات بھی لگائے ہیں جو اس خاندان کی بہو کے حوالے سے مومنہ کے لیے انتہائی شرمناک ہیں۔''

''اس نے کوئی الزام لگائے ہیں نہ ہی تشدد کیا ہے۔'' بی بی جان کمرے میں چلی آئیں۔

''نند بھاوج کے جھگڑے کس خاندان میں نہیں ہوتے۔ بس کل بات ذرا زیادہ ہی بڑھ گئی اور وہ بھی سب اس کی وجہ سے ہوا۔ یہ پہاڑوں کی رہنے والی زبان دراز گنوارن، خاندانی طور اطوار کیا جانے۔ اس کی زبان...... توبہ توبہ...... زرسانگہ بھی مشتعل ہوگئی۔''

''یہ محض نند بھاوج کا جھگڑا نہیں تھا بی بی جان بلکہ یہ جھگڑا ہی نہیں تھا۔ جھگڑا دو طرفہ ہوتا ہے۔ یہ تو زیادتی تھی جو آپ کی بیٹی کی طرف سے ہوئی ہے۔ ظلم ہے جو اس نے میری بہن پہ توڑا ہے وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔''

''تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟'' بی بی جان کو جلال آ گیا۔ فیروز لالہ نے نظریں جھکالیں۔ ''آپ میری بزرگ ہیں میں آپ کی شان

میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا لیکن خدا کے لیے اپنی بزرگی کا مان رکھ لیں۔''

''سچ کیا ہے حضرتی؟'' باچا جان گرجے بی بی جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن بدبدا کے رہ گئیں۔ سچ کہنے کی ہمت نہ تھی اور جھوٹ وہ اپنے خان جی کے سامنے بول نہیں سکتی تھیں۔

''زرسانگہ کہاں ہے۔'' وہ بولے۔

''وہ بیچاری تو کل سے بیمار پڑی ہے۔ اپنی سدھ بدھ ہی نہیں اسے۔ میں نے کہا ناں عورتوں کی لڑائی تھی، زبانی کلامی طعنوں سے بات اس عورت نے آگے بڑھائی، زرسانگہ کو مارنے کے لیے آگے بڑھی تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اسے دھکا دے دیا۔ غلطی سے آگے یہ جا پڑی۔ وہ بے چاری تو خود دہشت اور خوف کے مارے بیمار ہو گئی ہے۔'' انہوں نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ بات بنائی۔ باچا جان کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کے میں نے کہا۔

''باچا جان ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا یقین کیجیے ان پہ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات میں تو ان کا اٹھا ہاتھ روکنے کی جسارت بھی نہیں کر پائی۔ سارا گھر گواہ ہے انہوں نے...... میرے ساتھ......'' میں سسک اٹھی۔

''مجھے طمانچے، لاتیں، گھونسے مارے، گالیاں بددعائیں دیں۔ گندے الزامات لگائے۔ جلتی لکڑی میرے چہرے پہ رکھ دی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں باچا جان میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم، میرا کوئی قصور نہیں۔''

''تو کیا اور تیری قسم کیا۔ جب اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہ تیرا ایمان ہی نہیں تو قسم کیوں اٹھاتی ہے۔ تو تو قسم اٹھا کسی بت کی، کسی سانپ کی، سورج کی، جن چیزوں کو پوجتے ہو تم کافر لوگ۔'' بی بی جان کے اس طعنے پہ فیروز لالہ بھڑک گیا۔

''باچا جان، یہ آخری حد ہے، آپ خود اندازہ لگا لیں اس گھر میں اس کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہوگا۔ یہاں نہ اس کے کردار کا احترام کیا جاتا ہے نہ ایمان کا۔ جب میں نے اسے رخصت کیا تھا تو آپ سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آپ کے گھر میں اس کا پرانا حوالہ کوئی یاد نہیں رکھے گا۔ یہ وردگ حویلی سے رخصت ہو رہی ہے۔ وردگ خاندان سے خٹک خاندان تک جاری ہے میں نے اپنا نام اس کے نام کے آگے لگا کے اسے آپ کے حوالے کیا تھا۔ بی بی جان نے اسے نہیں مجھے گالی دی ہے میرے خاندان کو دی ہے۔''

''خاندان خون سے ہوتا ہے، نسب سے ہوتا ہے فیروز تم بھی پٹھان ہو، ہم بھی پٹھان ہیں۔ یہ بات تو جانتے ہو گے نسلیں اپنا خون سینچتی ہیں تو نام کے آگے کوئی حوالہ لگتا ہے۔ میں ان رشتوں کو نہیں مانتی۔ زبانی کلامی کہہ دینے سے کوئی بہن ہو جاتی ہے نہ بھائی بن جاتا ہے۔''

''بی بی جان میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ باچا جان سے اجازت لینے آیا ہوں کہ مومنہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب زریاب آئے گا تو ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔'' ابھی باچا جان کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ بی بی جان کہہ اٹھیں۔

''یہ کہیں نہیں جائے گی۔''

''کیوں نہیں جائے گی۔ اس کی حالت دیکھیں۔ یہ کمزور ہے، بیمار ہے، زخمی ہے۔ اسے کس کے سہارے چھوڑ کے جاؤں میں۔ آخر آپ

کی بیٹی بھی تو کافی عرصے سے یہاں رہ رہی ہے۔''

''یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔''

''مومنہ بھی اپنے بھائی کے گھر جارہی ہے۔''

''وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کی اجازت سے یہاں آئی ہے۔''

''میں بھی باچا جان سے اجازت ہی طلب کررہا ہوں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں مومنہ سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ زریاب کے آنے میں چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ بلکہ میں اسے جلد از جلد بلوانے کی کوشش کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم یہیں رک کے اس کا انتظار کرو۔'' میں تذبذب کا شکار تھی میری ہچکچاہٹ دیکھ کے بی بی جان نے پینترا بدلا۔

''شوہر کی غیر موجودگی میں قدم باہر دھرنے والی عورتیں بااعتماد نہیں ہوتیں۔ پھر بھی اگر جانا چاہو تو یاد رکھو بچی میں تمہیں نہیں لے جانے دوں گی۔ تم پہ تمہارے اس نام نہاد بھائی کا اختیار چل سکتا ہوگا۔ خٹک خاندان کی بیٹی پہ وہ کوئی حق نہیں جما سکتا۔'' بی بی جان کا خیال ہوگا بچی کے بغیر میں جانے کا فیصلہ نہیں کر پاؤں گی اور شاید ایسا ہی کرتی میں لیکن فیروز لالہ نے اصرار کیا۔

''مومنہ، میری بات مان لو یہاں تمہاری عزت اور جان دونوں غیر محفوظ ہیں۔ تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے زندہ رہنا ہے ورنہ سچ کو دبانے کے لیے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' اس تبصرے پہ اب تک تحمل سے بیٹھے باچا جان بھی بھڑک اٹھے۔

''فیروز خان تم بے ادبی کے مرتکب ہو رہے ہو۔'' میں اور بھی خوفزدہ ہوگئی۔

''ہمت کرو مومنہ، بچی ان کا اپنا خون ہے اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں اگر یہ رکھنا چاہتے ہیں تو رکھنے دو چند دن کی بات ہے۔ زریاب سے رابطہ کر کے میں اسے فوراً واپس بلاتا ہوں۔ میرے گھر پہ ہی ساری بات ہوگی۔ تم تیاری کرو۔ یہاں رہوگی تو یا تو پاگل ہو جاؤ گی یا ماردی جاؤ گی۔'' میں نے اک نظر باچا جان اور بی بی جان کے جلالی چہرے دیکھے، میرے رخسار سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں نے فیروز لالہ کو دیکھ کے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے چند جوڑے کپڑے اٹھائے اور مقدس کو پیار کر کے باچا جان کے پاس رخصت لینے آئی۔ دونوں نے منہ پھیر لیا۔

''تمہیں عزت کی بڑی خواہش ہے اور خود تم اس گھر کی عزت روند کے جارہی ہو اس شخص کے ساتھ جو تمہارے ساس سسر دونوں کی بے عزتی کر گیا تمہارے سامنے اور یاد رکھو تم اس گھر سے بغیر کسی کی رضامندی کے جارہی ہو۔ نتائج کی ذمہ دار بھی تم ہی ہوگی۔'' باچا جان نے سرد لہجے میں کہا اور میں...... میں چلی گئی۔

مومنہ خاموش ہوگئی تھی لیکن مقدس کو ایک ننھی سی بچی کے رونے کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔

☆☆☆

''بی بی جان میں شکستہ ہو چکا ہوں کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا، جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔''

زریاب نے بے بسی کی آخری انتہا پہ پہنچ کے بی بی جان کے گھٹنے تھام کے فریاد کی جو باچا جان کی ملتجی نگاہوں سے ہار مان کے عرصے سے سینے میں دبا راز کھولنے پہ آمادہ تھیں۔ انہوں نے زریاب کے ہاتھ اپنے پہلو سے اٹھائے، لبوں سے لگا کے کہنے لگیں۔

''زریاب مجھے معاف کر دینا۔ میں خان جی کے سامنے، اپنے بیٹوں کے سامنے تم سے معافی مانگتی ہوں اور یہ اعتراف کرتی ہوں کہ ممتا کی کسوٹی پہ میں کھری نہ اتر سکی۔ ایک کمزور لمحے نے مجھے سگے اور سوتیلے رشتوں میں ڈنڈی مارنے پہ اکسا دیا۔ میری ذرا سی لغزش نے کئی زندگیاں برباد کر دیں۔ مجھے معاف کر دو میں تمہاری گناہ گار ہوں۔''

''بی بی...... جان!'' وہ بے یقینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھنجلاہٹ اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ خدارا مجھے پوری بات سنائیں۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟'' کن کمزور لمحوں کی بات کر رہی ہیں؟''

''یہ لمحے میری بیٹی زرسانگہ کی زندگی سے میری زندگی تک نقب لگا کے چلے آئے تھے۔ تم جانتے ہو تمہاری بہن کی وجہ سے میں کتنی پریشان رہتی تھی۔ تیس سال سے اوپر ہونے کے بعد بھی اس کی شادی نہ ہو پا رہی تھی۔ شکل وصورت بھی اس کی واجبی تھی اور تعلیم بھی برائے نام تھی۔ اگرچہ خٹک خاندان کی بیٹی کے لیے اس کے خاندان کا نام بھی بہت ہوتا ہے صورت وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں لیکن اس کی قسمت کہ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی مرد نہ تھا۔ اور خاندان سے باہر لڑکیاں بیاہنے کا ہمارا رواج نہیں تھا۔ ایسے میں بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ تنہائی، محرومی اور مایوسی نے اسے کس قدر چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا تھا۔

تمہیں یاد ہی ہوگا۔ خان جی نے مجھ سے اپنی بہن پہ دباؤ ڈالنے کے لیے کہا جس کا بیٹا رحیم گل ہماری زر سے پندرہ سال چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ تامل تھا لیکن خان جی کے پیہم اصرار پہ میں بہن سے فریاد کر بیٹھی۔ میری محبت میں اس نے کسی طرح بیٹے کو منا ہی لیا یوں بھی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا ابھی اتنا خود سر کہاں ہوا تھا کہ احتجاج کر پاتا ماں باپ کے سامنے۔ لیکن اپنی ساری تلخی اس نے بیوی پہ نکالنا شروع کر دی۔

زرسانگہ کوئی کم عمر الھڑ تو نہیں تھی کہ شوہر سے دب جاتی پھر شوہر بھی وہ جسے چند سال پہلے تک وہ گود میں کھلاتی رہی ہو۔ اس نے بھی رحیم گل سے الجھنا شروع کر دیا اگرچہ یہ ہماری برادری کا پہلا واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی بے جوڑ رشتے ہو چکے تھے اور برے بھلے نبھ بھی چکے تھے لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔ تعلیم اور شعور نے ذہن تبدیل کر دیا تھا۔ نہ تو رحیم گل کرخت مزاج پکی عمر کی بیوی کو دلہن تسلیم کر سکا نہ ہی زرسانگہ کے خوابوں کو تعبیر ملی اکھڑے اکھڑے رہنے والے کم عمر شوہر سے، رحیم گل کے ساتھ نے اس کی رہی سہی خود اعتمادی بھی چھین لی۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور ستم یہ کہ رحیم گل کا رویہ اس کے احساس کمتری کو دیوانگی میں بدلنے میں مددگار ثابت ہونے لگا۔ وہ اسکے سنگھار پہ تنقید کرتا، اس کی عمر اور شکل پہ بے رحمانہ تبصرے کرتا، اپنی مظلومیت کا رونا روتا اور اس کی کم علمی اور بدزبانی کو کوستا۔ زرسانگہ ہمیشہ یہ سب مجھ سے بیان کرتے ہوئے بلک پڑتی۔

''بی بی جان! باچا جان نے کیوں زبردستی مجھے اس کے سر منڈھا۔ میں ان چاہی ہستی کی طرح اس کے اوپر مسلط نہیں رہنا چاہتی۔ لوگ اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں اور مجھے ایسے جیسے میں کوئی جادوگرنی ہوں جس نے ایک شہزادے کو اپنی قید میں کر رکھا ہے۔

بی بی جان! مجھے محروم ہی رہنا تھا تو خٹک ہاؤس کے ہی کسی کونے میں رکھ دیتے۔ غیروں کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی

اتنا گر کے، خالہ جی اب اٹھتے بیٹھتے جتاتی ہیں کہ بہن کے بہکاوے میں آ کے بیٹا ناقدروں میں رول دیا۔ ان کی بیٹیاں ماں کو سناتی ہیں کہ ہمدردی اور ترس کے نام پر اکلوتے بیٹے کے لیے اماں اٹھالائی ہو۔''

''صبر کرو زرے صبر۔''میں اور کیا کہتی۔''وقت کے ساتھ ساتھ سب صحیح ہو جائے گا۔''

''نہیں بی بی جان آنے والا وقت اور بھی تباہی لانے والا ہے۔ ابھی رحیم گل کم عمر ہے۔ باپ کے زیر اثر ہے، پڑھ رہا ہے وقت کے ساتھ ملنے والے اختیارات اسے خود مختار بنا دیں گے ابھی وہ مجبوری کے ساتھ مجھ سے نباہ رہا ہے۔ کل کو شاید۔''

''اچھا بول منہ سے نکال زرے۔ تو ماں بننے والی ہے اچھی باتیں سوچا کر۔ آنے والی اولاد تیری قسمت کھول دے گی۔''لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اولاد اس کی قسمت میں اور اندھیرے لکھ لائے گی، شناور جن دنوں پیدا ہونے والی تھی، زرے بیں تھی۔

تبھی تم مومنہ کو بیاہ لائے، یہ واقعہ اس کی ازدواجی زندگی میں نئی تلخی گھول گیا۔ رحیم گل تمہیں اتنی آزادی کے ساتھ من چاہی بیوی ملنے پر رشک و حسد کا شکار ہو گیا۔ اس کا نشانہ بیچاری زرسانگہ ہی ہوتی۔

''من مانیاں کرنا تم لوگوں کا پیدائشی حق ہے، ناں؟ بیٹی کو خود سے آدھی عمر کا خوب صورت لڑکا چاہیے تھا، ماں بھیک مانگ کے لے آئی ہے۔ بیٹے کو جنگلی پھول پسند آیا۔ باپ میلوں چل کے توڑ لایا اور کچھ لوگ مجھ جیسے بد قسمت ہوتے ہیں۔ جن کی ڈور سدا دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔''

''لالہ کی شادی کا ذکر کیوں بار بار کرتے ہیں آپ؟ اگر انہوں نے پسند کی شادی کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟''

''اور میرا قصور کیا تھا جسے اطاعت اور فرماں برداری کے سبق سکھائے گئے جب میری ماں نے کہا کہ رحیم گل کو اس رشتے پہ اعتراض ہے تو تمہارے والدین نے میرے گھر آ کے میرے ماں باپ کو پٹی پڑھائی کہ بیٹے کی مرضی کیا چیز ہے۔ اصل بات خاندانی ناموس کی ہے۔ خاندان کے بیٹے ہی خاندان کی عزت نہیں ڈھانپیں گے تو کیا باہر سے لوگ آئیں گے مجھے ہر طرح سے مجبور کر کے قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ زریاب کو کھلی چھٹی کس نے دی؟ تمہارے باپ نے دی۔ اب کیوں برادری کی کوئی ڈھلتی عمر کی کنواری نظر نہ آئی؟''

اس کے یہ طعنے روز کا معمول بن گئے۔ زرے آخری دنوں سے تھی۔ اس حالت میں عورت ویسے ہی زود رنج اور حساس ہوتی ہے۔ رحیم گل نے اسے جلا جلا کے اور بھی ادھموا کر دیا تھا۔ وہ سنگ باری کر کے چلا جاتا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ پہ توجہ کرنے پہ مجبور ہو جاتی۔ تمہاری محبت نے اس پہ سچی سہاگنوں والا روپ چڑھایا تھا۔ اس کے جھل مل کرتے چہرے اور قل قل کرتی ہنسی زرے کے دل پہ برچھی بن کے لگتی۔ وہ تم دونوں کو دیکھ کے کلسنے لگتی۔ تمہارے قہقہے اسے اپنے نوحوں پہ ہنستے معلوم ہوتے۔ اپنی ناخوشگوار اور غیر متوازن زندگی کا قلق اسے رہنے لگا۔

ایسی ہی عجیب ذہنی و جذباتی کیفیت میں اس نے شناور کو جنم دیا۔ کمزور صحت کی وجہ سے اس کا چڑچڑا پن عروج پہ پہنچ گیا۔ کسی کی ذرا سی بات بھی اسے مشتعل کر دیتی۔ رحیم گل ہر ہفتے آتا اس کی حالت میں مزید ابتری پیدا کر کے چلا جاتا اور وہ اپنی بے بسی کا اظہار بچی اور ملازماؤں پہ نکالا کرتی۔ رفتہ رفتہ مومنہ بھی اس کا نشانہ بننے لگی، پھر مقدس کے بعد جب تم کاروباری دورے پہ گئے تو ایک بار پھر رحیم گل آیا۔ اسے اس کی ماں نے زرسانگہ کو لانے کے لیے بھیجا تھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کے وہ اور چڑ گیا حالانکہ یہ حالت سراسر اس کی دین تھی۔ زچگی کے بعد افسردگی اور زندگی سے

بیزاری نے اسے صحت کی جانب لوٹنے ہی نہ دیا تھا۔اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کے اس کا سارا خون جل گیا تھا۔ چہرے پر جھائیاں پڑ چکی تھیں، آنکھیں زرد اور ہاتھ پیر بے جان۔

''اس لاش کو لانے بھیجا ہے ماں نے ساری عورتیں ہی اولاد پیدا کرتی ہیں۔تم نے نرالی تو نہیں کی جو چھ مہینے سے بستر سنبھالے پڑی ہو۔اولاد کے بعد تو عورت کے چہرے پہ نور آ جاتا ہے تمہارے چہرے کی تو رہی سہی رونق بھی غائب ہوگئی ہے۔اپنی بھاوج کو دیکھو۔گلاب کھل رہے ہیں چہرے پہ۔''

''تو جاؤ سونگھ لو، وہ تو جنگلی پھول ہے ناں بقول تمہارے۔جنگلی سوغاتیں سب کے لیے ہوتی ہیں تم بھی مزا لے لو۔''

''شٹ اپ بدتمیز عورت کچھ تو لحاظ کرو تمہارے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے وہ۔''

''تم کیوں نہیں رشتوں کا لحاظ کرتے جب اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے ہو۔''

''کون سا قصیدہ پڑھا ہے میں نے! تم تو مفت میں بدنام کرنے والی عورت ہو، تمہارے سائے سے بھی دور رہنا چاہئے، منحوس بڑھیا۔''

وہ زہر تھوک کے چلا گیا اور زر ے ساری رات ان کڑوے الفاظ کی مار سہتی رہی لیکن کمزور اعصاب کی عورت اتنا سب سہہ نہ سکی جب اس کے اندر لاوا پک کے تیار ہو گیا تو وہ کمرے سے نکلی اسے پتا چلا کہ مہمان خانے میں رحیم کے ساتھ مومنہ بھی موجود ہے تو جیسے آتش فشاں پھٹ گیا۔اتنے دنوں سے اس کے اندر جمع بھڑاس ایک دم ہی نکل گئی اس نے مومنہ اور اپنے شوہر کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ وہ بھی غصے سے باہر نکل گیا اور مومنہ بھی ضبط نہ کر سکی اس کے منہ سے جواب سن کر زرسانگہ بالکل ہی دیوانی ہوگئی اس نے...... اس نے تمہاری بیوی پہ ہاتھ اٹھایا۔میں نے، وگمہ نے، سرحدی نے سب نے اسے قابو کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہوش وحواس میں نہیں تھی۔جیسے کوئی جن اس پہ قابض ہو گیا تھا اتنی طاقت اس کے اندر بھر گئی تھی، عجیب سی وحشت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔میں خوفزدہ ہوگئی، وہ بار بار خود کو چھڑا لیتی اور مومنہ پہ پل پڑتی، ہاتھوں، پیروں کے بے دریغ استعمال کے ساتھ اور پھر...... میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آتش دان سے لکڑی نکالی اور مومنہ کا...... مومنہ کا چہرہ داغ دیا۔''

زریاب دم بخود بیٹھا رہ گیا۔دراب اور افراسیاب کے چہروں پہ بھی استعجاب تھا جب کہ بی بی جان نے ایک بار بھی نہ نظر اٹھائی نہ چہرہ۔ان کے جھکے چہرے سے آنسو ٹپ ٹپ کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پڑنے لگے۔

زریاب کے تصور میں مومنہ کا بے داغ ہنستا ہوا چہرا آیا اور شعلے...... اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

''میں مانتی ہوں مجھے صورتحال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے، مومنہ کی دلجوئی کرنا چاہئے تھی اگر میں اس وقت اسے سنبھال لیتی تو شاید حالات اتنے خراب نہ ہوتے لیکن زرسانگہ کی کیفیت نے میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔وہ بے ہوش ہوگئی تھی اور ڈاکٹر کے مطابق اگر یہ کچھ دیر اور ہوش میں رہتی تو اس کی دماغ کی شریان کا پھٹنا یقینی تھا۔دوسری طرف غم وغصے اور بے بسی کا شکار مومنہ نے میری لاعلمی میں فیروز کو مدد کے لیے طلب کر لیا۔خان جی اب تک سارے قصے سے انجان تھے۔لیکن اب ان کے ساتھ ساتھ سارے گھر کو علم ہونے والا تھا کہ زرسانگہ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔جب اسے ہوش آنے پہ علم ہوا کہ فیروز مومنہ کے ساتھ خان جی کے کمرے میں ہے اور زریاب کو بلوانے کا فیصلہ ہو رہا ہے تو وہ سراسیمہ ہوگئی۔میرے پیر پکڑ کے منت کرنے لگی۔

''بی بی جان زریاب کو کچھ پتا نہ چلے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ کے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

''اسے تو پتا چل ہی جائے گا زرے، مومنہ کا چہرہ خود بتا دے گا۔ یہ تونے کیا کیا بدنصیب۔'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کوسنے پہ مجبور ہو گئی۔

''رحیم گل پہلے ہی مجھے بسانا نہیں چاہتا۔ اب مجھ پہ پاگل پن کا الزام لگا کے مجھے رسوا کر دے گا بھائی کی نظروں سے بھی گر کے میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو ہر طرف سے بے وقعت ہو جاؤں گی بی بی جان۔'' وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔

''یہ تو پہلے سوچنا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے بات میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی جب تو آگ اٹھا کے اس پہ لپکی تھی۔ زریاب کی چہیتی کا منہ جلا دیا تونے...... وہ تو اک پل یہاں نہ رکے گا اب۔''

''کچھ کرو بی جان، کچھ کرو، زریاب کے آنے سے پہلے پہلے کچھ ایسا کرو کہ میں بچ جاؤں، دنیا مجھے جینے نہیں دے گی۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ سسرال والے پاگل کہہ کے ٹھکرائیں گے تو بھائی بھی نفرت کریں گے۔ مجھے بچالو...... زریاب کو کچھ پتا نہ چلنے دو۔ مومنہ کے پاؤں پکڑ کے منت کرلوں گی میں، اسے کسی طرح جانے سے روک دو میں اس سے معافی کی بھیک مانگوں گی، کہوں گی میرا نام وہ مت لے۔''

''اور اگر وہ نہ مانی تو؟''

''تو...... تو پھر میں اسے ماردوں گی...... جب میں اس کا چہرہ جلا سکتی ہوں تو پورے کا پورا بھی بھسم کر سکتی ہوں۔ وہ نہ رہے گی تو کون بتائے گا زریاب کو، کیسے پتا چلے گا رحیم گل کو۔'' اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر چڑھ گئیں اور ہاتھ پیر مڑنے لگے۔ گردن کو خفیف سے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔

میں ہار گئی...... ممتا کے ہاتھوں...... ساری عمر پلڑا اسلامت رکھا...... ایک لمحہ ایسا نہ آیا اتنے سالوں میں کہ تم میں اور افراسیاب میں دراب اور زرسانگہ کے مقابلے فرق برتا ہو لیکن اس وقت...... لیکن نہیں...... شاید زرے کے بجائے میری کوئی اور بھی اولاد ہوتی تو میں یہی کرتی...... چاہے تم ہوتے چاہے دراب...... جب کسی ایک اولاد کی جان پہ بن آئے تو ماں سب کر گزرتی ہے میں نے سوچا تمہاری شادی شدہ زندگی میری بیٹی کی جان سے قیمتی تو نہیں ہو گی۔ بیٹا سلامت تو بہوئیں اور مل جائیں گی اپنی لاڈلی کہاں سے لاؤں گی۔ میں کیا جانتی تھی میں تو سب کچھ گنوانے جا رہی تھی سب کچھ۔

میری ہر کوشش کے باوجود فیروز مومنہ کو لے گیا خان جی مومنہ کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ناخوش تھے لیکن فیروز کے اشتعال انگیز جملے انہیں بھی ناگوار گزرے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے انہیں اور ورغلایا اور ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ میں جانتی تھی فیروز کے بلانے پہ زریاب فوراً چلا آئے گا اور پھر مومنہ کی زبانی سب کچھ سن کر...... یہی تو میں نہیں چاہتی تھی بیٹی کے ساتھ مجھے بیٹا بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے زریاب کو خان جی کی بیماری کی اطلاع دے کر فوراً آنے کو کہا۔ میرا پیغام جب اسے ملا تب تک تو فیروز اپنے گھر بھی نہ پہنچا ہو گا۔ زریاب اطلاع ملتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا اس طرح فیروز سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن جب......'' بی بی جان نے کہتے کہتے سر اٹھایا، کمرے میں موجود تمام نفوس پہ ایک نظر ڈالی۔ پھر ان کی نگاہیں گم صم بیٹھے زریاب پر جم گئیں۔

''تیسرے دن تم...... تم آئے تو میں حواس باختہ ہو گئی۔ خان جی کا غصہ کم ہو چکا تھا۔ وہ میری چال میں شریک ہونے سے انکاری تھے بلکہ انہوں نے مجھے سختی سے باز رہنے کا حکم دیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی وفاؤں اور خدمتوں کے بدلے ان سے یہ گستاخی کا حق

مانگ لیا انہیں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے دیے، اولاد کی قسمیں دے کر مجبور کر دیا۔ وہ چپ کر گئے اور میں نے تمہیں......''

ان کی آواز لڑکھڑائی تو زریاب نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں خاموش رہنے کی استدعا کی۔ وہ جانتا تھا آگے کیا ہوا۔ بوجھل قدموں کے ساتھ وہ دائیں طرف موجود بڑی سی کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

شفق کی لالی حد نگاہ تک خون کی لکیر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بی بی جان کے سالوں پہلے کہے بے رحم الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

''میں نہ کہتی تھی زریاب، نسب کے بغیر اصول کچھ نہیں ہوتا۔ جنگل کے پھول جنگلوں میں ہی رہ پاتے ہیں۔ تمہاری وہ بیوی چار دن تمہارے بغیر نہ رہ سکی۔ تمہارے جاتے ہی وہ تمہارا دوست فیروز جو خود کو اس کا بھائی بتاتا ہے، توبہ توبہ کیسے کیسے رشتوں کو پامال کرتے ہیں یہ بے ہدایتے لوگ، وہ روز ہی آ جاتا تھا ملنے، اس سے پہلے مجھے اعتراض نہ ہوا پھر لوگ باتیں بنانے لگے آخر کون سا سگا والا بھائی تھا۔ گھنٹوں کمرے میں بند رہتے تھے۔ میں نے صاف الفاظ میں ٹوکا تو وہ کھل کے ہی سامنے آ گئی۔ بے شرمی سے اپنے اور اس کے تعلقات کو تسلیم کرتے ہوئے کہنے لگی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تمہیں اپنا بیٹا مبارک ہو۔ جس نے مجھے یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ میں فیروز کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشیاں اسی کے پاس ہیں نامراد بچی تک چھوڑ گئی۔'' وہ چیخ اٹھا تھا۔

''بس کریں بی بی جان، آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں، کس کے متعلق کہہ رہی ہیں اور کس سے کہہ رہی ہیں۔'' اس وقت طیش کے مارے اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اپنا سر سامنے کی دیوار سے پھوڑ ڈالے۔ کیونکہ یہ لغو ترین بات کہنے والی اس کی معزز ترین بی بی جان تھیں جن سے بے ادبی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس قدر فضول باتیں۔

''پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے زریاب تمہیں یقین نہیں تو اپنے باپ سے پوچھو، میں تو ساس ہوں ناں اس کی اور تمہاری سوتیلی ماں، جھوٹ بھی کہہ سکتی ہوں، اس گھر کے ہر فرد سے پوچھ لو۔ کس بے شرمی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کر کے گئے ہیں تمہارا دوست اور تمہاری بیوی۔ دیکھو خان جی کی حالت اور جا کے دیکھو زر سانگہ کو۔ کیسے بے سدھ پڑی ہے۔ یہ تماشا بھی تو نیا ہی تھا اس گھر کے در و دیوار کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں میں زندہ ہی کیوں ہوں یہ سب دیکھنے کے بعد شاید تمہاری آنکھوں میں بے اعتباری کے رنگ دیکھنا باقی تھے یا شاید تم سے جھوٹا ہونے کا الزام سننا باقی تھا۔

''بے حیا میرے سامنے ہی کتنا گند بک گئی۔ کہنے لگی زریاب جیسے ٹھس مرد کے ساتھ کوئی عورت چار دن بھی خوش رہ لے تو بڑی بات ہے۔ ہر وقت رنگوں میں گم رہنے والا دیوانہ۔ میں تو فیروز جیسے مرد کے پیچھے مرتی ہوں جسے مرد کہنے میں بھی مزا آتا ہے۔''

بی بی جان کا یہ جملہ زریاب کو بھڑکا دینے کے لیے کافی تھا۔

''موم......نہ......'' وہ چیخا۔

''میں چھوڑوں گا نہیں اس ذلیل عورت کو نہ ہی اس بے غیرت شخص کو......میری آنکھوں میں دھول جھونکی دونوں نے۔'' غیرت و غصے سے وہ کپکپانے لگا۔

''دفعہ کرو مردودوں کو۔ تین حرف بھیج اس کافرن پہ، جانے دے جہاں مرضی خوار ہوتی پھرے۔ اس کمزل یہ گھر تھا ہی نہیں شکر ہے تمہاری بچی محفوظ رہی ہے۔''

''ایسے کیسے دفع کردوں...... وہ میری مردانگی کو گالی دے گئی ہے، فیروز میری دوستی کا خون کر گیا ہے۔ میں بے غیرتوں کی طرح بیٹھ جاؤں......نہیں بی بی جان...... میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ دیوار سے لٹکی رائفل اٹھا کے باہر لپکا۔

''زریاب......رک جاؤ'' وہ پکاریں باچا جان اٹھتے اٹھتے گر پڑے۔ اچانک ہی فالج نے ان پہ حملہ کر دیا۔ حضرتی بی بی نے ایک نظر شوہر کے اینٹھے ہوئے وجود پہ ڈالی دوسری نظر طوفان کی طرح باہر نکلتے کڑیل بیٹے پہ ڈالی۔ پہلی بار انہیں اپنے فیصلے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

☆☆☆

ہر ویلے تانگاں یار دیاں

میں تاں بیٹھی کاگ اڈاواں

وہ دو دن قیامت کے دن تھے۔ کہتے ہیں ناں روزِ حشر کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا۔ وہی حال میرا تھا ان دنوں، فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہ تھا..... میری سانسیں اُبھرتی تھیں، ڈوبتی تھیں اور ہر سانس کے ساتھ تسبیح کے دانے کی طرح ایک نام سینے میں گر جاتا تھا۔

زریاب......

میں پاگلوں، دیوانوں کی طرح حویلی کے دروازے تک دن میں کئی چکر لگایا کرتی۔ ہر آہٹ مجھے اس کے آنے کی خبر دیتی اور اسے نہ پا کے مارے جھنجھلاہٹ کے میں شریر ہواؤں سے لڑ پڑتی۔

☆☆☆

آپ ونجھاں کہ میں قاصد بھیجاں

میرا تھی گیا حال نماناں

فیروز لالہ سے جرح کر کر کے میں نے زچ کر ڈالا۔

مجھے یقین نہ آتا کہ وہ زریاب سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے لگتا جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔

''کہیں زریاب نے آنے سے انکار تو نہیں کر دیا، کہیں میرا بغیر اجازت گھر سے نکلنا اسے ناراض تو نہیں کر گیا، کہیں بی بی جان نے اسے بھی تو یہ کہہ کر نہیں ورغلایا کہ زرسانگہ سے جھگڑا بڑھانے میں ساری غلطی میری ہے۔''

میری ہر سوچ کی تان انہی خدشوں پہ آ کے ٹوٹ جاتی۔ اس کی ناراضگی کا ہلکا سا اندیشہ بھی مجھے بے جان کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں آس ہار کے بے دم ہونے لگتی تو کانوں کے پاس کسی کی سرگوشی میرا پھر سے حوصلہ بڑھا دیتی۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سڑ ساں

جے میں مکھ ماہی ولوں موڑاں

میں ہر خدشے جھٹک دیتی۔

نہیں نہیں میرا زریاب مجھ سے منہ نہیں موڑ سکتا، وہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتا......اس میں اتنا حوصلہ ہی کہاں ہے.......پھر......پھر......؟ پھر وہ آیا کیوں نہیں اب تک؟ میرے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا وہ کیسے انجان ہے؟ کیا اسے کسی سے اطلاع ملنے کی ضرورت ہے؟ وہ تو کہتا ہے......مومنہ تجھے پیاس لگتی ہے تو مجھے پتا چل جاتا ہے......میں گہری نیند میں محسوس کر لیتا ہوں تو نے کب کروٹ بدلی......پھر اسے پتا کیسے نہ چلا کہ وہ چہرہ......جسے دیکھ کے اس کی صبح نکھرتی ہے......اب داغدار ہو چکا ہے......سلگ رہا ہے اس کے پیار بھرے مرہم کے لیے ترس رہا ہے......زریاب......زریاب......تم کہاں ہو......''

ہاں میں سچ مچ دیوانی ہو گئی تھی۔

کملی کر کے چھوڑ وتو اے

تے بیٹھی لکھ گلیاں دے رولاں

مجھے نہ بھوک لگتی......نہ پیاس محسوس ہوتی۔ اپنی ننھی سی بچی کی ہڑک کبھی کبھی لہر بن کے پورے وجود پہ چھا جاتی مگر میں ممتا کو تھپک دیتی۔

''صبر......بس کچھ دیر اور......وہ آتا ہی ہوگا......مجھے انصاف دلانے......وہی تو ہے جو مجھے سب سے زیادہ جانتا ہے......نہ صرف جانتا ہے بلکہ مانتا بھی ہے......بس وہ آجائے پھر میں پوری شان سے وہاں لوٹوں گی، اپنے گھر......اپنی بچی کے پاس......بس وہ آجائے اس کے بغیر نہیں......اس کے بغیر میں کیا ہوں......؟ کچھ بھی نہیں وہ آئے گا میں سر اٹھا کے اس حویلی میں جاؤں گی پھر کس کی مجال ہے جو مجھے ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ لے......لیکن......وہ آئے تو سہی......وہ کیوں نہیں آتا......؟

''خان زریاب آگئے۔''

میری آنکھیں پتھرا چکی تھیں رستہ دیکھتے دیکھتے جب کسی نے مجھے یہ اطلاع دی تو میری پلک تک نہ جھپک سکی۔

''آگیا......زریاب......آگیا۔'' میں ننگے پیر اٹھ کے بھاگی۔

''مومنہ......رکو......وہ یہیں آئے گا۔'' لالئی نے پیچھے سے پکار کے مجھے روکنا چاہا۔

''مردانے میں اس وقت نجانے کون کون ہوگا، رک جاؤ۔''

لیکن میں کیسے رُکتی، بخار کی حدت سے تپتے میرے ننگے پاؤں ٹھنڈے پکے فرش پہ جھلس جھلس کے پڑ رہے تھے۔ میرے کئی دن کے بکھرے روکھے بے ترتیب بال اور بھی اُجڑ گئے۔ میرے اس طرح بھاگنے سے بے پروائی سے سر پہ ڈالی چادر بھی نیچے لٹک رہی تھی۔ حجرے کے پاس میرے پاؤں کے انگوٹھے میں چادر کا کونا پھنسا اور میں منہ کے بل دروازے پہ گر گئی، دہلیز پہ ایک اکھڑا ہوا کیل میرے ہونٹ پہ لگا اور دور تک نازک

ماس ادھڑ گیا۔ میں پاؤں سہلاتے ہوئے چادر کا کونا لبوں پہ رکھ کے خون دبا رہی تھی کہ اندر سے زریاب کی آواز آئی۔

''مومنہ کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟''

مجھے ایسا لگا جیسے اسے دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ میرے اندر کی اداسی کو اس کی آواز نے اور بھڑکا دیا۔ اُٹھنے سے پہلے میں نے درد کی شدتیں دباتے ہوئے بڑے اشتیاق سے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنا چاہا اور...... میں دھک سے رہ گئی...... فیروز لالہ کا گریبان زریاب کی گرفت میں تھا اور اس کی رائفل کا رخ لالہ کے سینے کی جانب۔ اس وقت لالہ کے چہرے پہ بھی وہی بے یقینی تھی جس نے ایکا ایکی مجھے جکڑ کے بت کر دیا تھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں کیا میری بیوی تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں...... وہ اندر......'' لالہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی زریاب نے اسے ایک زور کا جھٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں جوش سے باہر ابل رہی تھیں وہ مجھے بالکل اجنبی سا محسوس ہو رہا تھا...... ہاں بالکل اجنبی، اتنا اجنبی تو وہ مجھے تب بھی نہ لگا تھا جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

''مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم اسے زبردستی لائے ہو یا وہ اپنی مرضی سے آئی ہے؟''

''میں کیوں زبردستی کروں گا؟'' کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں بھی لالہ نے تحمل سے کام لینے کی پوری کوشش کی۔

''وہ اپنی خوشی سے، اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔'' اس کے اتنا کہتے ہی زریاب آپے سے باہر ہو گیا۔ رائفل کے بٹ کے زور پہ اس نے لالہ کو نیچے گرا دیا۔

''بے غیرت کتے، یہ اعتراف میرے سامنے کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی غیرت نہیں آ رہی...... اور کہاں ہے...... کہاں ہے وہ ناگن وہ بے حیا...... بے وفا عورت...... کمینی نسل کی عورت...... جسے عزت راس نہ آئی...... بلا اسے...... اس کے سامنے میں تیری لاش گراؤں گا...... تیری، جس کے ساتھ وہ اپنی ''خوشی'' اور ''مرضی'' سے آئی ہے اور اسے...... اسے میں یہاں نہیں ماروں گا...... بے وفا ہی سہی ہے تو میری بیوی...... اس کے نام کے آگے میرا نام لگا ہے اس کی ناپاک لاش میرے ہی گھر میں گرے گی۔ میں اس کا خون بھی کسی غیر زمین پہ بہانا پسند نہیں کرتا...... وہ کیا سمجھتی ہے میرے جیتے جی دوسرا یار ڈھونڈ نکالے گی۔''

''زر...... یاب......'' آنکھیں پھاڑ کے اس کے زہر اگلتے لہجے پہ غور کرنے والا فیروز لالہ جیسے کسی خواب سے جاگ کے دھاڑا تھا۔

''زریاب...... ہوش میں رہ کے بات کرو......'' وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں اسی طرح سنگی مورتی کی طرح جیسے دہلیز پہ نصب، گرنے اُٹھنے کے سے انداز میں اندر جھانکتی رہی۔ مجھے زریاب کے ہلاکت میں ڈال دینے والے جملے بھی سنائی دیے تھے اور فیروز لالہ اور اس کا ایک دوسرے پر جھپٹنا بھی دکھائی دے رہا تھا لیکن میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے خون ٹپک کے مٹی میں گر رہا تھا اور پتھرائی ہوئی بے یقین آنکھوں سے بے آواز آنسو اس خون کو پتلا کر کے مٹی میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے اب کبھی میں ہل سکوں گی نہ ہی بول پاؤں گی۔ اچانک فائر کی آواز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرے اس گمان کو توڑ کے رکھ دیا۔ لرزتی ٹانگوں پہ اُٹھتے ہوئے میں نے آخری بار فیروز لالہ کو خون میں لت پت زمین پہ گرتے دیکھا۔

حجرے کے دوسری طرف سے بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں، شاید فائر کی آواز نے ملازمین کو بھی چونکنے پہ مجبور کر دیا۔ میں نے زمین پہ گری چادر اٹھائی، اپنے گرد لپیٹی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔''

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن دروازے کے اس طرف کھڑی مقدس اور دوسری جانب اس کے قریب ہی بیٹھا خوشنود...... دونوں کتنی ہی دیر اس کے دوبارہ بولنے کے منتظر رہے...... لیکن...... مومنہ کے خشک لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔ ننھے ننھے ستارے پروئے ہوئی پلکیں بند ہو گئی تھیں۔ پپوٹوں کی ہلکی سی لرزش اس بت میں جان ظاہر کر رہی تھی۔

''پھر......؟'' خوشنود اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے دادا اور تایا سے باپ کی المناک موت کا واقعہ سن چکا تھا لیکن اس تفصیل سے سننے کے بعد اور وہ بھی ایسی ہستی کی زبانی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے زندگی سے موت کی جانب جاتے دیکھا تھا، ایک عجیب سی تکان اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طویل سرد آہ بھرنے کے بعد اس نے کافی دیر سے خاموش ساکت لیٹی مومنہ کو مخاطب کیا۔ اس کی پلکوں میں خفیف سی جنبش پیدا ہوئی۔

''پھر......؟ پھر بیس سال...... وہ بیس سال صرف میرے تھے ان بیس سالوں میں اور کوئی نہیں...... نہ زریاب...... نہ فیروز لالہ...... نہ مقدس...... نہ کوئی اور...... بس میں ہی میں...... بلکہ شاید میں بھی کہیں نہیں تھی۔ بس یہ بیس سال تھے...... خالی...... تنہا اکیلے...... بیس سال...... ان کا کیا بتاؤں تمہیں...... تم جاننا چاہتے تھے وہ میں نے بتا دیا ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ تم نے فیروز خان وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا اور اس کے اور لالئی کے مجھ پہ بہت سے قرض ہیں۔'' وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ خوشنود نے سہارا دے کے اسے بٹھایا۔

''خوشنود...... اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ تمہارا باپ بے موت ضرور مارا گیا لیکن بالکل بے قصور۔ وہ محبتوں کا گندھا آدمی تھا جہاں جاتا رشتے بنا لیتا یہی رشتے اسے ڈس گئے۔ زریاب نے اس کے جذبوں کو مٹی میں رول دیا۔ اس دن صرف فیروز لالہ نہیں مرا تھا...... خلوص اور مروت کی موت ہوئی تھی۔ سچائی کا خون ہوا تھا۔ میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ شخص مجھے تو کیا کسی عورت کو غلط نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا مجھے تو ہرگز نہیں۔ اس لیے بھی کہ اس نے مجھے بہن کہا بھی نہیں مانا بھی تھا اور اس لیے بھی کہ میں زریاب کی بیوی تھی، اس زریاب کی جسے اپنا سب سے قریبی دوست کہتا تھا وہ اور اس زریاب نے ہی......

میرے سالوں سے مرے ہوئے دل میں اچانک ایک شدید حرکت پیدا ہو جاتی ہے، جب مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نجانے زریاب کی طرح اور کتنے لوگ ہوں گے جو اس کے اور میرے رشتے کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کے بھی سب کو یقین دلا دوں کہ وہ میرا لالہ تھا میرا بھائی...... صرف اور صرف بھائی۔ تم...... تم تو یقین کرتے ہو ناں میری بات کا۔'' اس کے سرہلانے پر مومنہ نے سکون سے تکیے پر سر ٹکا دیا۔

''تو تمہاری تسلی ہو گئی اب۔''

''لیکن......'' دروازے نے بے آواز حرکت کی اور مقدس دو قدم اندر چلی آئی۔ اس کی آواز پہ خوشنود بری طرح چونک کے پیچھے پلٹا۔

مومنہ بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ساتھ اٹھ بیٹھی اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں ہلکے نیلے شلوار قمیص اور سفید بڑی سی چادر میں ملبوس اس کم عمر سی ''مومنہ'' پہ جمی تھیں جس کے چہرے پہ اتنی ہی تھکان تھی، آنکھوں میں اتنی ہی ویرانی تھی، جتنی کہ اس بستر پر پڑی ''مومنہ'' کی آنکھوں اور چہرے پہ تھی۔

''لیکن میری تسلی نہیں ہوئی...... میری...... یعنی مقدس زریاب خٹک کی...... بہت سے سوال ہیں جن کے جواب مجھے چاہئیں...... اگر ڈاکٹر خوشنود نے اپنے سوالات کے لیے فیروز علی وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کیا ہے تو میں زریاب خٹک کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں زریاب خٹک جو آپ کا شوہر ہے...... اب بھی...... ابھی تک...... آپ...... آپ...... مومنہ علی...... آپ میری ماں ہونے کی حیثیت سے مجھے جواب دہ ہیں۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بیڈ تک گئی۔ مومنہ ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر وہ اپنا تعارف نہ بھی کراتی تو تب بھی اسے سیکنڈ نہ لگتا مقدس کو پہچاننے میں وہی پیشانی...... وہی سنہری رنگت...... ہلکے ابروؤں پہ قطار کے ساتھ بنے وہی بھورے تین تل...... جو اس کے چہرے پر قدرتی تھے...... اور وہی نیلی کانچ سی دھلی دھلی آنکھیں۔

''یوں لگتا ہے جیسے نیلم کے ٹکروں کے گرد کسی نے ہیرے چور چور کر کے بکھیر دیے ہوں'' اس کی پلکوں پہ ٹنگے آنسو دیکھ کے مومنہ کو وہ بات یاد آئی جو زریاب نے اسے پہلی بار روتا دیکھ کے کہی تھی۔ اس نے سالوں سے سمٹے بازو اپنی بیٹی کے لیے پھیلا دیے۔ اس کا دل اچھل اچھل کے پسلیوں تک بجنے لگا اپنی لاڈلی کو چھاتی سے سمونے کے لیے لیکن...... لیکن وہ دل خود ہی حیران سا ہو کے رک گیا...... وہ بازو خود ہی پشیمان سے ہو کے گود میں دوبارہ آگرے جب اس نے مقدس کو کسی جذبے اور احساس کے بغیر وہیں کھڑے خود کو گھورتے پایا۔

''تو تم بھی...... تم بھی ان میں سے ہو جنہیں یقین کرنے کے لیے میری جان کی ضرورت ہے...... آہ...... مجھے خبر نہ تھی کہ میرا اپنا خون بھی مجھے بے اعتبار جانے گا۔''

''میں یقین کر سکتی ہوں بلکہ مجھے یقین ہے ان سب باتوں کی سچائی کا جو آپ نے کہیں لیکن......'' اس کے الفاظ پھر سے مومنہ کو زندہ کر گئے۔

''لیکن یہ آدھا سچ ہے۔ سچ کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ سچ کبھی مصلحت پسند نہیں ہوتا۔ سچ کبھی بزدل نہیں ہوتا...... سچ کو روپوشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کہہ رہی تھی ناں ابھی کہ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کر سب کو یقین دلا دوں کہ فیروز اور میرا کیا رشتہ تھا تو پھر...... آپ نے یقین کیوں نہ دلایا۔ آپ کے چہرے پہ ظلم کا یہ نشان گواہ ہوتا آپ کی بے گناہی کا۔ جو جھوٹ میرے باپ کو مشتعل کرنے کا سبب بنا تھا وہ اگر اتنا ہی بے بنیاد اور کھوکھلا تھا تو آپ ایک ہی وار میں اسے مسمار کر سکتی تھیں لیکن آپ نے ایسا نہ کیا...... آپ نے ایسا کرنے کی کوشش ہی نہ کی...... آپ فرار ہو گئیں...... کیوں...... کس لیے؟'' وہ پھٹ پڑی۔

''کیونکہ میں جاننے لگی تھی پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہوتے ہیں؟'' مومنہ نے سرگوشی کی، ایسی سرگوشی جسے صرف وہ ہی سن پائی تھی۔

''آپ بتاتی کیوں نہیں ایسا کیا تھا جس کو چھپانے کے لیے آپ کو خود چھپنا پڑا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ ضبط نہ کر سکی اور اتنی نقاہت کے باوجود چیخ اٹھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ خوشنود کے اندر کا ڈاکٹر

بیدار ہو گیا۔ اس نے فوراً اٹھ کے نرس کو بیل دی اور اتنے عرصے میں پہلی بار مقدس کو مخاطب کیا۔

''مس مقدس...... ہو سکے تو آپ کل تشریف لے آئیے ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ یہ کوئی شدید اعصابی اور جذباتی جھٹکا سہہ سکیں۔'' اس نے اسے دیکھے بغیر پیشہ وارانہ سی رائے دی۔ جسے ان سنی کرتے ہوئے مومنہ ہانپتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں کچھ چھپانے کے لیے فرار ہوگئی تھی نہ ہی اپنی جان بچانے کے لیے۔ میں اس کے ہاتھوں مر کے اس کی جھوٹی غیرت کی تسکین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں...... میں تین دن تک بھوکی پیاسی صرف اس کے انتظار میں راستے کا پتھر بنی رہی، اس کی راہ تکتی رہی۔ وہ آئے گا تڑپتا ہوا آئے گا...... میری حالت دیکھ کے اس کا خون کھول جائے گا...... مجھے ملنے والے ایک ایک زخم کا حساب لے گا وہ...... اور وہ آیا...... مجھے ایک نیا زخم دینے کے لیے۔ میری رہی سہی جان بھی نکالنے کے لیے...... مجھے مان دینے والے واحد شخص کو مجھ سے چھیننے کے لیے...... میں سہہ جاتی؟ بتاؤ میں ایسے ہی سہہ جاتی......؟ میں کچھ نہ کرتی؟ میں نے بھی وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا...... ایک ہاری ہوئی...... روندی ہوئی ریزہ ریزہ عورت کو کیا کرنا چاہیے تھا...... میں نے...... میں نے۔''

اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

''میں نے وہی کیا...... بالکل ٹھیک کیا...... زریاب کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔'' وہ نڈھال ہوگئی۔ خوشنود نے بے بسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی مقدس کو دیکھا وہ چپ چاپ الٹے قدموں باہر نکل گئی۔

نرس نے کچھ ہی دیر میں مومنہ کو پرسکون کر دیا۔ آکسیجن کی نالی اور مصنوعی دھڑکنوں کے سہارے وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ اس کا ہاتھ خوشنود کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنی الجھن سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے رہ رہ کے مقدس پہ غصہ آتا جو جاتے جاتے اسے بھی ایک سوال میں الجھا گئی تھی۔

اس عورت کے ایک ایک لفظ پہ ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔ خود اس کی ماں کی گواہی بھی کافی تھی اس لیے ہی تو وہ اتنی اپنائیت اور عقیدت کے ساتھ اسے پھوپھی جان کہتا تھا لیکن...... پھر وہ فرار۔ یہ اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ زریاب پہ اس کا غصہ سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن اولاد تک سے چھپ جانا؟ زریاب کو تو قانون نے سزا دی تھی۔ یہ الگ بات کہ بار بار کی اپیل نے سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا تھا لیکن پھر......

وہ سر جھٹک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''فی الحال مجھے ان کے مکمل صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔''

اس نے سوچا حالانکہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جس قدر خراب حالت میں وہ اسے اٹھا کے اس ہاسپٹل تک لایا تھا اس کے بعد اس کا نہ صرف زندہ بچ جانا بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اتنی دیر گفتگو کرنا بھی ایک معجزہ ہی تھا اور اب ایک اور معجزہ ہی ہوگا اگر مومنہ ان مصنوعی سہاروں کے بغیر بھی زندہ رہ لے۔

وہ پوری رات اس نے موت سے لڑتے لڑتے گزاری۔ ہر بار ہوش میں آنے کے بعد اس کے لبوں پہ مقدس کا نام ہوتا اور پھر وہ ڈھے جاتی۔ اس کی ڈوبتی نبضیں اور رکتی دھڑکیں خوشنود کو فکر مند کر جاتیں لیکن رات گزرتے ہی جیسے وہ پھر سے خدا سے زندگی مانگ لائی۔ شاید وہ خود بھی

کسی کے دل میں اپنے لیے بدگمانی اور خدشے چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتی تھی۔

''تم......تم خوشنود تم کیسے جانتے ہو مقدس کو؟'' ذرا سنبھلتے ہی اس نے سوال کیا۔ ایسا سوال جس کا اصل جواب دینا شاید خوشنود کے لیے خود کو ہار دینے کے مترادف تھا۔

''بس کچھ ہی دن پہلے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی لیکن درحقیقت وہ پہلے ہی آپ کی تلاش میں تھیں۔ انہیں کسی نے آپ کے لاہور میں ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ آپ کے ساتھ رہنے والی اماں برکتے تک تو وہ پہنچ ہی چکی تھیں اور ایک دن اماں کو میرے ساتھ دیکھ کے مجھ سے پوچھنے لگیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ ان کا آپ سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے، میں کچھ سوچے سمجھے بغیر آپ کے پاس لے آیا۔ مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا تو پہلے آپ سے ذکر کر لیتا۔''

''میں نے کہا بھی تھا کہ کسی کو میرے متعلق پتا نہ چلے اور کیا تمہیں اس کی صورت دیکھ کے بھی کچھ محسوس نہ ہوا۔''

''ہوا تھا......بہت کچھ محسوس ہوا تھا۔'' وہ کھویا کھویا سا سامنے رکھے پھولوں کو بے دھیانی سے تک رہا تھا۔

''تمہیں تو اسے دیکھتے ہی پتا چل جانا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔''

''میں نے کہا ناں......'' وہ خود کو بھی بھلا چکا تھا۔

''میں نے کہا ناں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں......اس سے ہٹتا تو کہیں جاتا۔ مجھے کچھ یاد نہ تھا نہ آپ کی ہدایت نہ کچھ اور......وہ سامنے ہو تو پھر مجھے بس......''

''خوشنود'' مومنہ بے یقینی سے پکار بیٹھی۔ اس کی غبار غبار ہوتی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ خفت سے اس کا گندمی چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔

''خوشنود بس ایک بار اور میری مدد کرو۔ مقدس کو ایک بار میرے سامنے لے آؤ مجھے اسے کچھ کہنا ہے......اب تو مجھے اس سے سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ بات صرف میری نہیں رہی۔ وہ کہانی جو مجھ سے شروع ہوئی تھی۔ وقت نے اس میں کتنے کردار شامل کر دیے ہیں، مجھے اب ہر کردار کا حق پورا کرنا ہے اسے بلاؤ۔''

''نہیں پھوپھی جان، اس نے اپنی معذوری ظاہر کی۔

''آپ میرے لیے قابل احترام سہی لیکن میں کیسے بھولوں کہ وہ خان زریاب خٹک کی بیٹی ہے۔ مجھے اس کے سامنے جانے پہ مجبور مت کریں۔ میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔''

''وہ صرف تمہارے دشمن کی بیٹی نہیں تمہاری پھوپھی کی بیٹی بھی ہے اور تمہاری پھوپھی ان مہمان سانسوں کے ساتھ اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھنے کی خواہش کر رہی ہیں۔ کیا تم اس کی یہ خواہش پوری کرو گے۔''

وہ چپ چاپ نمبر پش کرنے لگا۔

''نہیں ڈاکٹر خوشنود...... میں نہیں آسکتی۔ جس ماں کی تلاش نے مجھے اتنا بھٹکایا، اس کے مل جانے نے مجھے اور الجھا دیا ہے جب تک وہ میری اس بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیں گی کہ وہ کیا وجہ تھی جس نے انہیں اپنی اولاد تک کو فراموش کر دینے پہ مجبور کر دیا۔ میں کبھی انہیں اپنی ماں تسلیم نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی بچپن کی تمام خوفزدہ کر دینے والی راتوں اور محروم اجاڑ دنوں کا حساب چاہیے۔''

''خدا سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کی ماں کو اس حساب کتاب کے لیے زندہ رکھے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی...... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ مس مقدس کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں اس حقیقت کو جھٹلا تو نہیں سکتیں کہ وہی آپ کی ماں ہیں۔ ایک اکلوتی اولاد ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ ان کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کے کیا فرائض تھے کیا نہیں، اس بحث میں پڑنے کا فی الحال وقت نہیں ہے۔'' اس نے صاف صاف کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی توقع کے عین مطابق آدھے گھنٹے کے اندر اندر مقدس وہاں موجود تھی۔ اس کے کترا کے نکل جانا چاہا لیکن مومنہ نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کے لیے کہا۔

''مقدس! میری بیٹی! کیا تمہارے دل میں اپنی ماں کے خلاف اتنا زہر بھر دیا گیا ہے کہ برسوں بعد ملنے کے باوجود تم نے اپنی ماں کے گلے لگنا گوارا نہ کیا۔ میری بانہیں پھیلی رہ گئیں اور تم...... واپس چلی گئیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں میرے دل میں زہر ہے نہ ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک۔ آپ نے جو کچھ بھی کہا میں اس کا یقین کرتی ہوں اور آپ اور جو بھی بتائیں گی میں اس کا یقین کر لوں گی لیکن آپ بتائیں تو سہی...... مجھے جواب تو دیجیے کہ مجھ سے...... میری ذات سے آپ کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا جو آپ نے خود کو اتنا چھپا کر رکھا۔''

''مجھے تم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا میں صرف خود سے خوفزدہ تھی۔ اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی تھی، اپنی ممتا سے خائف تھی مجھے خطرہ تھا تو اس بات سے کہ کہیں میرے اندر کی محبت پھر مجھ پہ حاوی نہ ہو جائے۔''

''اپنی اولاد سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھیں آپ کیوں؟'' وہ بے بسی سے گرنے کے انداز میں نزدیکی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

''میں آپ کی ہی مبہم باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیا اتنے سالوں میں کبھی آپ کو مجھے کھو دینے کا ملال نہیں ہوا۔ کبھی بھی آپ میرے لیے نہیں تڑپیں۔ کبھی میرے لیے فکر مند نہیں ہوئیں؟''

''میں نے تمہیں کھویا نہیں تھا مقدس میں خود کھو گئی تھی اور دیکھو آج تمہیں مل گئی ہوں۔ تم مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھیں صرف میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھیں پھر ملال کس بات کا۔ ہاں کسک تھی سو وہ تو نصیب کا ایک حصہ جان کے سنبھال لی سینے میں۔ میں تو یہ جان کے خود کو مطمئن کر لیتی کہ تم اپنوں میں ہو۔ اپنے باپ کے گھر...... اپنے خاندان کے ساتھ...... ایک مضبوط چھت کے نیچے۔''

''ہونہہ...... اپنے۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔

''میں نے بیس سال اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے گزارے ہیں۔عمر کا آدھا حصہ...... ہاں وہ حصہ جس میں کسی بھی انسان کو ماں باپ کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ حصہ میں نے ان دونوں رشتوں سے یکسر انجان رہتے ہوئے گزارا۔ بہت سے لوگوں کے ماں باپ نہیں ہوتے، کئی پیدائشی یتیم ہوتے ہیں لیکن وہ کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ ان کے ماں باپ کی قبریں کہاں ہیں؟ وہ کون تھے کیسے تھے؟ اور میں...... میں تو اتنا بھی نہیں جانتی تھی میرے ماں باپ زندہ ہیں یا پھر......

میں تو اپنی ماں کے نام سے بھی انجان تھی۔ بیس سال بعد میں جان پائی کہ وہ دونوں زندہ ہیں اسی زمین کے کسی کونے پہ موجود ہیں۔ بابا جان کے مجھ سے دور رہنے کی وجہ کیا تھی وہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن آپ تو آزاد تھیں پھر کیوں یہ خودساختہ دیواریں کھڑی کر لیں۔''

''میں آزاد کب تھی...... میں آزاد کب ہوں۔ تم جانتی ہو مقدس پھولوں کے رنگ سیاہ کیسے ہوتے ہیں...... میں بھی نہیں جانتی تھی...... تمہارا باپ جانتا تھا لیکن وہ مجھے بتا نہیں پایا پھر...... پھر میں خود بھی جاننے لگی جب کسی پھول کو محبت کا پانی ملنا بند ہو جائے...... اس کی جڑوں میں زہر اتر جائے تو...... تو آہستہ آہستہ وہ کالا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ میری جڑیں بھی ایک دم زہریلی ہو گئی تھیں...... میرے دل کے کالے پن نے مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کیا۔''

''کیا؟'' وہ بے تابی سے بول اٹھی لیکن مومنہ کا دھیان اس پہ نہیں تھا وہ اپنی ہی کہتی رہی۔ ''اور جانتی ہو اس پھول سے نازک دل کو کالا کس نے کیا۔ نفرت نے...... نفرت چیز ہی ایسی ہے، پیار چاہے تو پتھر میں بھی خوشبو بھر دے اور نفرت...... نفرت بھی کمزور جذبہ نہیں۔ نفرت چاہے تو پھول میں آگ لگا دے۔ مجھ جیسی محبتوں کی ماری کو جھلسا کے سراپا شعلہ کر دے میں نے اس نفرت کو سنبھال کے رکھ لیا اس نفرت کے بغیر میں بڑی کمزور تھی۔ محبتیں کمزور بنا دیتی ہیں نا...... میں نے نفرت کے سہارے مضبوط بننا چاہا، اتنی سنگدل بننا چاہتی تھی میں کہ......'' وہ بولتے بولتے رک گئی اک نظر دونوں کو دیکھا۔

''کہ زریاب کو سزا سناتے ہوئے میرا دل نہ کانپے۔''

''مگر زریاب خٹک کو قانون نے سزا دی تھی۔'' اب تک لاتعلق بیٹھا، خوشنود کہہ اٹھا۔

''ہاں...... قانون نے ہی سزا دی تھی۔ فیروز لالہ کے قتل کی...... لیکن...... زریاب قاتل نہیں ہے۔'' مومنہ نے کہا۔

☆☆☆

''کیا کمایا تو نے حضرتی؟'' بی بی جان نے اپنے گورے، پھولے پھولے مگر گہری لکیروں سے بجی سخت ہتھیلی والے ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

''زندگی میں سب کچھ ''بھرم'' ہی تو نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے یہ ''بھرم'' اتنی کھوکھلی چھت...... اتنی ہلکی چادر...... یہ کیا سر چھپائے گی۔ پھر بھی فقط اسے سلامت رکھنے کے لیے انسان سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بھرم ہی تو تھا جس نے اتنے سالوں تک یہ کھیل مجھ سے کروایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے بیٹی کی محبت نے یہ سب کرنے پر مجبور کیا لیکن پھر...... پھر کیا ہوا...... نہ بیٹی رہی...... نہ اس کی خوشیاں...... بیٹا بھی نظروں سے دور

ہوگیا۔ اس کے بعد صرف یہ کم بخت بھرم ہی تو رہ گیا تھا جسے بچانے کے لیے اتنے سال تسلسل سے یہ تماشا ہوتا رہا۔ کیسے اپنے بچوں کی نظر میں خود کو ہلکا کرتی میں، اپنے گناہوں کا اعتراف کرکے، لیکن وقت سے بڑا جابر اور کون ہے...... منوا ہی لیا مجھ سے سب کچھ...... اگر یہ سب یونہی ہونا تھا تو...... درمیان کے بیس سال کیوں آئے، اگر آج مجھے اپنی اولاد کی نظروں سے گرنا ہی تھا تو کیوں بے کار اتنی زندگیاں برباد ہوئیں۔''

وہ خاموشی سے اپنا احتساب کرتی رہیں۔ تمام قصہ کہہ دینے کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکیں۔ زریاب کی حیران بے اعتبار اور افراسیاب اور دراب کی ملامتی نظروں کی وہ تاب نہ لاسکیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ اپنے اندھیرے کمرے میں اپنے زندہ رہنے کا کوئی جواز ڈھونڈ رہی تھی۔

بے شک ضمیر نے یہ کوڑا آج پہلی بار لہرا کے انہیں مارا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بیس سال تک ان کا ضمیر دل کے کسی کونے میں سویا رہا تھا۔ وہ تو عرصے سے چٹکیاں بھر رہا تھا اور اس نے تو پہلی چٹکی تب بھری تھی جب ان کی آنکھوں کے سامنے زریاب بندوق لہراتا ہوا نکلا تھا۔

انہیں اپنے اقدام کے سنگین نتائج کا اندازہ تب ہی ہوگیا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی زریاب بیوی سے بدگمان ہو کے اس سے تعلق توڑ لے گا اور یوں وہ بڑی آسانی سے مومنہ کا پتا صاف کر پائیں گی لیکن زریاب خٹک جیسے پختون النسل کے سامنے اس کی بیوی کے خودساختہ معاشقے کی تفصیل اتنے بے رحم الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ بھول گئیں کہ بھلے اپنے اصل سے وہ کتنا ہی دور دور رہا ہو، ہے تو ایک ''خانزادہ'' ہی جسے غیرت سے آگے کچھ سوجھتا نہیں۔ اسے بھی کچھ نہ سوجھا۔ پل بھر میں جان سے عزیز بیوی اور قابل اعتبار یار کے خون کا پیاسا بن گیا اور یہ پیاس اسے پھانسی کے تختے تک لے گئی۔

زرسانگہ اپنی حرکت کا اتنا سخت انجام سہہ نہ سکی اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ ذہنی حالت تو اس کا دن بدن کمزور ہوتا ہی جا رہا تھا یہ آخری اور شدید جھٹکا اس کا کمزور دماغ سہہ نہ سکا اسے ہر غم سے بے نیاز کر گیا۔

خان جی، وہ تو تب ہی لڑکھڑا گئے تھے جب انکا بیٹا خون کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے چلا تھا۔ ان کو فالج کا پہلا حملہ اسی دن ہوا تھا پھر زریاب کی گرفتاری، موت کی سزا، بیٹی کی اچانک موت یہ سب حادثات انہیں بستر تک کا ہی کر گئے۔ برسوں سے وہ اپنے رعب و دبدبہ والے اونچے لمبے خان جی کو بستر پہ مفلوج بے بس، بے زبان پڑا دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ لیکن جو جھوٹ بول دیا تھا وہ نبھانا تو تھا ہی۔ اب سچ کہہ بھی دیتیں تو کیا ہوجاتا۔ کیا فیروز زندہ ہوجاتا؟ زریاب آزاد ہوجاتا؟ یا زرسانگہ لوٹ آتی؟ وہ چپ چاپ اس چٹکیاں بھرتے ضمیر کو نظر انداز کرتی رہیں اور مقدس...... اس کی صورت ایک مسلسل عذاب ان کے سر پہ بیس سال تک مسلط رہا۔

مقدس کی صورت میں ایک چلتی پھرتی مومنہ کیا کم سزا تھی ان کے لیے...... اس کی صورت انہیں وہ سارا واقعہ بھولنے نہ دیتی راتوں کو اس کا مچل مچل کے رونا ان کے دل میں کچوکے لگاتا۔ ہر کمرے میں گھٹنوں گھٹنوں چل کے جاتی اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی وہ روتی صورت کی بچی انہیں خود سے سوال کرتی محسوس ہوتی۔ وہ چڑ جاتیں اس کے سامنے کم سے کم آتیں۔ مخاطب کرنے کی نوبت تو اکثر آتی ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں اس حویلی کی تاریخ سے مومنہ کا باب ہی مٹ جائے۔ کسی کو یاد نہ رہے کبھی زریاب کی کوئی بیوی یہاں آئی بھی تھی اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہی تھیں۔ بڑی بہو یہاں نہ ہونے کی وجہ سے سارے قصے سے لاعلم تھی ہی، چھوٹی بہو اس واقعے کے کئی سال بعد آئی۔ سب مومنہ کے بارے میں وہ ہی جانتے

تھے جو بی بی جان نے زریاب سے کہا تھا۔

دراب بھائی کی طرف سے ملنے والی شادی کی تصویروں میں سنہری بالوں، گلابی اور سنہری رنگت والی، بلوری سی آنکھوں والی بھابی کو غیر ملکی ہی سمجھا اور کسی نے اس کی یہ غلط فہمی عرصہ تک دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجتاً اکثر لوگ یہی جانتے تھے کہ زریاب کی بیوی کوئی ''میم'' تھی۔ اس کا ذکر اس گھر میں ممنوع تھا۔

شاید رفتہ رفتہ لوگ اس قصے کو یکسر فراموش کر دیتے اگر...... مقدس کا وجود نہ ہوتا۔ اسلیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بے ضرر وجود سے نفرت کرنے پہ مجبور ہو گئیں اس کی سوال کرتی آنکھیں انہیں زہر لگتیں انہیں ایسا لگتا جیسے مومنہ سامنے آکھڑی ہو اور کہہ رہی ہو۔ کیوں؟ بی بی جان کیوں؟''

''آہ کیوں؟'' وہ خود کو کوسنے لگیں۔ ''کیوں میں ایک مومنہ کے بعد دوسری مومنہ سے کھیلتی رہی۔ کیا اس کی ماں کافی نہیں تھی میری نفرتوں کی تسکین کے لیے جو میں اس معصوم سے بھی بدلے لیتی رہی شاید میں ڈرتی تھی وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی ماں کا بدلہ مجھ سے لینے میرے مقابل آجائے۔ ہائے حضرتی تو نے کیا کیا...... کیا زریاب کا اس کی نسل کا اس خاندان پہ کوئی حق نہ تھا کیا اس کے حصے کی خوشیاں ہی رہ گئی تھیں تیری بیٹی پہ قربان ہونے کے لیے۔ تیری وجہ سے وہ در بدر ہوا، اس کا گھر اُجڑا۔ اس کی بیوی رسوا ہوئی پھر بھی تو نے بس نہ کیا اس کی معصوم امانت تک کو کچلتی رہی تمہاری کھسائی ہوئی انا'' وہ اٹھیں اور خان ارباب خٹک کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

کئی دنوں سے بے چین اور مضطرب خان ارباب خٹک کے ضعیف چہرے پہ اس وقت اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ ان کا ابھری رگوں والا لانبا ہاتھ ابھی تک زریاب کے ہاتھوں میں تھا بلکہ شاید جب سے وہ لوٹا تھا یہ ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ وہ تھکے تھکے قدم چلتی ان کے سرہانے پہنچ گئیں۔

''خان جی!'' انہوں نے سرخی مائل سوجی آنکھیں جھکائے جھکائے عرض کی۔

''خان جی! مجھے معافی دلا دیں، مجھے زریاب سے معافی دلا دیں خان جی......'' ان کے لہجے میں اتنی عاجزی تھی، اتنا کرب تھا کہ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بی بی جان! مجھے گناہ گار مت کیجئے اس طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے مت کھڑی ہوں کیوں مجھے میری ہی نظروں سے گرانا چاہتی ہیں آپ؟'' اس نے شانوں سے تھام کے انہیں اپنے قریب بٹھایا۔

''نظروں سے تو میں گر گئی ہوں لیکن مجھے گلہ نہیں یہ میرے اپنے اعمال ہیں جنہوں نے میری بزرگی ساری نسل کے سامنے پامال کی۔ میں کسی رعایت کی مستحق تو نہیں لیکن معافی کا حق تو رکھتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو زریاب...... تم مجھے معاف کر دو۔ مقدس مجھے معاف کر دے تو شاید دل کچھ ٹھہر جائے ورنہ اب اپنے ہی دل کی ملامتیں سہی نہیں جاتیں۔ نجانے مومنہ...... مومنہ کہاں ہو گی اس وقت۔'' زریاب جیسے کسی خواب سے چونکا تھا۔

''ہاں...... مومنہ...... مومنہ کہاں ہو گی......؟ تم کہاں ہو گی مومنہ؟''

''وہ ہوتی تو میں اس سے بھی معافی مانگ لیتی۔ میں صرف تمہاری ہی مجرم نہیں ہوں میں اس عورت کی مجرم بھی ہوں جو نجانے کتنے خواب آنکھوں میں سجا کے اس گھر میں سہاگن بن کے آئی تھی۔ میں اس معصوم بچی کی مجرم بھی ہوں، اپنے بیٹے کی...... اپنے دل کے ایک

ٹکڑے کی...... میں نے تمہیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔''

''نہیں بی بی جان......! آپ کم از کم میری مجرم تو نہیں ہیں۔ میں اپنی بربادی میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا۔ بلکہ آپ کو بھی نہیں۔ اپنی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ خود میرا ہے میری بے اعتبار محبت کا۔ بلکہ آپ تو مومنہ کی مجرم بھی نہیں اس کا سب سے بڑا مجرم میں ہوں۔ میرے اندھے جذبات اور جنون اسے لے ڈوبے۔ اپنی بیٹی کی تمام تر محرومیوں کا سبب بھی میں ہی ہوں۔ اس سارے قصے میں مجھے اور تو کوئی مجرم نہیں دکھائی دیتا سوائے اپنے۔ یہ میں ہی تھا بی بی جان...... یہ میرا کمزور عشق تھا جو بدگمانی کا ایک ہلکا سا وار نہ سہہ سکا۔ آپ کیوں معافی مانگتی ہیں بی بی جان...... معافی تو مجھے مانگنا ہے مقدس سے...... مومنہ سے......''

''زر...... تم نے...... حضرتی کو...... معاف...... بیٹا...... اپنی بہن...... بہن کو...... بھی......'' باچا نے اسے متوجہ کر کے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''ہاں زریاب...... اپنی بہن کے لیے تمہارے دل میں جو گلے شکوے ہیں، وہ دور کر لو...... اس کی روح کو پچھتاوے کے بوجھ سے آزاد کردو...... اس کی بخشش کے لیے دعا کرو۔'' بی بی جان نے التجا کی۔

''میں نے کہا ناں بی بی جان...... میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔ اس دل میں اپنے ہی ملال اس قدر ہیں کہ......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اندرو اندر دی وگدا ہندا

پانی درد حیاتی دا

(اندر ہی اندر کہیں بہتا رہتا ہے زندگی کے درد کا پانی)

''اور یہ درد تو میں نے خود مہمان کیا ہے...... یہ پچھتاوے تو میں نے خود آگے بڑھ کے خریدے ہیں۔ وہ سارے عہد وہ سارے پیان میں نے ایک پل میں بھلا دیے مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

اس کے صبیح چہرے پہ نور کا وہ ہالہ

اس کے نکھرے سچے لہجے میں کو کتے وعدے

اس کی شفاف آنکھوں کے آئینے

اور اپنا وہ وعدہ...... جو میں نے کبھی بڑے سچے دل سے کیا تھا۔ اسے یاد آنے لگا۔

میں تاں دوزخ سڑساں

جے میں مکھ ماہی ولو موڑاں

اور میں نے مکھ موڑ لیا...... کس سفاکی کے ساتھ...... کس بے دردی کے ساتھ اور کس بھدے پن کے ساتھ سالوں بعد آج وہ اس کمرے میں موجود تھا جس کی دیواریں اس کے جنون خیز عشق کی ہر ہر ادا کی راز دار تھیں۔ وہ جدھر جدھر جاتی زریاب اسے تکے جاتا۔

آئینے کے سامنے پل دو پل رک کے ریشمی بالوں کی پہلے سے کی گئی چوٹیوں کے بل اور کستی ہوئی اکتائی اکتائی سی مومنہ......

''اُف یہ بال، کتنی سکھی تھی میں نانی سے بال گندھوا کے دو دو دن فکر ہی نہ ہوتی تھی اور اب......'' وہ مڑ کے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتی۔

''تمہاری نئی نئی فرمائشیں......مینڈھیاں مت کرو......بال کھلے چھوڑو......وغیرہ......وغیرہ......بھلا تمہیں میرے بالوں سے کیا؟''

''کیا کہا؟ پھر سے کہنا'' تکیے پہ سر رکھے ہوئے اسے دیکھتے دیکھتے وہ اچانک اٹھ بیٹھا۔''مجھے کیا؟ مجھے نہیں تو اور تمہیں مطلب ہوگا ان بالوں سے؟ اتنے خوبصورت ریشمی اور لمبے بالوں کی قدر ہی نہیں عجیب رسیاں سی بن کے جال پھیلا دیتی تھیں سر پہ اور اب بھی کون سا میری ''نئی نئی فرمائشیں'' پوری ہو رہی ہیں۔ بال کھلے رکھنا تو ایک طرف تم میری پسند کے مطابق ڈھیلے سے بل والی چوٹی بھی نہیں کرتیں کس کس کے یہ دو سینگ لٹکا لیتی ہو۔'' وہ اس کی دو چوٹیوں پر تنقید کرتا۔

''کیا کروں، ڈھیلے بالوں میں سر دکھنے لگتا ہے۔ اتنے سالوں کی عادت جو ہے لیکن......رنگ جاؤں گی آہستہ آہستہ تمہارے رنگ میں صیب۔'' جب بھی وہ ترنگ میں ہوتی تو اس کے چڑنے کے باوجود اسے ''صیب'' کہہ کے ضرور پکارتی۔

''سنو!'' اس کا لہجہ بدل جاتا اسے آئینے کے آگے سے ہٹتے دیکھ کے۔

''تم کچھ دیر اور کھڑی رہو ناں یہاں۔''

''کیوں؟''

''اچھا لگتا ہے تمہیں ایک نظر میں ہی ''دو دو'' بار دیکھنا۔'' اس کی وارفتگی پہ اس کے نین شہد ٹپکانے لگتے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا اس دریچے کے قریب آیا جہاں صبح صادق کے وقت بیٹھ کے عبادت کرنا مومنہ کو بے حد پسند تھا۔ زریاب بھی صبح خیز تھا لیکن اس نے تو شاید کبھی پو پھٹنے کا انتظار بھی نہیں کیا ہوگا۔ سورج کی پہلی کرن کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہ ہمیشہ اس دریچے کے پردے ہٹا کر کھڑی ہو جاتی اور جب وہ جاگتا اسے ڈھونڈتا ہوا سیدھا یہیں آتا، اسی دریچے کی طرف جو اس کے کمرے کے ساتھ متصل اسٹوڈیو کی پچھلی طرف کھلتا ہے۔ اس نے گرد اور سیلن سے بھری اسٹوڈیو کی فضا میں سانس لینے میں دشواری سی محسوس کی۔ پرانے کاغذوں کے ڈھیر نے عجیب سی مہک پیدا کر رکھی تھی، اور خشک ہوتے پینٹ سیلن زدہ سی بدبو پیدا کر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے پردے کھینچے۔ مختصر سی بالکونی میں پتھر کا وہ بینچ آج بھی موجود تھا لیکن اس پہ جامن کے گہرے گہرے رنگ والے پتوں کا سایہ نہ تھا۔ ایک ٹنڈ منڈ سا درخت افسردہ سا جھانک کے نجانے کسے ڈھونڈ رہا تھا۔ بینچ کے ساتھ ابھی بھی قطار میں وہ گملے لگے تھے لیکن نہ تو ان میں گلاب باقی تھے نہ موتیا۔ وہ تھکا تھکا سا اس گرد میں اٹے بینچ پہ بیٹھ گیا لیکن اگلے ہی لمحے تڑپ کے اٹھا تھا جیسے یہاں اس مقام پہ بیٹھ کے اس سے کوئی بے ادبی سرزد ہو گئی ہو۔ اسے یاد آیا مومنہ کا صبح کی اولین ساعت جیسا ہی پاک اور معصوم چہرہ......سفید سوتی دوپٹے میں لپٹا ہوا......وہ یہیں اسی بینچ پہ بیٹھ کے تلاوت کرتی تھی اور سامنے بیٹھا عقیدت سے اسے تکا جاتا۔

اس کے غیر محسوس سی حرکت کرتے گلابی لبوں کو......ہل ہل کے پڑھتے ہوئے کانوں میں ڈولتی بالیوں کو......

جھکی ہوئی آنکھوں کی لرزیدہ پلکوں کے سائے کو......

سورج کی کرنوں سے دمک اٹھنے والی ناک کی لونگ کو......

پیشانی پہ آویزاں اس پرنور سے عکس کو......

کیوں......؟

کیوں......؟

کیوں بھلا دیا میں نے اس نور کو......؟ کیوں نہ اس وقت مجھے یہ پاکیزگی یاد آئی......؟ کیسے یقین کر لیا میں نے مومنہ......مومنہ اور فیروز......کیا یہی تھا میرا عشق، یہی تھی میری محبت......؟ یہی دعوے کیے تھے میں نے......اتنی بودی محبت......اتنے کھوکھلے عہد......میں جو خود کو بڑا روشن دماغ تعلیم یافتہ، سلجھا ہوا اور میچور شخص سمجھتا رہا ہمیشہ خود کو اس سارے روایتی اور دقیانوسی سیٹ اپ میں اجنبی تصور کرتا رہا، اصل میں کیا نکلا؟ ایک جاہل، کم نگاہ، وہی فرسودہ اور روایتی مرد......جو کسی تیسرے شخص کی بے سروپا باتوں پہ بغیر کسی ٹھوس اور واضح ثبوت کے ہی ایمان لے آتا ہے......جو غیرت اور انا کے آگے محبت اور اعتبار جیسے جذبوں کے پرخچے اُڑا دیتا ہے......اور......جو......''

''خان صیب......خان صیب''

وہ پتا نہیں اور کتنی دیر خود کو کٹہرے میں کھڑا کر کے خود ہی پتھر مارتا رہتا کہ اورنگزیب کی آواز پہ چونک اٹھا۔ اسٹوڈیو سے نکل کے دیکھا تو وہ عجیب وحشت زدہ انداز میں کمرے میں گھوم گھوم کے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیا بات ہے اورنگزیب؟'' اس نے متوجہ کیا۔

''وہ......خان صیب......بڑے خان جی......اپنے باچا جان گزر گئے۔'' وہ دھاڑیں مارنے لگا۔

☆☆☆

''لیکن زریاب...... وہ قاتل نہیں ہے۔'' مومنہ کے اس انکشاف نے خوشنود اور مقدس دونوں کو دم بخود کر دیا۔

حیرت کا ایک برفیلا شکنجہ تھا جس نے ان دونوں کو یوں منجمد کر دیا کہ وہ کوئی اور سوال کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ سختی سے آنکھیں بند کر کے لیٹی مومنہ نے کچھ دیر کسی آواز کا انتظار کیا اور پھر رک رک کے بتانے لگی۔

''ہاں وہ قاتل نہیں ہے لیکن...... صرف قانون کی نظر میں ہی اسے بے قصور ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مجھ سے پوچھو...... مجھ سے پوچھو کہ اس کے فنکار ہاتھوں پہ کس کس کا لہو ہے...... مجھ سے حساب مانگو میں بتاتی ہوں اس سے کتنے قتل ہوئے ہیں۔ کتنے جذبے بے موت مارے گئے ہیں، کتنے خواب سولی چڑھے ہیں، کتنی آرزوئیں سسک سسک کے فنا ہوئی ہیں اور کتنی محبتوں کا خون ہوا ہے اس شخص کے ہاتھوں...... لیکن...... سوائے میرے اس لیے...... صرف اس لیے میں نے......'' اس کی بار بار اٹکتی زبان تھک کے رک گئی تھی۔

''آپ نے پہلے اتنے جھوٹ کیوں بولے...... وہ ساری جھوٹی کہانی......'' خوشنود نئے سرے سے مخمصے میں پڑ گیا۔

''نہیں...... میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔ میں نے پہلے تم سے جو کہا تھا اس کا حرف حرف سچائی لیے ہوئے ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے تم سے بہت سی باتیں چھپالی تھیں۔ کچھ پردے پڑے رہنے دیے تھے۔'' وہ الزام سہہ نہ سکی اپنی صداقت تسلیم کرانے کے لیے جیسے اس میں نئی قوت پیدا ہوگئی۔ اس کی آواز اب پہلے سے بلند اور واضح تھی۔

''میں کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے ہی تو میں وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور سچ...... سچ بتانے سے زریاب کو سزا نہ مل پاتی اور میں اسے سزا سے کیسے بچنے دیتی۔ کیا غیرت اور حمیت صرف مردوں کی میراث ہے۔ کیا اپنی عزت پہ بن آتے دیکھ کے خون کی ندیاں بہانا صرف مردوں کا شیوہ ہے۔ کیا کسی عورت کے اندر بدلے کی آگ نہیں بھڑک سکتی جب اس کی وفا اور عزت پہ وار کیا جائے۔ کیا عورت کے اندر وفا، ممتا اور محبت کے خزانے بھر کے قدرت غیرت اور وقار رکھنا بھول گئی تھی؟ نہیں...... عورت بھی اپنی ذات اور اس کے تقدس کے حوالے سے اتنی ہی غیرت مند ہوتی ہے جتنا کہ ایک مرد اور پھر میرے جیسی عورت...... جس نے عزت کو محبت پہ ترجیح دی ہو۔ پہاڑوں نے اپنی گود میں لے کر جسے بچپن سے ہی اپنی جیسی سربلندی اور پختگی عطا کر دی ہو، جو تن تنہا جنگلوں میں بسنے والی غیر قوم کے ساتھ سراٹھا کے ایک عمر بتا چکی ہو۔ میرے لہو میں یہ سرکشی گردش کر رہی تھی میں خود پر اٹھنے والی نگاہ بھسم کرنے کی قوت رکھتی تھی، خود پہ اٹھنے والی انگلی کیسے سلامت رہنے دیتی۔

تمہارے باپ نے مجھے پہاڑوں کی گود سے نکالا، شہر میں بسایا لیکن وہ میرے اندر کی خودسر اور غیور بنجارن کو مکمل طور پر تبدیل نہ کر پایا۔ اس کی محبت نے وقتی طور پر اس ناموس پہ مرنے والی عورت کو سلا ضرور دیا تھا۔ کتنا ہی عرصہ اس کی محبت کے خمار میں سرشار میں ایک نامعتبری زندگی گزارتی رہی، اس کی ماں اور اس کی بہن کے طنزیہ اور تذلیل میں ڈوبے فقرے میرے کانوں تک آتے لیکن ہلکی سی دستک دے کے لوٹ جاتے۔ وہاں زریاب کے کہے میٹھے بولوں کا شور ہوتا تھا۔

اس کے خاندان کی نفرت انگیز اور حقارت آمیز نظریں مجھ تک اٹھتیں لیکن میرے اندر کوئی شعلہ نہ بھڑکتا میری آنکھوں کے آگے تو زریاب کے مسکراتے چہرے اور جذبے لٹاتی نظروں کا ست رنگا پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن جب خود زریاب کے لبوں میں وہی زہر اُترا...... جب خود اس کی

آنکھوں میں میں نے بے اعتباری دیکھی تو کیسے میری مدہوشی نہ ٹوٹتی۔ اس دن...... اس پل...... میرے اندر کی وہ پہاڑن پھر سے جاگ اٹھی تھی اور کسی طور نہ بہل رہی تھی۔''

وہ ہانپنے لگی۔ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنا چاہا، سائے سے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائے اور اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس کی ناتوانی نے اس کی تمام حسیات کو اکٹھے مستعد رہنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ مسلسل بولتے رہنے سے اس کی بصارت نے اندھیرے اوڑھنے شروع کر دیئے تھے لیکن دماغ جاگ رہا تھا اور اس پہ وہ سارا منظر بہت واضح...... بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''زر...... یاب...... '' فیروز دھاڑا۔ ''ہوش میں رہ کر بات کرو۔'' اگرچہ وہ اس کی باتوں کے پس منظر سے ناواقف تھا لیکن میرے حوالے سے کہے گئے گھٹیا جملے سن کر اپنا تحمل برقرار نہ رکھ پایا۔

''ہوش میں تو میں اب آیا ہوں۔ تم تو شادی شدہ تھے ناں اور وہ بھی وٹے سٹے کے ساتھ...... تمہاری ایک نہیں دو دو بہنیں تمہارے سسرال بیاہی گئی تھیں اس لیے خود شادی کر کے اپنے لیے مسائل کھڑے کرنے کے بجائے تم نے زیادہ محفوظ راستہ اپنایا۔ تمہیں تو صرف عیاشی کرنا تھی پھر چاہے وہ تمہارے اپنے ہی دوست کی بیوی کیوں نہ ہوتی اور وہ...... وہ عورت اسے تو دولت اور مقام ہی چاہیے تھا پھر اگر دو دو عاشقوں کے ساتھ ملتا تو کیا برا ہوتا۔''

''میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ زریاب تم اپنے ہوش میں نہیں......''

غصے کی شدت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی لیکن زریاب واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پہ اس وقت زہر چڑھا ہوا تھا وہ بولتا رہا۔

''تم نے چند ہی منٹوں میں سارا کھیل سوچ لیا، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھ سے اس کی شادی کرواتے ہوئے اپنا حصہ واضح رکھا اور یہ کرتے ہوئے تم نے پاک رشتوں کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے اور مومنہ سے تعلق جوڑے رکھنے کے لیے تم نے اسے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دینا چاہا۔''

''بس...... بس کرو اپنی یہ بکواس ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تمہارا میرا کیا رشتہ ہے۔''

''تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں۔ تمہارے اور میرے بیچ صرف ایک عورت تھی۔ آج یہ راز کھل چکا ہے اب کچھ باقی نہ بچے گا نہ تم نہ وہ...... نہ تم دونوں کا مکروہ اور گھٹیا تعلق۔''

''گھٹیا تم خود ہو اور مکروہ تمہاری سوچ ہے۔''

''اور تم دونوں تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہو۔ وہ بدکردار عورت شوہر کی غیر موجودگی چند دن بھی نہ برداشت کر سکی اور اپنے مرد کے گھر میں ہی، اس کی چھت کے نیچے اپنا یار بلوا کے عشق کے تماشے کرتی رہی اور جب بھانڈا پھوٹا تو گھر اور اولاد کو چھوڑ کے اسی کے ساتھ چل پڑی۔''

اس کے تفصیلی الزام پہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا خود فیروز لالہ بھی لڑکھڑا سا گیا۔

''یہ سب بکواس کس نے کی تم سے؟تم نہیں جانتے ہو وہ میرے ساتھ کس طرح اور کس حال میں آئی ہے۔یہ ٹھیک ہے اسی نے مجھے بلوایا تھا مگر......''زریاب نے پوری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس پہ دوبارہ بندوق تان لی۔

''میری ماں نے خود تم دونوں کو دیکھا تھا عزت اور شرم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اور میرے لیے اس سے معتبر گواہی اور کوئی نہیں۔''

اچانک فیروز لالہ اس پہ پل پڑا۔وہ اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔اس کا خون بھی جوش میں آ گیا تھا۔

''اگر تم میری بہن کے شوہر نہ ہوتے تو میں تمہارا خون بہادیا۔''اس نے بندوق کا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور میں اسی طرح نیچے بیٹھی گم صم یہ تکلیف دہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میں چلا کے لالہ سے کہنا چاہتی تھی۔''بہادو اس کا خون......مت پرواکرو یہ تمہاری بہن کا شوہر ہے...... یہ میرا شوہر نہیں ہے...... یہ تو جانور ہے...... جانور......جس کا شعور فنا ہو چکا ہے،جس کے اندر سے ہر جذبہ مٹ چکا ہے اب تو یہ سر سے پیر تک جانور ہے غلیظ وحشی اور درندہ جانور......اور کوئی درندہ میرا شوہر نہیں ہوسکتا۔''

لیکن میں چلا نہ سکی۔میں سکتے کے عالم میں تھی۔ایک ایسا سکتہ جو صرف جسم پر قابض ہوتا ہے،روح کو سب سہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔میں سب دیکھ رہی تھی سب سن رہی تھی،صرف کچھ کرنے کی قابل نہ رہی تھی۔کاش......کاش یہ سکتہ مجھے مکمل طور پہ جکڑ لیتا......میں کچھ دیکھ نہ پاتی......کچھ سن بھی نہ پاتی۔

''اب تو اپنی گندی زبان سے ان گندے تعلقات کو اس پاک رشتے کا نام نہ دو۔وہ عورت تمہاری کیا کسی کی بہن بھی بننے کے قابل نہیں......وہ کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔''

زریاب مسلسل اپنے زہریلے خیالات سے اسے اور بھڑ کا رہا تھا۔فیروز لالہ نے اس کی بندوق چھین کے اسے اور مشتعل کر دیا تھا۔اب وہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اس پہ وار کر رہا تھا۔اس نے اچانک بندوق اپنی طرف کھینچنی شروع کر دی۔اسی کھینچا تانی میں لالہ کی نظر دروازے پہ پڑی مجھے دہلیز پہ گرے دیکھ کے اس کی حرکت بس ایک لمحے کے لیے تھمی تھی۔اس کے چہرے کی سرخ رنگت یکدم زرد پڑ گئی۔میں نے ان آنکھوں میں شکست......اور شرمساری کے سائے لہراتے دیکھے۔شاید اسے اپنے وہ سارے دعوے یاد آئے تھے جو اس نے مجھے اس شادی پہ رضامند کرتے ہوئے کیے تھے یا پھر شاید بہن کے سامنے ہی اپنے رشتے کی پامالی نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔

اسے کمزور پڑتا دیکھ کے زریاب نے بندوق کی نالی کا رخ اس کی گردن کی طرف کر دیا۔میرا دل اُچھل کے حلق میں آ گیا میں نے بے اختیار لالہ کے ڈھیلے ہوتے ہاتھوں کو بندوق پہ پیچھے کی طرف پھسلتے ہوئے دیکھا۔عجیب حسرت زدہ انداز میں مجھے دیکھ کے اس نے فائر کر دیا......اور......اور میرا دل حلق سے پھسل کر کہیں نیچے......بہت نیچے گر گیا۔میں جان گئی اس نے یہ فائر کیوں کیا تھا......غیرت کا ایک رنگ یہ بھی تو ہے......زریاب نے اس کی پاکیزگی پہ کیچڑ اچھالا تھا ایک بھائی کو گالی دی تھی......وہ میرے سامنے ہی اتنی بڑی گالی سہہ نہ پایا،شرم نے اسے اپنی جان لینے پہ مجبور کر دیا۔فائر کی آواز سن کے ملازم اندر چلے آئے۔لالہ خون میں لت پت نیچے پڑا تھا۔موت نے اسے ایک پل میں ڈھانپ لیا تھا۔لوگوں نے بندوق پکڑے زریاب کو ہر طرف سے جکڑ لیا وہ ابھی بھی اسی کیفیت میں تھا۔

''چھوڑو مجھے......میں کہتا ہوں چھوڑو مجھے۔''

''تم نے ہمارے صیب کو مار دیا۔ مار دیا اسے۔'' ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ کئی ملازم روتے چلاتے مردان خانے کے اندرونی حصے کی طرف دوڑے۔

''ہاں میں نے مارا ہے اسے۔ میں خود کہہ رہا ہوں میں نے مارا ہے اسے۔ اسے مارنا کوئی شرم کی بات نہیں جو میں چھپاؤں گا۔''

''میں بزدل نہیں ہوں، میں کہیں نہیں بھاگوں گا، مجھے چھوڑ دو، ابھی ایک حساب باقی ہے ابھی مجھے اس کی جان بھی لینی ہے۔''

میرے اندر جیسے ایک زور کا پتھر آن گرا اور پھر سے میرے اندر جان پڑ گئی۔ میں نے سن ہوتے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ زریاب کے الفاظ نے مجھے ایک نئی راہ سجھائی۔ وہ اتنے طیش کے عالم میں تھا کہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا اس کے دونوں ہاتھ تو بندوق کی نالی پہ تھے۔ اس نے لالہ کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی ہی نہیں۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ قتل اس نے کیا اور اندر آئے ہوئے ملازمین بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو ایک طرف سے یہ سچ بھی تھا لیکن میری نظر سے کون دیکھتا؟ میں نے نظر اور عقل کے اس دھوکے کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت کیا تھی، یہ صرف میں اور لالہ جانتے تھے یا پھر خدا۔ فیروز لالہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا اس کی شرم نے اسے منوں مٹی تلے منہ چھپانے پہ مجبور کر دیا تھا اور میں...... میں حقیقت کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ میں نے طے کر لیا اور خدا تو ہے ہی سب سے بڑا منصف...... یقیناً یہ سب فیصلے مجھ سے وہی کروا رہا تھا۔

میں نے مٹی میں پڑی چادر اٹھائی اور وہاں سے نکل بھاگی اب تک کسی کی نظر مجھ پہ نہیں پڑی تھی۔ کوارٹروں کے پچھلی طرف تندور کے پاس سے گزرتے ہوئے حواس باختہ سی لائی کو میں نے موسیے کی باڑھ پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ کبھی مردان خانے کے اس بیرونی حصے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن حویلی میں مچے شور نے اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ''لائی...... لائی بہن......'' فالسے کے گھنے پودوں کے بیچ چھپ کے میں نے اسے آہستہ آہستہ آوازیں دیں۔ وہ چونک پڑی، بڑی سی کالی چادر ذرا سی سرکا کے اس نے اپنی وحشت زدہ نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔

''مومنہ...... تم اور......؟'' میں اس کا ہاتھ تھام کے گندم اور اناج والی کوٹھری میں لے آئی اس کی سراسیمہ حالت صاف بتا رہی تھی کہ فائر کی آواز اور ملازمین کے رونے پیٹنے نے اس کی اندر کن خدشات کو جگا دیا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے بھری مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

''کیا ہوا مومنہ؟ تمہارا لالہ وہ تو اندر تھا...... کہاں ہے تمہارا لالہ...... وہ ٹھیک ہے ناں؟'' میں نے اس کی بھری بھری کلائیاں، سرمے سے بھری آنکھیں اور دنداسے سے سرخ لب دیکھے۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں اپنی زبان سے اسے سہاگن سے بیوہ ہونے کی منحوس خبر سناؤں۔

''مجھ سے کچھ مت پوچھو لائی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے جانا ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے اپنے ننگے پیر اور خالی ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مت سمجھنا میں اپنی جان بچا کے بھاگ رہی ہوں، وقت ملا تو ضرور تمہیں ساری بات بتاؤں گی فی الحال تو تم سے اپنے اور فیروز لالہ کے رشتے کے صدقے کچھ مانگ رہی ہوں۔'' وہ بڑی الجھن کا شکار تھی، کبھی میری بات سننے کی کوشش کرتی کبھی مڑ کے حجرے کے اس کمرے کو دیکھتی جہاں اتنے فاصلے سے بھی ہجوم بڑھتا دکھائی دے رہا تھا اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے طلائی کنگن

اتارنے کی کوشش کی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ اور ہراساں ہوگئی۔

''لالئی۔'' میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا ناں بہن میں ایک انجانے سفر پر جارہی ہوں مجھے زادِ راہ چاہیے۔ خدا کا واسطہ ہے میری مدد کرو تمہیں لالہ کی قسم'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کنگن اتارے۔ چادر کے پلو سے بندھے چند دس دس کے نوٹ نکالے، چپل اتار کے میرے آگے کی اور میرے گلے لگ کے اونچی اونچی آواز میں رونے لگی، شاید اس کے اندر کسی نے اسے اجڑنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ دوبارہ اس نے مجھ سے لالہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے اس سے رازداری کا وعدہ لیا اور وہاں سے فرار ہوگئی۔

اس وقت سارے علاقے کی توجہ حویلی پہ ہونے والے واقعے کی طرف تھی۔ میں بڑی آسانی سے سیدو شریف سے نکل گئی۔ پشاور جانے کے بجائے میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ وہاں زریاب کا خطرہ کم تھا پھر...... پھر میں نے نجانے کیا سوچ کے لاہور کا ٹکٹ لے لیا۔ میں اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ تنہا لاوارث، میرا کوئی نہ تھا۔ نہ سر پر چھت تھی نہ پیر کے نیچے زمین اپنی تھی۔ ایسے میں لاہور جانا میں نے مناسب سمجھا۔ شاید وہاں کی مٹی مجھے اپنی سی لگے۔ کہتے ہیں ہر انسان کی نسل باپ سے چلتی ہے، باپ کا حوالہ اس کی پہچان ہوتا ہے، میرا ابا پ یہیں کا تھا، اسی شہر میں کہیں میرے خون کے رشتے موجود تھے۔ بھلے وہ مجھے نہیں جانتے، میں انہیں نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ تھے تو سہی، اس شہر نے مجھے پناہ دی۔ لالئی کا دیا ہوا زیور کچھ دن میرے کام آیا۔ سفر کے دوران بھی اور اس نئی جگہ پہ بھی لیکن پھر زندہ رہنے کے لیے مجھے نوکری کرنا پڑی۔

دن ایسے ہی گزر جاتے اگر موت مجھے خوفزدہ نہ کر دیتی۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ مجھے لاوارث مرنے سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے لالئی کو پھر سے صدا دی۔ میں چاہتی تھی کوئی اپنا بڑی محبت سے مجھ پہ مٹی ڈالے، بڑے دل سے میری مغفرت کی دعا کرے، اور قدرت نے مجھے میرے دو اپنے ملوا دیے۔ میرے لالہ کی آخری نشانی اور میری اپنی بیٹی...... میری بیٹی...... جو مجھ سے اتنی متنفر ہے کہ...... لیکن اس کا کیا قصور میں نے بھی تو ایک ماں ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا مقدس کہ میں بھول گئی تھی تمہیں...... لیکن میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ آس بھرے انداز میں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی مقدس کو دیکھنے لگی۔

''میں اس واقعے کی عینی شاہد تھی۔ اگر کسی کو یہ پتا چل جاتا تو لازماً مجھے عدالتوں میں گھسیٹا جاتا اور مجھے خدشہ تھا کہ کٹہرے میں کھڑے زریاب کو دیکھ کے میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ میں نے کہا تھا ناں تم سے کہ میں اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا تمہیں دیکھ کے میرے قدم نہ لڑکھڑا جائیں۔ شاید تمہارے سر سے باپ کا سایہ کھینچنے کی ہمت نہ ہو سکے۔ شاید زریاب کے چہرے پہ پھیلا، پچھتاوا مجھے نرم کر دے۔ محبتیں کمزور بنا دیتی ہیں، سمجھوتا کرنا سکھاتی ہیں۔ عشق عیب ڈھک جاتا ہے۔ میں نہ کمزور پڑنا چاہتی تھی نہ نرم ہونا۔ مجھے سمجھوتا نہیں کرنا تھا۔ بدلہ لینا تھا میں نے محبت مار دی اور نفرت زندہ رہنے دی۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی۔ میری انا کو چوکے لگتے۔

میرے رخسار کا داغ لو دینے لگتا اور دل میں پھر سے تپش بھڑک جاتی۔

اس کی گالیوں کے چھینٹے نظر آتے تو میری روح انتقام سے لتھڑ جاتی۔

میں چاہتی تو عدالت میں اپنے داغ دکھا کے اور ساری سچائی بیان کر کے اسے پشیمانی اور پچھتاوے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سچائی کے آگے بی بی جان کے بودے الزام کتنی دیر قائم رہتے لیکن اس سے کیا ہوتا، اس کے کہے الفاظ تو واپس نہ لوٹ جاتے، بے اعتباری کا داغ تو نہ مٹ جاتا۔ بے عزتی کا دکھ میری رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ اب میری یادداشت ہی ساتھ چھوڑ دیتی تو میں یہ سب بھلا سکتی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ بھولی......صرف اپنا عورت ہونا بھول گئی۔ بیوی ہونا، ماں ہونا بھول گئی، صرف زریاب کو سزا دینا یاد رہا۔

میں بھاگ گئی۔ مجھے بھاگنا ہی تھا اگر موجود رہتی تو سچ بیان کرنا پڑتا اور شاید تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ وہ معافی مانگتا، پچھتاتا، روتا تو شاید......مجھے اسے معاف بھی کرنا پڑ جاتا اور معافی اسے مطمئن کر دیتی۔ زریاب کو اطمینان مل جائے کیا یہی انصاف ہے؟ میں اسے عمر بھر جلتا دیکھنا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے مجھے خود کو شعلوں پہ ہی کیوں نہ جلانا پڑتا۔"

"صرف خود کو؟" مقدس کے سوال پہ اس نے گہری سانس بھری۔

"میں مانتی ہوں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک امتحان میں ڈالا۔ لیکن میں پہلے بتا چکی ہوں کہ تمہیں تمہارے خاندان میں تمہارے اپنے لوگوں میں چھوڑتے ہوئے مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ اب میں کہاں جانتی تھی میرے نصیب کا کچھ حصہ تم بھی چرا لوگی۔ اجنبیت تمہاری سہیلی بھی بنے گی اگر مجھے پتا ہوتا تو میں تمہیں کبھی اکیلا نہ چھوڑتی لیکن اتنی دور تک تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ میرے دل و دماغ پہ تو اس وقت ایک دھن سوار تھی۔

اب احساس ہو رہا ہے کہ اگر وقتی طور پر زریاب کے حواس اس کے قابو میں نہ رہے تھے تو میں کب پورے ہوش و حواس میں رہی تھی۔ مقدس! میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ میرا یہ اعتراف اس کا پہلا قدم ہے اور خوشنود تم اب جان گئے ہو گے کہ زریاب تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہے۔ اس نے خود اپنی جان لی تھی۔ حالات چاہے کیسے ہی رہے ہوں۔ ان کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو، بہر حال اسے خودکشی ہی کہیں گے۔"

"آج آپ یہ کہہ رہی ہیں اور کیوں کہہ رہی ہیں، میں جان گیا ہوں۔" اس نے کن انکھیوں سے مقدس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن پھپھو جان، میں تو آپ کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور آپ نے ہی کہا تھا کہ میری نظر سے دیکھو وہ کتنے لوگوں کا قاتل ہے۔"

"اسے اس کی سزا ابھی تو مل رہی ہے، قید میں بھی اور قید سے باہر بھی ایک مسلسل سزا اس کے تعاقب میں ہے ایک پچھتاوؤں سے بھری اجڑی ہوئی زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تم اس کی باقی سزائیں قدرت کے لیے چھوڑ دو اور اپنے اس خوبصورت دل کو صاف شفاف کر لو بالکل اپنے باپ کی طرح، بنا کسی نفرت کے، بنا کسی کدورت کے۔"

"میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔" اس نے اٹھ کے گلاس ونڈو تک جاتی مقدس کو دیکھا اور اپنی شکست کا اظہار کیا۔

"لیکن محبت......اس کے لیے ابھی دل اتنا صاف نہیں ہوا کہ......"

مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تم مقدس کو بھی میری نظر سے دیکھو۔ میری نظر سے دیکھو گے تو وہ زریاب کی بیٹی ہے، یہ بھول جاؤ گے۔'' اس نے خوشنود کا مضبوط ہاتھ دباتے ہوئے اصرار کیا۔ اس کے کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی۔ کمرے کے اس کونے میں موجود مقدس شیشے سے پرے تاریک میدان کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور باہر موجود سنسان لان میں جلتے اکا دکا بلب کے ٹمٹماتے عکس شیشے پہ نمایاں ہو رہے تھے۔ ان جلتے بجھتے سایوں کے ساتھ مقدس کا چہرہ آج بھی اسے اتنا ہی روشن اتنا ہی منور لگ رہا تھا، جتنا کہ روزِ اول محسوس ہوا تھا۔ اس کی خلا میں بھٹکتی آنکھوں کے نیلگوں آئینے رات کے اس سمے سیاہی مائل سے لگ رہے تھے اور مومی انگلیاں بے دھیانی میں دیوار پہ نجانے کیا لکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ دھند چھٹتی رہی...... وہ اسے دیکھتا رہا اور گرد صاف ہوتی رہی...... وہ اسے دیکھتا رہا اور روشنیاں دل میں اُترتی گئیں۔

''میرا دل...... ہاں میرا دل شفاف ہے۔'' اسے احساس ہوا تو اعتراف کرنے مڑا۔ مومنہ کی آنکھ لگ چکی تھی۔ دواؤں کے زیرِ اثر اس کے اعصاب اس کے کنٹرول سے باہر تھے۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالمِ ہوش میں رہ جاتی تھی بلکہ یادداشت کی زنبیل سے برسوں پرانے واقعات بھی ڈھونڈ لاتی تھی۔ اس نے کمبل درست کر کے اوڑھایا اور چپکے سے مقدس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ دیوار پہ حرکت کرتی اس کی انگلیوں پہ غور کیا وہ بے دھیانی میں ماں لکھتی چلی جا رہی تھیں۔

''ماں......!'' اس نے سرگوشی کی تو وہ چونک کے مڑی۔ خوشنود نے اسے انگلیاں مسل کے مٹھی بھینچتے ہوئے دیکھا۔

''سزائیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا مقدس، کیا سزا اور سزا ہمارے نصیبوں میں لکھ دی گئی ہے۔ کسی نے اپنی محرومیوں کی سزا ایک گلاب چہرہ جھلسا کے دی۔ کسی نے اپنی عزت پہ حرف آتے دیکھ کے ایک باوفا شخص کو اذیت ناک موت کی سزا دی، کسی نے انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کے ایک جذباتی شخص کو اس کے جرم سے بڑھ کے سزا سنا دی اور تم...... تم مقدس اس ماں کو کیوں سزا دے رہی ہو اسے ماں نہ تسلیم کر کے۔ جانتی ہو وہ زندہ ہی شاید صرف اس لیے ہے کہ تم ایک بار تمام شکوے بھلا کے ان کے گلے لگ جاؤ ورنہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ان کی حالت دیکھتے ہوئے زندہ رہنے کی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مقدس ان کی سانسیں آسان کر دو۔ اس وقت تو اجنبیت کے بجائے اپنائیت کی آغوش ملنی چاہیے انہیں۔''

وہ رو پڑی...... سسک سسک کے رو پڑی۔

''رو لو مقدس جی بھر کے رو لو...... کبھی کبھی دھندیں یوں بھی چھٹتی ہے، کبھی کبھی گردیں یوں بھی صاف ہوتی ہے، میں مرد ہوں، رو نہیں سکتا، جانتی ہو میں نے اپنے دل کا آئینہ شفاف کیسے کیا۔'' اس کے سوالیہ انداز میں دیکھنے پہ وہ اس کی گہری آنکھوں میں بھرپور انداز سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ کئی روز کے تناؤ کے بعد اس کے تھکے تھکے چہرے پہ یہ مسکراہٹ مقدس کی بڑی نکھری ہوئی لگی۔

''میں نے تمہیں دیکھا اور دھند چھٹ گئی۔''

☆☆☆

''دراب، بچیوں کو اطلاع بھجوائی؟'' افراسیاب خٹک نے پچھلے ایک گھنٹے میں کوئی چوتھی بار دریافت کیا اور نفی میں جواب ملنے پہ جھنجھلا گئے۔

''میں کیا کر سکتا ہوں لالہ؟ ہاسٹل سے یہی جواب ملتا ہے کہ وہ دو دن سے نہیں آئی البتہ کل اس نے فون پہ انتظامیہ سے بات کر کے مزید دو دن کی غیر حاضری کی اجازت لے لی ہے۔''

''اور شناور؟''

''اس کے ہاسٹل بھی فون کیا ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں۔''

''اتنی صبح صبح تو کالج بھی نہیں کھلتا وہ کہاں چلی گئی۔'' اس سوال کا جواب تو دراب کے پاس بھی نہیں تھا۔ رات کے پہلے پہر باچا جان کی وفات ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے گرلز ہاسٹل فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ رات سے ہی برادری کے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق باچا جان کو زیادہ دیر تک رکھا بھی نہیں جا سکتا تھا اور صبح فجر سے لے کر اب تک وہ لاہور میں مقدس اور شناور سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ آخر کار افراسیاب خٹک نے فیصلہ سنا دیا۔

''رابطہ کی کوشش جاری رکھو۔ انہیں آج ہی اطلاع ملنا تو لازمی ہے البتہ ان کے انتظار میں باچا جان...... میرا مطلب ہے اب ان کی روانگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔''

زریاب اور بی بی جان دونوں صدمے سے نڈھال اس سارے مسئلے سے بے خبر تھے۔ بیس سال کی قید میں ایک ساکت و جامد زندگی گزارنے کے بعد زریاب کے لیے رہائی کے فوراً بعد ملنے والے پے در پے جھٹکے شدید ثابت ہوئے تھے اس کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا البتہ تجہیز و تکفین کے بعد بی بی جان ذرا سنبھلیں تو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

''کسی نے لاہور اطلاع نہیں بھجوائی بچیوں کو؟''

زریاب بھی چونکا اور دراب کے تفصیلی جواب نے دونوں کو نئی فکر میں ڈال دیا۔

''کہاں جا سکتی ہے مقدس دو چار دن کے لیے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا اور شناور وہ تو کالج سے چار بجے تک آ جاتی ہے میں عموماً اسی وقت اسے فون کیا کرتی ہوں پھر اب شام کے سات بجنے والے ہیں اور وہ بھی غائب ہے۔'' بی بی جان بڑبڑا رہی تھیں۔

''اور کالج بھی نہیں گئی ہے وہ آج۔ یہ بھی پتا چلا ہے۔'' دراب نے کہا۔

''کہاں جا سکتی ہیں دونوں بغیر بتائے۔'' وہ کہہ رہی تھیں

زریاب مضطرب سا ہو کے ٹہلنے لگا۔ بڑی دیر سے ہاتھ مسل کے کچھ کہنے کی ہمت مجتمع کرتی ہوئی زبیدہ بیگم فیصلہ کن انداز میں اٹھیں۔

''وہ دراصل میرے پاس...... میرے پاس شانو کا موبائل نمبر ہے۔''

''موبائل نمبر؟ اس نے موبائل فون کب سے رکھنا شروع کر دیا۔'' دراب نے ماتھے پہ بل ڈال کے پوچھا۔ اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی جس پہ بیرون ملک کی تعلیم اور طویل قیام بھی اثر نہ ڈال سکا تھا اور حقیقت میں شناور اپنے اس چھوٹے ماموں سے خائف ہو کے ہی موبائل فون سب سے

چھپا کے رکھنے پہ مجبور ہوئی تھی کہ یہ اس کی ضرورت تھی۔

''اوہو یہ وقت اس بحث کا نہیں۔تم جلدی سے اسے کال کرو۔'' افراسیاب نے معاملہ ختم کیا۔

ہال کمرے میں بچھی چاندنیوں پہ، کافور اور اگربتیوں کی مہک کے ساتھ وہ تمام لوگ اس وقت ٹکٹکی باندھے فون پہ بات کرتی زبیدہ کو دیکھ رہے تھے۔

''اس وقت اطلاع کر تو دیتے لیکن تم دونوں اپنے اپنے ہاسٹل میں تھیں ہی کب؟'' شناور نے باچا جان کی وفات کی خبر سنتے ہی جو سوال کیا تھا، وہ اس کا جواب دے رہی تھیں۔ ''اچھا بیٹا صبر کرو۔ دعا کرو اپنے باچا جان کے لیے، اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہ لوٹ آئیں گے۔ شاباش چپ ہو جاؤ اور مقدس کا بتاؤ وہ کہاں ہے..... کیوں غائب ہے اتنے دنوں سے ہاسٹل سے اس کی غیر حاضری کا سن کے سب ہی فکر مند ہیں۔'' اسے چپ کراتے کراتے انہوں نے پوچھا اور جواب میں جانے اس نے کیا کہا تھا کہ وہ حیرت کی زیادتی سے صوفے پہ سے اچھل کے کھڑی ہوگئیں۔

''کیا کہا تم نے.....اپنی ماں کے پاس؟''

''کب؟ کیسے؟''

''کہاں ملی تمہیں؟''

سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کے قریب چلے آئے ماسوائے زریاب کے۔ وہ وہیں بیٹھا خود کو ایک نئی خبر کے لیے تیار کرنے لگا۔ زبیدہ نے فون کریڈل پہ رکھا اپنی حیرت سے بھری نظریں سب پہ دوڑائیں۔

''مومنہ..... زریاب کی بیوی مل گئی..... مقدس اسی کے پاس ہے۔'' ان کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

''وہ شناور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے مقدس بھی اسی وجہ سے ہاسٹل سے غیر حاضر ہے۔'' انہوں نے مزید بتایا کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا سب کی نگاہیں زریاب کے چہرے پہ جمی تھیں جہاں اس وقت زلزلے کے آثار نمایاں تھے۔ بی بی جان نے آگے بڑھنے کی ہمت کی۔

''زر، میرے بچے یہی وقت ہے اس وقت کو روک لو ورنہ پھر کچھ باقی نہ بچے گا، عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا۔ خدا اسے زندگی دے، اتنی کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی تو کر سکیں اور کچھ نہیں تو اس سے معافی تو مانگ سکیں۔ اٹھو زر، جاؤ اس کے پاس..... قسمت سے یہ موقع ملا ہے، اسے کھونا مت۔''

''لیکن بی بی جان میں کیسے؟'' اس نے گھر کے افسردہ ماتمی ماحول پہ اک نظر ڈالی۔ ''ابھی صبح باچا جان کی تدفین ہوئی ہے گھر لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ کل ان کے قل ہیں اور میں یہاں سے چلا جاؤں۔''

''جانے والے تو چلے گئے زریاب۔'' افراسیاب نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

''جو جا رہے ہیں انہیں روک لو۔ اسے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ سوچنے میں وقت ضائع مت کرو اور جانے کی تیاری کرو۔

☆☆☆

ننگے پندے مینوں چھکاں مارے

تے میرے روندے نین نمانے

جنیاں تن میرے تے لگیاں

تینوں اک لگے تے توں جانے

غلام فرید ادل او تھے دیئے

جتھے اگلا قدر وی جانے

(جتنی میرے تن پہ لگی ہیں تمہیں ایک بھی لگے تو پتا چلے۔غلام فرید دل اسے دینا چاہیے جو اس کی قدر بھی جانے)

نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے اپنے ابا کی درد میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

یہ گیت...... یہ گیت ابا نے کتنی بار اسے سنایا تھا اور وہ بغیر مطلب جانے سمجھے، خود بھی درد کے اک گہرے سمندر میں بہنے لگتی تھی پھر کتنے دنوں بعد جب زریاب سے اس گیت کا مطلب سمجھا تب بھی دکھ کی ہلکی ہلکی سی کہر نے اسے ڈھانپنا چاہا لیکن اس نے جھٹک کے اس دکھ بھرے احساس کو پرے کر دیا ان دنوں تو وہ صرف خوش رہنا چاہتی تھی اور جب اس کہر نے اس کے گرد اپنا جال بننا شروع کر دیا، اسے ہر طرف سے غم کی دھند میں لپیٹ دیا تب اس گیت کے بولوں نے نئے نئے راز کھولے۔ آج ابا کی آواز اسے اوپری اوپری سی نہ لگ رہی تھی۔ آج اس کا ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

''ابا!'' اس کے لبوں سے کراہ سی نکلی اور پھر سے ذہن بے ہوشی کی وادیوں میں کھو گیا۔

اے میرے محبوب!

میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔

لوٹ آؤ۔

میں تمہاری تھکن اپنے ہاتھوں میں سمولوں۔

ماں کی آواز میں ''برہ'' اسے سنائی دیا۔''ماں...... ماں!'' اس نے ذہن کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھ مارتے ہوئے ماں کو تلاش کرنا چاہا۔اس کی ''کوچیسی'' پہ لگی سیپیاں کھنک اٹھیں۔اس نے ہاتھ بڑھا کے ماں کے ''پوش'' کا دامن تھامنا چاہا۔

''ابھی نہیں میری لاڈلی، بس کچھ دیر اور......'' ابا نے بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں تسلی دی۔

☆☆☆

''ماموں!'' وہ دیئے ہوئے پتے پہ پہنچ کے کچھ دیر کے لیے رکا۔ سر اٹھا کے اس سفید عمارت کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر ''وہ'' موجود تھی جب ایک اشتیاق بھری آواز پہ پلٹا۔ سبز کاٹن کے مسلے ہوئے سلوٹوں سے بھرے لباس میں ملبوس وہ کم عمری لڑکی اپنے سنہری چہرے پہ بے پناہ اشتیاق لیے اس سے ہی مخاطب تھی۔

''کون......؟ مقدس''اس نے سوچنا چاہا لیکن اس کی زردی مائل سبز آنکھوں کو دیکھ کے خود ہی تردید کی...... یہ آنکھیں تو کسی اور کی یاددلا رہی تھیں۔رحیم گل آفریدی کی......وہ چونکا۔

''ماموں!''اب کے اس نے پورے دھیان سے اسے سنا اور اثبات میں سرہلاتے ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے۔

''وہ اندر ہیں۔دونوں''اس کے سینے سے لگتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔زریاب کا رواں رواں لرزنے لگا۔

''بس کچھ دیر اور...... چند لمحوں بعد......وہ دونوں میرے سامنے ہوں گی۔''اس کا دل یہ سوچتے ہی اچھل اچھل کے یہ چند قدموں کا فاصلہ ایک ہی قدم میں طے کرنے پر اکسانے لگا اور جب سچ مچ ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ رک گیا۔

کوریڈور میں ماربل کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے وہ بلاشبہ مقدس ہی تھی۔اس نے نیلم کے ٹکروں کے گرد ہیروں کی کنیاں دمکتی دیکھ لی تھیں۔اگر اللہ ان آنکھوں میں نیلاہٹیں اتارنے کے بجائے شہد رنگ چشمے ٹھہرا دیتا تو کون پہچان پاتا یہ مومنہ ہے یا مقدس۔

''بابا جان''اس نے زریاب کے پھیلے بازو دیکھے تو الجھ سی گئی۔ذہن میں کہیں خوشنود کے الفاظ نے سہارا دیا۔

''سزائیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا۔''اس نے باپ کی پیاسی آغوش میں جانے میں دیر نہ لگائی۔ماں کی ممتا کو تسکین پہنچانے میں اس نے جو ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا اس کا خمیازہ وہ ایک کسک کی صورت بھگت رہی تھی۔اس وقت اس کی ماں زندگی کی آخری بازی کھیل رہی تھی۔اور وہ باہر کھڑی اللہ سے بس ایک لمحہ مانگ رہی تھی۔بس ایک لمحہ جس میں وہ ماں کو جاتے جاتے اپنی محبت کا یقین دلا جائے۔اندر خوشنود ڈاکٹر محمود کے ساتھ مل کے وہ ایک لمحہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔مومنہ کی بے ہوشی طویل ہو چکی تھی۔

''میں ایک بار اپنے سر پر باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔میں جاننا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہو گی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔''

کچھ ہی روز قبل فجر کی نماز میں کی گئی دعا کے الفاظ اس کے چاروں طرف گونجنے لگے۔سر پر رکھی زریاب خٹک کی ہتھیلی سے ٹھنڈک اس کی پور پور میں اترنے لگی۔اسے اپنی دعا کے پورا ہونے کا یقین ہو گیا۔وہ ایمان لے آئی کہ اس دعا کا دوسرا حصہ بھی ضرور پورا ہو گا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کے خدوخال میں وہ عکس ڈھونڈنے چاہے جو بچپن سے گھر میں لگی قد آدم تصاویر میں دیکھتی چلی آ رہی تھی۔اس کے وجیہہ سراپے پہ لٹنے کا غم نمایاں تھا۔چہرے پر پچھتاووں کی گہری لکیریں تھیں،بھوری آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور چوڑے شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔

''مما تمہیں خزاؤں کے حوالے کر کے بابا بھی اجڑے ہی رہے ہیں۔''

''مقدس!''کمرے سے نرس کے ہمراہ نکلتے ڈاکٹر خوشنود نے آواز دی۔

''فیروزہ!''زریاب کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ بے یقینی سے اس نوجوان کو دیکھنے لگا۔

''پھوپھی جان،ہوش میں آ گئی ہیں لیکن......لیکن ابھی کوئی تسلی بخش بات نہیں کی جا سکتی،تم چاہو تو ان سے مل سکتی ہو۔''اسے ایک دراز

قامت مگر تھکے تھکے انسان کا ہاتھ تھام کے اندر جاتے دیکھ کر اس نے روکا۔

''تم اکیلی ان سے مل سکتی ہو مقدس، میں نے کہا ناں ان کی حالت بہت نازک ہے۔'' وہ کچھ کچھ پہچان رہا تھا۔

''بابا جان!'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہنا چاہا۔ جواباً زریاب نے ایک سرد آہ بھری۔

''کیا میرے نصیب میں پچھتاوؤں سے رہائی نہیں لکھی مقدس...... میری بیٹی اپنی ماں سے مجھے معافی دلا دو۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے تقریباً بلک اٹھا۔

''میں تو مر بھی نہیں سکوں گا اگر اس نے مجھے معاف نہ کیا۔''

مومنہ کی آتی جاتی اکھڑی سانسیں دیکھ کے مقدس تڑپ گئی۔ اس نے ماں کے برف ہوتے پیر تھام لیے۔

''مما...... مما......'' مومنہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں کے دھندلے ہوتے شیشوں پہ مسکراہٹ کا عکس جھلملایا۔ خوشی کی چمک نے اس کے زرد چہرے کو یکا یک جگمگا دیا۔ اس کے لبوں نے پھڑ پھڑا کے اسے پکارنا چاہا لیکن وہ وہیں دوزانو بیٹھ کے اس کے پیر چومنے لگی۔

''میری پیاری مما...... میری مما مجھے معاف کر دیں مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو کتنا دکھ دیا۔ آپ باہیں پھیلا پھیلا کے مجھے بلاتی رہیں اور میں بے ثمر حسابوں میں کھوئی رہی...... میں کتنی بدنصیب ہوں ماں کے ملنے کے بعد بھی اس کی قدر نہ کی۔''

اس کے آنسوؤں نے مومنہ کے پیر بھگو دیے۔ وہ بولنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ بدقت ہاتھ اٹھا کے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ یوں بجلی کی طرح اس کے بازوؤں میں گئی جیسے اس ملاقات کا ایک پل بھی ضائع نہ کرنا چاہتی ہو۔ مومنہ نے کپکپاتے ہاتھوں میں اس کا جھکا چہرہ تھام لیا اور لبوں سے اس کے ماتھے پہ ایک دعا ثبت کر دی۔

''میں جاننا چاہتی ہوں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی بانہوں کی پناہ میں ہے۔''

آج اس کی دعا کا یہ آخری حصہ بھی پورا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دعا کا وہ آخری جملہ یاد آیا۔ ''بس تھوڑی سی چھاؤں...... یا اللہ ذرا سی گرمی۔ بس اک بوسہ...... یا اللہ بس اک دعا۔'' وہ کانپ گئی۔

''کیوں میں نے بس ایک دعا کی طلب کی؟ کیوں میں نے بس ایک بوسے کی، ذرا سی گرمی کی خواہش کی۔

کہیں کہیں...... بس ایک بوسہ تو نہیں۔'' وہ خوفزدہ ہو کے ماں کو پکارنے لگی۔

''مما...... مما آنکھیں کھولیں آپ نے پھر سے آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ دیکھیں مما باہر کون آیا ہے...... بابا جان آئے ہیں آپ کے پاس خود چل کے آئے ہیں اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے...... آپ کی ہر بات کی سچائی پہ ایمان لانے کے لیے......

اٹھیں مما...... پلیز ان سے مل لیں۔ ایک بار مل لیں وہ شرمندہ ہیں، ہارے ہوئے ہیں، انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ بھی ان کی سزا معاف کر دیں مما۔''

''مما خدا کے لیے...... میری خاطر اب تو اپنے دل کو نرم کر لیجیے۔ معاف کر دیں انہیں۔ خدا بھی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے اور

معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انہیں آپ کی پاکیزگی کا یقین ہے۔ آپ کو اور کیا چاہیے۔ بس کریں اپنے دل کو جلانا...... بس کریں یہ نفرت کا کھیل، نکال پھینکیں اپنے دل سے یہ کالے پھول......'' اس کے مسلسل اصرار پہ مومنہ نے ہار مان لی۔ اس کے لبوں پہ ایک بے بس خاموشی تھی۔

''مومنہ!'' زریاب نے پکارا۔ اس کے چہرے کے بدلے نقوش دیکھ کے اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔ پچھلے دنوں میں اس نے بڑی سے بڑی اندوہناک خبر سنی تھی کئی حادثے جھیل لیے تھے لیکن...... لیکن اس گلابی، ریشمی چہرے کی جگہ ادھ جلا سانولا پڑتا زرد چہرہ دیکھ کے اس کے دل پہ جو قیامت گزری تھی، وہ سب سے اذیت ناک تھی۔

''اور کیا ان اندھیرے دریچوں کے پیچھے اب بھی شہد کی جھیل آباد ہے۔''

''مومنہ! ایک بار تم نے پوچھا تھا۔ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں میں صحیح طرح بتا نہ پایا تھا، شاید تب میں جانتا ہی نہیں تھا۔ آج میں تمہارے سوال کا جواب دینے کے قابل ہوں۔ سنو مومنہ، پھولوں کے رنگ کالے نہیں ہوتے...... پھول کبھی کالے نہیں ہوتے، کالک تو دلوں پہ مل دی جاتی ہے، سیاہی تو روح میں اتر جاتی ہے۔ اندھیرے تو نظروں پہ چھا جاتے ہیں، اتنی تاریکی میں جو بھی دیکھو کالا ہی لگتا ہے۔ ایسے ہی اندھیرے مجھے بھی چاٹ گئے تھے۔ میرے دل پہ، عقل پہ، شعور پہ، ہر جگہ سیاہی مل دی گئی اسی لیے مجھے تمہارا دامن کالا نظر آیا۔ لیکن تم میلی کیسے ہو سکتی تھیں۔ پھول کبھی کالے نہیں ہوتے کبھی کالے نہیں ہوتے۔'' وہ جھک کے اسے بتا رہا تھا لیکن اس بے حس و حرکت وجود میں اب کسی راز کو جان لینے کی خواہش رہی تھی نہ ہمت۔

''مومنہ...... مومنہ'' وہ وحشت زدہ سا چلا اٹھا۔ مقدس اور خوشنود اس کی آواز کی گونج سے چونک کر اندر کی طرف لپکے۔

''مومنہ! تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ تم مجھے معاف کیے بغیر کیسے جا سکتی ہو۔ تم مجھے اتنی لمبی سزا کیسے سنا سکتی ہو۔ تم اتنی پتھر دل کیسے ہو سکتی ہو مومنہ، مومنہ! تمہیں خدا کا واسطہ لوٹ آؤ۔ مجھے اس قید سے نجات دلا دو۔ اس سنگباری کو رکوا دو۔''

وہ گر پڑا تھا اور اس کے بے جان وجود سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مقدس نے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کے ماں کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

''تمہارے اندر کی عورت جیت گئی ماں، تم مر گئیں لیکن تم نے اپنی نفرت مرنے نہ دی۔ شاید یہی نفرت تمہاری زندگی تھی لیکن میں جانتی ہوں تم بزدل تھیں۔ تم خود کو جتنا مرضی کٹھور ثابت کر لو تم ایک بزدل عورت تھیں۔ اس بزدلی نے تمہیں مرنے پہ مجبور کیا۔ اگر زندہ رہتیں تو نفرت مر جاتی۔ ہے ناں ماں؟ سچ سچ بتاؤ تمہاری نفرت مرنے لگی تھی ماں؟''



سارے گلاب لے جانا

''میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔''

میرے ہاتھ میں کانپتے ہلکے گلابی کاغذ پہ لکھے چند مبہم سے الفاظ نے مجھے کسی گہرے کنویں میں لا پھینکا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اس خط کو زور سے اپنی مٹھی میں بھینچا اور پھر سہارے کے لیے دیوار سے ٹیک لگالی۔ میری بند آنکھوں کے آگے ایک ہی لفظ جھلملا رہا تھا۔

زینیا عمر!

زینیا!

جو مجھ سے محبت کرنے لگی تھی، اس وقت جب میں نے اس سے محبت کرنا چھوڑ دی تھی لیکن میں نے اس سے محبت کرنا شروع کب کی تھی۔

پتا نہیں میں محبت کرنا جانتا بھی ہوں یا نہیں۔ محبت تو ہاں...... میں نے بھلا کب محبت کی، ہاں اسے محسوس ضرور کیا تھا۔ ایک بار نہیں کئی بار...... اپنے بہت قریب...... بہت ہی قریب اور جب محبت نے کسی آسیب کی طرح میرے وجود کو جکڑنا چاہا تو میں ہی گھبرا کے بھاگ نکلا۔

بزدل ہوں نا......

میری بزدلی نے مجھے یہ اعتراف تک نہ کرنے دیا کہ میں عاشر ملک اس عام سی لڑکی زینیا عمر کا اسیر ہو چکا ہوں میری خود پسندی اس حقیقت کو جھٹلاتی رہی کہ دو پرسکون سی آنکھیں میری بے چین فطرت کو گھیرے میں لے رہی ہیں۔

میں نے اس بے جان پرزے کو جیب میں ڈالا اور سیف سے اپنا پاسپورٹ اور کیش نکال کر سامان پیک کرنے لگا۔ میں اُڑ کے اُس سر زمین پہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں سے مجھے سرخ گلابوں کا وعدہ یاد دلایا گیا تھا اور مجھے یہ وعدہ نبھانا ہی تھا۔

''اچھا جب تم مرو گی ناں تو مجھے ضرور بتانا کم از کم تب تو یہ گلاب تم پہ چڑھا سکوں گا۔'' کبھی میں نے بے حد جل کر اس کے واپس کیے گلابوں بھرے بکے کو اپنی ٹیبل پہ پٹخ کر کہا تھا۔

''اس سے پہلے میں تمہیں اپنی شادی کی دعوت دوں گی۔ بڑے جچو گے اس سرخ تازہ گلابوں والے گلدستے کے ساتھ شرکت کر کے۔ تم نے سنا نہیں ٹھیک طرح سے کہ میں نے کیا کہا ہے ان پھولوں کے بارے میں، یہی کہ یہ دو موقعوں پہ ہی جچتے ہیں یا تو میت پہ یا شادی پہ۔'' اس نے چڑایا۔ ''آؤ گے ناں پھر پھول لے کر؟''

اور مجھے یہ وعدہ نبھانا ہی تھا۔ زندگی کے کسی مقام پہ تو خود کو سچا ثابت کرنا تھا۔

مگر کیا...... واقعی...... واقعی...... وہ کسی اور کی ہونے جا رہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے خوش ہونا چاہیے۔ میری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی

ہے کہ میں...... عاشر ملک...... کبھی نہ کبھی...... اسے زینیا عمر کو ہرا کے دکھاؤں اور اب جب ایسا ہونے جارہا ہے تو جیسے میرے دل کو کوئی ایڑیوں تلے کچلے جارہا ہے اور میرا دل...... میرا فاتح خود پسند دل۔

آفس سے ایئر پورٹ اور پھر پلین تک پہنچتے پہنچتے میرا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا لیکن سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کے آنکھیں موندتے ہی جیسے ایک فلم سی چل پڑی۔

خود پہ کسی کو حاوی ہوتے دیکھنا میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

میں عاشر ملک...... دراز قد، وجیہہ ذہین، حاضر جواب، خوش مزاج اور اعلا تعلیم یافتہ۔

میں ''کچھ'' ہوں، اس کا احساس مجھے قدم قدم پر دلایا گیا نتیجتاً میں خود کو ''بہت کچھ'' سمجھنے لگا۔ گھر میں بھی اور باہر بھی۔ گھر میں افراد ہی کتنے تھے۔ امی، بھائی جان اور میں۔

ابو جی کی وفات کے وقت میری عمر نو برس تھی اور اتنا ہی فرق میرے اور بھائی جان کی عمر میں بھی تھا۔ اس دور یتیمی میں انہوں نے بڑا بھائی بن کے نہیں بلکہ باپ بن کے میری پرورش کا ذمہ اُٹھایا۔ ابو جی کا کاروبار سنبھالنے کے لیے انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ ایف۔ ایس سی کے دوران ہی منقطع کر دیا۔ حالانکہ انہیں میڈیکل لائن میں جانے کا کس قدر شوق تھا۔ امی جان نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنے پروں تلے چھپا کے پالا تھا۔ اب جب باقر بھائی جان کو یکدم باہر کی دنیا کے تھپیڑے سہنا پڑے تو بوکھلا گئے۔ پھر یہ بوکھلاہٹ جیسے ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی۔ انہوں نے خود کو بالکل ہی وقف کر دیا۔

بھائی جان تو بے چارے خیر کیا کرتے، البتہ میں نے خوب خوب اس نرمی کا فائدہ اٹھایا، امی جان نے میری ہر جا بے جا ضد اور فضول سے فضول تر خواہش مان کر میرے اندر خود سری کے کیڑے کو پروان چڑھایا۔

مجھے اپنے آگے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میرے دل میں محبت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ امی اور بھائی جان دونوں سے ہی مجھے پیار تھا، ان کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بس یہی خرابی تھی میری سوچ میں۔ میں انہیں اپنے لیے ضروری قرار دیتا تھا، ان کا پیار، لاڈ وصولنا اپنا حق جانتا۔ لیکن کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں ان کے لیے کیا ہوں۔ کیا انہوں نے بھی میری ذات سے کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

بھائی جان مجھے میڈیکل لائن میں دیکھنا چاہتے تھے، جو خواب وہ خود پورا نہیں کر سکتے تھے، اسے میرے حوالے سے تکمیل پاتا دیکھنا چاہتے تھے لیکن میں نے صاف صاف سنا دیا۔

''بھائی جان پلیز ایسا سوچئے گا بھی مت، بات میری دلچسپی ہونے یا نا ہونے کی نہیں ہے۔ شاید میں اس طرف اپنا رجحان کر بھی لیتا لیکن آپ کے یہ کہنے کے بعد تو بالکل بھی نہیں کہ آپ اپنے ادھورے خوابوں کی تکمیل کے لیے مجھے ڈاکٹر بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ ایسا کر کے مجھے ہر پل یہ لگے گا کہ میں اپنی نہیں، آپ کی زندگی جی رہا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی مکمل اپنی چاہیے اپنی مرضی کی، اپنی خوشی اور اپنے حوالے سے۔''

اپنی صاف گوئی کے زعم میں میں نے ان کا دھواں ہوتا چہرہ بھی نہ دیکھا۔ ان دنوں میں ایسا ہی تھا۔ یہ سوچنے کی زحمت میں کم ہی کیا کرتا

کہ میرے مخاطب بے جان در و دیوار نہیں، مجھ ہی سے وابستہ مکمل احساسات رکھنے والے جیتے جاگتے لوگ ہیں۔ جن پہ میرے الفاظ کا کوئی ردعمل بھی ہوسکتا ہے۔ باقر بھائی جان کی طرف سے ملنے والی بھاری پاکٹ منی کے باعث میرے اردگرد ایسے یاروں دوستوں کا ہجوم لگا رہتا جو میری خود پسند فطرت کی تسکین کرتے رہتے۔ یہ وہ دور تھا جب اپنا آپ منوانے کی تمنا، میری سرکش طبیعت میں دھیرے دھیرے سر اٹھانے لگی تھی۔

شرمین......

میری ماموں زاد، میری ہم عمر تھی۔ بچپن کا ساتھ تھا۔ شروع ہی سے اکٹھے پڑھتے، کھیلتے آئے تھے۔ اسے میں نے اپنے دیگر فرینڈ ز اور کزنز سے کبھی الگ نہیں سمجھا تھا مگر جب ہائی اسکول میں ہمارے ڈیپارٹمنٹس الگ الگ ہوگئے تو زندگی میں پہلی بار مجھے کسی کی کمی محسوس ہوئی۔ کالج پہنچتے ہی میں نے ضد کر کے موٹر بائیک خریدی حالانکہ بھائی جان مجھے گاڑی تحفے میں دینا چاہتے تھے مگر میں جانتا تھا شرمین کو بائیک کی سواری کا کس قدر شوق ہے اور اب میں چھٹی کے بعد بائیک لے کر اس کے کالج کے گیٹ پہ کھڑا ہو جاتا۔

ہمارے گھر ایک ہی بلاک میں تھے۔ اس آٹھ دس منٹ کے روزانہ کے ساتھ نے مجھے اس کی جانب کھینچنے پہ مجبور کر دیا۔ وہ کس قدر حسین، معصوم اور دلکش تھی میں ہر روز اس کا اندازہ پہلے سے بڑھ کے لگاتا۔ اس کے چہرے میں ہر روز اک نئی کشش محسوس ہوتی۔ اس کی آنکھیں کتنی نیلگوں، کتنی گہری ہیں اور نیلم کے ان دہکتے ٹکڑوں کے گرد یہ باریک بھوری لائن اور گلابی ڈورے، اف میں مدہوش ہو جاتا۔ پلکیں جھپکاتی تو گہری بھورے کمان دار ابروؤں کے نیچے ابھرے ہوئے سفید پپوٹوں پہ پھیلی ہلکی نیلی رگوں میں ارتعاش سا برپا ہو جاتا اور بے حد گھنی لانبی پلکیں جن کا سایہ اس کے رخساروں تک آتا تھا، گول گول بھرے بھرے سرخ انار کی رنگت والے اس کے گال جن کے دونوں جانب پڑنے والے گہرے بھنور ان کا حسن اور بڑھا دیتے۔ کتنے روپ بدلتے تھے یہ بھنور، اس کے قل قل ہنسنے پہ یہ گہرے ڈمپل جیسے سیدھے دل میں ہی کھب جاتے، مسکرانے پہ گدگدانے لگتے اور ناراضی میں لب سختی سے بھینچ لینے پر بھی رخساروں پہ ہولے ہولے جھانکنے لگتے۔ چھوٹا سا دہانہ، کھلے کھلے یاقوتی لب، گدرایا بدن، گداز مرمریں ہاتھ پیر، کھنکتی آواز مہکتی باتیں۔

اسے دیکھ کے مجھے اردو شاعری میں پڑھے ہوئے تمام قصیدے اور تشبیہات یاد آ جاتیں جو میں اس سے کبھی کہہ نہ سکا۔ وجہ ہمت کی کمی نہیں میری ازلی خود پسندی تھی۔

اسے بائیک پہ اپنے پیچھے بٹھا کے میں سمجھتا رہا کہ میں نے اسے فتح کر لیا ہے۔

اسے اپنی ملکیت سمجھنے کی میری یہ خوش فہمی اس وقت ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئی جب امی جان اسے باقر بھائی کے نام کی انگوٹھی پہنا آئیں۔ میں ہکا بکا رہ گیا اس قدر حسین، اچھوتی چیز پہ میرے علاوہ بھی کسی کا حق ہوسکتا ہے اور وہ بھی باقر بھائی جان جیسے انسان کا، کیا ہے ان میں۔ کون سی خوبی ہے جس کے بل بوتے پہ وہ شرمین کے حسن کا قلعہ فتح کرنے چلے تھے۔ شکل وصورت، تعلیم وذہانت، عمر کسی طرح بھی وہ میرے پلے نہیں ٹھہرتے۔ میں کمینگی سے سوچتا۔

میں چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنی ضد منوا سکتا تھا، امی جان مجھ پہ قربان ہونے کو تیار اور بھائی جان میری دل دہی کو اپنا اولین فرض سمجھے بیٹھے

تھے مگر وہ جس کی ذات پہ کسی اور نام کی مہر لگ چکی ہو، اسے اپنانا بے حد کٹھن اور پھر اس کا حسن، اس کا سراپا دل ونظر کے لیے لاکھ پسندیدہ سہی لیکن میری انا مجھے اس کی ذات کو یہ فخر سونپنے سے روکتی تھی کہ اسے میں نے میں...... نے زمانے سے لڑ کے حاصل کیا ہے۔ سو شرمین کو تو میں نے فوراً ہی دل کی مسند سے اُتار دیا کہ ابھی تک وہ دل ونظر تک ہی پہنچی تھی۔ روح میں نہیں سمائی تھی مگر اس احساس شکست کو ذہن کی سلیٹ سے کھرچ نہ سکا۔

میرا تجزیہ درست تھا۔ شرمین اور باقر بھائی جان کسی بھی طرح ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے، کچھ ہی دنوں میں سترہ سالہ شرمین ''بھابھی'' وقت سے پہلے میچور ہو جانے والے بزرگ نما جوان شوہر کی ہمراہی میں حواس باختہ سی نظر آنے لگی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ جس طرح باقر بھائی جان اپنی عمر سے کئی سال آگے تھے اسی طرح وہ اپنی عمر سے کئی سال پیچھے۔ کسی بات کی گہرائی تک اترنا تو دور کی بات وہ تو سرے سے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی۔ مجھے تو یقین تھا اس رشتے پر جب اس کی رضامندی دریافت کی گئی ہوگی تو اس نے محض کالج کی تعلیم سے فراغت، چمک دمک کرتے زیورات، ملبوسات اور ہنی مون وغیرہ کی حد تک اپنے تصور کے گھوڑے دوڑائے ہوں گے اور جھٹ ہاں کہہ دی ہوگی۔

گھر میں عورت کے آجانے کا کوئی احساس اس کی آمد سے نہیں جاگا تھا۔ وہ دس ساڑھے دس بجے جاگتی، جب کہ پورے نو بجے آفس چلے جانا بھائی جان کا معمول تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پہ ہم تینوں ماں بیٹے ہوتے اور دوپہر کے کھانے پہ کبھی میں اور امی جان اور کبھی صرف امی جان کیونکہ بارہ بجے ناشتہ کرنے کے بعد وہ دو بجے لنچ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی تھی۔

شام کو الگ ہی تماشا ہوتا۔ اسے ہر روز گھر کے کھانے پسند نہ تھے۔ وہ ہر دوسرے دن بھائی جان سے باہر ڈنر کرنے کی ضد کرتی جب کہ بھائی جان سارے دن کی سرکھپائی کے بعد گھر سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھار تو وہ اس کے مجبور کرنے پر طوعاً کرہاً چلے بھی جاتے اور کبھی مجھے مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگتے جب کہ میں صاف انکار کر دیتا۔ اب جب کہ وہ محض ایک حسین وجمیل دوشیزہ نہیں بلکہ کسی کی بیوی بلکہ میرے اپنے ہی بھائی کی منکوحہ ہے، مجھے اسے سر پہ لادے مارے مارے پھرنے کا کوئی شوق نہیں رہا تھا وہ خود بھی میری بے رخی کی وجہ جاننے سے قاصر تھی جب کہ ہمارے درمیان خاصی بے تکلفانہ دوستی رہ چکی تھی اب تو خیر میں اس کی بات کا جواب بھی رکھائی سے دیتا بلکہ باقر بھائی جان کو اس کے آگے خارصانہ انداز کے ساتھ ہاتھ باندھے منمناتے دیکھ کے تو میری جان ہی جل جاتی۔

''شرمین! میرا خیال ہے......'' اس دن مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ٹوک ہی دیا۔ امی کے کہنے کے باوجود میں نے اسے بھابھی پکارنے اور آپ جناب والے تکلف سے پرہیز کیا تھا۔

''اب تم بھی کچن کو رونق بخش ہی دو، کب تک ہم امی کی پریڈ کرواتے رہیں گے۔''

جو بات اسے بھائی جان اور امی جان کو کہنی چاہیے تھی، وہ میں نے کہہ دی۔ صبح ناشتے پہ بھی اسے اچانک ہی پراٹھا کھانے کی سوجھی تھی جب کہ اتنے دنوں میں اس نے جیم، کریم، بریڈ اور دلیہ کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ امی جان کو فوراً پراٹھا تیار کرنا پڑا۔ اور اب اسے چاول نہیں کھانا تھے۔ روٹی پکانے کے لیے امی کو اٹھتے دیکھ کے میں ضبط نہ کر سکا۔ امی جان رُک کے مجھے تنبیہی نظروں سے گھورنے لگیں، شاید انہیں لاڈلی بھانجی اور نخریلی بہو کی ناراضی کا خدشہ تھا۔ بھائی جان بھی چاولوں سے بھرا چمچہ منہ میں رکھنے کے جیسے نکالنا ہی بھول گئے اور شرمین کے چہرے کے بدلتے رنگوں

کو تکنے لگے جب کہ میں اپنی کہہ دینے کے بعد اطمینان سے سالن ڈالنے لگا۔

''جب کہ میرا خیال ہے اب ہمیں کوئی کک رکھ ہی لینا چاہئے، آخر کب تک ہم امی کو پریڈ کرواتے رہیں گے۔'' اس نے بڑے ہی سکون بھرے انداز میں میرا جملہ مجھے لوٹا دیا اور سلاد کے پتے کترنے لگی۔ اس کے بظاہر عام سے لہجے میں پوشیدہ جتا دینے والی ہتک محسوس کر کے میں چونک گیا۔ (ہونہہ تو شرمین بی بی کو بولنا اور وہ بھی سوچ سمجھ کے بولنا آ ہی گیا)

''ہمارے گھر میں آج تک خانساماں نہیں رکھا گیا۔'' میں نے اسے اطلاع دی۔

''ہمارے گھر کا اصول ہے کچن کا کام صرف گھر کی خواتین کرتی ہیں۔''

''خاموشی سے کھانا کھاؤ عاشر! کیا فضول بحث لگا رکھی ہے۔'' امی جان نے متوقع بدمزگی بھانپ کر مداخلت کی۔

''آپ بیچ میں مت بولیں۔'' میں اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ کی طرح درشتی سے بولا۔

''واہ بڑے اُصول اُصول لگا رکھے ہیں۔ خود کو دیکھا ہے کبھی، کیا طریقہ ہے ماں سے بات کرنے کا۔'' اس نے میری بات پکڑ لی۔

''تمہیں کوئی ٹوکے تو مزے سے کہہ دیتے ہو، مجھے ان گھسے پٹے صدیوں پرانے اصولوں پہ چلانے کی کوشش کوئی نہ کرے اور خود دوسروں کو اصول پرستی کا درس دے رہے ہو۔''

اس کے چمک کے بولنے پر میں نے طیش میں آ کر زور سے میز پہ ہاتھ مارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی ہمت تو اس میں تب بھی نہ تھی جب ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ تھا۔ وہ دبو سی لڑکی آج بڑھ بڑھ کے میرے مقابلے پہ بول رہی تھی۔ میرے...... میرے آگے...... جسے اپنی بات کے رد ہونے کا کبھی تجربہ بھی نہ ہوا تھا۔

''آرام سے بات کرو شرمین! کیوں چلا رہی ہو، بلاوجہ۔'' بھائی جان بالآخر ہمت کر ہی بیٹھے۔

''بلاوجہ...... بلاوجہ چلا رہی ہوں میں۔ آپ دیکھ نہیں رہے عاشر کس طرح پیش آ رہا ہے مجھ سے، اس کو کیا حق ہے مجھ سے اس طرح بات کرنے کا یہ کون ہوتا ہے مجھ پہ ذمہ داریاں عائد کرنے والا اور مجھے یہ بتانے والا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں۔ کیا گھر میں سب سے بڑا یہ ہے۔ کیوں اتنی چھوٹ دے رکھی ہے آپ نے اسے کہ یہ مجھ سے اس گھر کی بڑی بہو سے۔ اپنی بڑی بھابھی سے یوں سوال جواب کر رہا ہے۔ کیا میں نے آپ سے کئی مرتبہ نہیں کہا کہ مجھے پھوپھو سے کام لیتے سخت شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے تو میں آپ سے ڈنر باہر کرنے کے لیے کہتی رہتی ہوں کیونکہ میں دن میں ایک ہی بار تو کھانا کھاتی ہوں اگر وہ بھی میری پسند کا بنے تو مجھے کچن میں جا کے پھوپھو سے کہہ کے بنوانے میں جھجک محسوس ہوتی ہے۔ آج سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں کہ ایک کک ہی رکھ دیں۔ کم از کم میں اسے آرڈر دے کر اپنی مرضی کا کھانا تو بنوا سکتی ہوں۔

کمرے کے بند دروازے میں اس کے زور زور سے بولنے کی آوازیں زبردستی گھسی چلی آ رہی تھیں۔ میرے اپنے کمرے میں چلے آنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''شرمین! تم میری بیٹی ہو، بہو نہیں۔ مجھے تو بیٹی کے لاڈ اٹھانے کی حسرت ہی رہی، اب تم پہ ہی اپنے شوق پورے کروں گی۔ تم بلا تکلف

مجھ سے کہہ دیا کرو۔تمہارا جو بھی دل چاہے، میں بنا دیا کروں گی اپنی بیٹی کو۔''

امی جان نے نرم روی سے معاملہ سلجھانا چاہا مگر وہ شرمین تھی، کروڑ پتی باپ کی نازنخرے والی بیٹی جس نے اپنی مرضی سے کم پہ راضی رہنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

''تھینک یو......پھوپھو! میں جانتی ہوں آپ مجھ سے کس قدر پیار کرتی رہیں لیکن کان فیلٹ مجھے یہ آلو گوشت، کوفتے، قیمہ کریلے اور پلاؤ وغیرہ کچھ خاص پسند نہیں اور میری پسند کی چیزیں، شاشلک، چاؤ من، اسٹیک وغیرہ آپ بنا نہیں سکتیں۔آپ میرے لاڈ بے شک مت اٹھایئے۔ مجھے ایک بٹلر رکھوا دیجئے مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔''اس نے ترش روی سے جواب دیا۔

اور ایک ہفتے کے اندر اندر بھائی جان نے گھر میں ایک کک رکھ لیا۔ بات گو معمولی سی تھی لیکن ہمارے گھرانے کے مزاج کے خلاف، ماموں جان وغیرہ ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں چھپر پھاڑ کے دولت اچانک مل جاتی ہے اتنی اچانک کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے ہیں، تن پہ سونا سجا لیتے ہیں، منہ میں چاندی بھر لیتے ہیں۔اور سر پہ ہیرے لیکن چھپر پھٹا کا پھٹا ہی رہتا ہے۔جب کہ میری امی بیاہ کے جس خاندان میں آئیں وہاں چھپر کی سلامتی کا دھیان سب سے زیادہ رکھا جاتا ہے اگرچہ ہماری حیثیت ننھیال کے مقابلے میں کچھ کم تھی لیکن ایسی دگرگوں بھی نہ تھی بس ہمیں دکھاوا نہیں آتا تھا۔شادی کے ابتدائی سال امی جان نے کچھ تنگی سے گزارے تھے اس لیے پیسے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس تھا ان کے دل میں، ابا جی نے دن رات محنت کر کے یہ بزنس سیٹ کیا تھا اور اب گھر میں خوشحالی و فراغت آ جانے کے بعد بھی ہمارا رہن سہن سادہ ہی تھا۔امی جان اپنی بھابیوں کی طرح سونے میں لدی نظر نہیں آتی تھیں۔ایک عام گھریلو عورت کی طرح کچن میں مصروف نظر آتیں۔

انہیں گھر میں جوان خوبصورت بہو کے ہوتے ہوئے مرد ملازموں کا دندناتے پھرنا سخت گراں گزرتا لیکن مجبور تھیں، بہو جس طرح کی لے آئی تھیں وہاں اسٹیٹس اسمبل ہی نوکروں کی تعداد اور زیورات کی مقدار تھی۔لیکن وہ چپ رہیں۔ بھائی جان بھی چپ تھے اور وہ دونوں مجھ سے بھی اسی چپ کی توقع رکھ رہے تھے تا کہ گھر کا ماحول سازگار رہے کسی قسم کی کوئی بدمزگی نہ پیدا ہوا۔

لیکن میں......عاشر ملک بھلا میں چپ رہ سکتا تھا۔شرمین مجھے یوں بھی قبول نہ تھی بحیثیت ایک بھابھی کے اور جس طرح کے تیور اس نے اختیار کر رکھے تھے وہ مجھے اور بھی تلملائے دیتے تھے میرا ذہن اس لڑکی کو وہ تعظیم و تکریم دینے سے قاصر تھا جس رشتے کے حوالے سے وہ یقیناً اس عزت و احترام کی مستحق تھی۔ وہ میرے سامنے آتی، اس کی حیثیت مرتبہ میرا دل جلا دیتا۔وہ جس کے حسن سے میں مسحور ہو رہا تھا اب میرے لیے ایک بے کشش، بدزبان، ست اور بے حسن عورت بن کے رہ گئی تھی۔

شاید وہ عمر ہی ایسی تھی ہر پرکشش چیز کی جانب دل کھنچا چلا جاتا تھا۔ریشم کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔

''ریشم......شہود کی بہن۔

شہود میرا کلاس فیلو، میرا دوست تھا ویسا ہی دوست جیسا کہ کالج لائف میں کسی بھی یار باش خوش مزاج نوجوان کے دو درجن دوستوں میں سے ایک ہوا کرتا ہے۔

میرے کمرے کا میوزک سسٹم، کمپیوٹر، ٹی وی اور کالج میں شہود، قوی، حسیب، ندیم اور نجانے کتنے دوست...... یہ سب دل بہلانے اور وقت گزاری کا ایک بہترین طریقہ ہے۔

ایسے ہی کسی روز میں شہود کو اس کے گھر ڈراپ کرنے گیا۔ وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا ہے اسکا اندازہ تو مجھے تھا مگر اتنی زیادہ زبوں حالی کا میں نے تصور نہ کیا تھا۔ گڑھی شاہو کے اندر کہیں جا کے وہ گنجان آباد سا تنگ، حبس زدہ گلیوں والا گندہ سا محلہ تھا۔ جس میں اس کا ڈھائی مرلے کا دو منزلہ مکان تھا۔ نچلی منزل پہ سیمنٹ کا لیپ تھا لیکن اوپری منزل پہ بنے دو کابک نما کمرے اس تکلیف سے بھی پاک تھے، سرخ اینٹیں دور سے ہی نو تعمیر شدہ ہونے کا اشارہ دیتی تھیں میں سخت بدمزہ سا ہو گیا۔

اس کے لاکھ اصرار کے باوجود میں نے اندر آ کے چائے پینے کی ہامی نہ بھری۔ میں نے ساری زندگی کسی کے جذبات واحساسات کی پرواہ نہ کی تھی تو اب کیا کرتا۔ اس لیے اپنے چہرے کے ناگوار تاثرات چھپانے کی ذرہ برابر کوشش نہ کرتے ہوئے میں گاڑی ریورس کرنے لگا جس کی بیک پہ چند ادھ ننگے کالے پیلے مریل سے بچے چیونگم کی طرح چپکے ہوئے تھے میں نے سر باہر نکال کر انہیں چند بھاری گالیوں سے نوازنا چاہا کہ شہود کے مکان کے سال خوردہ سبز قلعی والے لکڑی کے دروازے سے ایک نسوانی وجود کو جھانکتے دیکھا۔ مکھیوں سے بھرے نارنجی بوسیدہ پردے کو ذرا سرکا کے وہ کم سن الھڑ حسینہ بڑے اشتیاق سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی (شاید یہ میری خوش فہمی ہو اور اس کی دلچسپی اور اشتیاق کا مرکز میری نئی چم چم کرتی ہنڈا سوک ہو جو بھائی جان نے مجھے پچھلے مہینے ہی لے کر دی تھی)

کسی دوشیزہ کا میری طرف متوجہ ہونا میرے لیے نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات تو شاید اس پسماندہ ترین محلے کے بدبودار مکان میں اس لڑکی کا ہونا تھا جو حیرت انگیز طور پر دلکش تھی۔

☆☆☆

فورٹریس اسٹیڈیم میں صنعتی نمائش ہو رہی تھی۔ بھائی جان نے ہماری کمپنی کی مصنوعات کے لیے ایک خاصا بڑا اسٹال خریدا تھا اس دن انہوں نے مجھے آرڈر دیا کہ میں کالج جانے سے پہلے ایک چکر وہاں کا لگا تا جاؤں تا کہ یہ اندازہ ہو سکے اس اسٹال کی آرائش کا کام ان کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔

عابد مجید روڈ سے میں نے ٹرن لیا ہی تھا کہ ''برائٹ فیوچر اکیڈمی'' کے آگے کھڑی چند لڑکیوں کو لفٹ کا اشارہ کرتے دیکھا۔ اگرچہ ان کا سفید یونیفارم، کاندھوں سے لٹکے بیگز اور سینے سے لگی فائلز انہیں اسٹوڈنٹس ظاہر کر رہی تھیں لیکن اس طرح لفٹ مانگنے والی عورتوں کو ظاہر ہے بدتمیز ہی سمجھا جاتا ہے میں نے بھی یہی رائے قائم کی۔

''جان بوجھ کر بھی یہ طالبات والا حلیہ اختیار کر لیتی ہیں تا کہ پولیس تنگ نہ کرے۔''

میں نے سوچا۔ قریب سے گزرتے ہوئے میری سرسری سی نظر دائیں جانب اٹھی اور میں چونک اٹھا۔ سفید شلوار قمیص میں وہ سیاہ چمکدار بالوں کی دو چوٹیاں کیے ماتھے پہ چند لٹیں بکھرائے ہلکے ہلکے میک اپ اور مسکراتے لبوں کے ساتھ وہ وہی کم عمر حسین سی لڑکی تھی جو میں نے اس دن شہود

کے دروازے پہ دیکھی تھی۔

بلا ارادہ ہی میرے پیر بریک پہ جا پڑے اور کار ایک چرچراہٹ کے ساتھ ان سے دو فٹ آگے رک گئی۔
ان چاروں لڑکیوں نے یکدم یلغار کر دی۔ میں ہڑبڑا کے ان تینوں کو پیچھے گھستے دیکھ رہا تھا کہ میرے برابر کا دروازہ کھٹ سے بند ہوا۔ گود میں بیگ رکھے۔ مخروطی انگلیوں والے گلابی ہاتھ سے بال سنوارتی وہ میرے برابر بیٹھی مجھے مسکرا کر ہیلو کہہ رہی تھی۔

مڈل کلاس سے وابستہ ان لڑکیوں کی بے باکی، بے تکلفی، بلکہ دیدہ دلیری واقعی قابل حیرت تھی۔

''اور...... یہ......'' میں نے کن اکھیوں سے اپنے برابر بیٹھی اسے دیکھا جو تعارف کا مرحلہ نبھا رہی تھی۔

''یہ سحرش ہے، ہم اسے ساشا کہتے ہیں۔''

''آپ بھی کہہ سکتے ہیں۔'' سانولی سلونی نمکین سی لڑکی نے بے باک سا قہقہہ لگاتے ہوئے اضافہ کیا۔

''اور یہ عشرت...... اسے پیار سے ایش کہا جاتا ہے۔''

میں نے بیک ویو مرر سے اس مہاسوں بھرے چہرے والی لمبے قد کی دبلی پتلی لڑکی کو ناقدانہ انداز میں دیکھا جو ''ایش'' کا خطاب پا کے خود کو ایشوریہ رائے ہی تو سمجھ بیٹھی تھی حالانکہ وہ سچ مچ ''ایش'' تھی، بجھی ہوئی راکھ۔

''یہ پروین...... اسے سب پری کہتے ہیں۔''

فربہی مائل، ٹھنگنے سے قد اور بیٹھے بیٹھے نقوش والی اس لڑکی کو دیکھ کے میں نے ان پری کہنے والوں کی عقل پہ ماتم کیا۔

''اور ایش! ساشا، یہ شہود بھائی کے کلوز فرینڈ عاشر ہیں۔''

اس کے بااعتماد انداز پہ میں نے بے ساختہ اس کی جانب دیکھا وہ مجھ پہ نظریں گاڑے مسکرا رہی تھی، ایسی مسکراہٹ جس میں صرف لب ہی نہیں مسکراتے، پورا جسم مسکرا اٹھتا ہے گنگنا اٹھتا ہے اور اس کچی عمر کی گنگناہٹ نے وقتی طور پہ میرے حواس مختل کر دیے۔

''اور مجھے تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔'' اس کے وثوق پہ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ میری خاموشی بھانپ کے اس نے خود ہی بتایا۔

''شہود کی چھوٹی بہن...... ریشم۔''

''آپ کو تو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی، صرف ''ریشم'' کہہ دینا ہی کافی ہے۔'' میرے ریمارکس پہ وہ کھلکھلا اٹھی۔ اس سے میری یہ پہلی ملاقات آئندہ ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، مجھے اس کی دیدہ دلیری پہ حیرت ہوتی تھی کیسے وہ بھائی کے دوست کے ساتھ شہر بھر کی خاک چھانا کرتی اس کی دوستیں اکثر و بیشتر اس کے ہمراہ ہوتیں مجھے کچھ یونہی سا شک ہوا کہ ہو نہ ہو وہ بھی ان کے ساتھ ہوتی ہوگی جب وہ...... لیکن پھر میں سر جھٹک کے ان خیالات سے خود کو آزاد کر لیتا۔

''میری بلا سے جہاں مرضی خوار ہوتی پھرے۔ مجھے کون سے اسے دل کے سنگھاسن پہ بٹھانا ہے۔ وہ تو عادی لگ رہی ہے ان تفریحات اور عیاشیوں کی۔ جب اس کے بھائی کو نہ خبر ہے نہ فکر تو میں کون ہوتا ہوں سوچنے والا۔''

میں واقعی سنجیدہ نہ تھا اور یقیناً وہ بھی نہ تھی۔ وہ کس قماش کی لڑکی تھی اس کا اندازہ تو مجھے اس سے پہلی ملاقات میں ہی ہوگیا تھا، کالج ٹائم میں یونیفارم میں ملبوس، میک اپ کیے ہوئے ناز و ادا کے جلوے بکھیرتی کوئی الھڑ لڑکی اگر سڑکوں پہ کھڑی لفٹ مانگتی نظر آئے تو آپ اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے تو قائم نہیں کر سکتے ناں۔

گھر کے وہی حالات تھے، فرق صرف یہ پڑا تھا کہ گھر کے روکھے پھیکے تنے ہوئے ماحول میں فہد کی ننھی ننھی قلقاریاں گونجنے لگیں۔ ماں کے مرتبے پہ فائز ہو کے بھی شرمین کی فطرت میں ٹھہراؤ پیدا نہ ہوا۔ گھر سے عدم دلچسپی، شوہر سے بے زاری اور گھر کے گھٹے ماحول (بقول اس کے) سے نفرت جوں کی توں تھی۔ اب ایک ننھا سا بچہ اس کی لاپروائیوں کا شکار ہونے کے لیے موجود تھا۔

☆☆☆

فہد چار ماہ کا تھا جب اس کے عقیقے کی تقریب منعقد ہوئی اور میں نے چیدہ چیدہ دوستوں کو انوائیٹ کیا چونکہ یہ گھریلو نوعیت کی تقریب تھی اس لیے میں نے انہیں فیملیز کے ساتھ مدعو کیا۔ شہود کو بھی ''ود فیملی'' ہی بلایا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔

اپنی حرکت کی سنگینی کا اندازہ مجھے تب ہوا جب وہ سج بن کے اس فنکشن میں موجود تھی۔ وہ دیوانہ وار میرے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ اسے نہ اپنی ماں کی فکر تھی، نہ بھائی کا دھیان تھا۔ اسی التفات کا مظاہرہ وہ امی جان سے بھی کر رہی تھی۔ ''آنٹی جی، آنٹی جی۔'' کرتی وہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اتنی سرگرم عمل تو میری کزنز تک نہ تھیں وہ جان بوجھ کر اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلا رہی تھی۔ فنکشن کے دوران ہی میرے عزیز و اقارب میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ شرمین بھی کڑی نظروں سے اس کے تیور بھانپ رہی تھی۔ بھائی جان بھی ایک دو بار اشاروں اشاروں میں اس کے بارے میں استفسار کر چکے تھے، وہ جتنی بار بھی میرے قریب نثار ہو جانے کے انداز میں آتی مجھے اپنے بے تکلف کزنز اور دوستوں کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بننا پڑا۔ یہ صورتحال میری برداشت سے باہر تھی۔ اس کا مجھ سے تعلق ایسا ہی تھا جیسا میرا اس سے دونوں جانب ہی کوئی جذباتی وابستگی موجود نہ تھی۔ مجھے مخالف صنف کی کشش نے باندھ رکھا تھا تو وہ حسرتوں اور محرومیوں کے سائے میں پل کے بڑی ہونے والی اچھی تربیت سے یکسر محروم ایک سطحی لڑکی تھی۔ جسے صرف میرے ساتھ گاڑی میں پھرنا، ہوٹلنگ کرنا پسند تھا یا کبھی کبھار کے ہلکے پھلکے گفٹس جیسے لپ اسٹک، کیسٹ، ریڈی میڈ سوٹ، چاکلیٹ وغیرہ، نجانے میری طرح اور کتنے اسے نواز چکے ہوں گے۔ میں نے تو اس بارے میں سوچنا تک بھی گوارا نہ کیا تھا۔ لیکن ان میں اور مجھ میں ایک فرق تو یہ تھا کہ وہ کبھی ان کے گھر تک نہیں پہنچ سکی ہوگی اور نہ ہی کبھی اس نے جانے کا خواب ہی دیکھا ہوگا لیکن شہود کی وجہ سے میں نے از خود اسے اپنے گھر آنے کا، اپنی فیملی سے متعارف ہونے کا ایک شاندار موقع فراہم کر دیا۔

اس نے اس تقریب میں میری امی جان سے قریب تر ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے ہی روز وہ مجھ سے ریشم کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھیں۔

''خدا کا واسطہ ہے امی! اپنے طور پہ اندازے لگانے کی کوشش مت کیجیے۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ شہود میرا دوست ہے اور وہ بس اس کی بہن، میں اسے ٹھیک طرح سے جانتا تک نہیں۔''

''لگتا تو نہیں وہ تو تم سے خاصی فرینک لگ رہی تھی بلکہ ہم سب کو ایسا لگا کہ تم نے اسے بطور خاص ہم سب سے ملوانے کے لیے بلایا ہے۔''

''واٹ ربش۔'' بھائی جان کے کہنے پہ میں جھنجھلا اٹھا۔'' کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے بلاوجہ دوسروں کے سر پہ سوار رہنے کی یا ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی جھاڑنے کی۔''

''خیر جو بھی ہے، مجھے تو وہ بچی اچھی لگی۔'' امی نے سادگی سے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔''اگر یہ ملنساری اور خوش مزاجی اس کی عادت ہے تو اور بھی اچھی بات ہے اگر تم نے پہلے ایسا نہیں سوچا تو چلو اب سوچ لو۔''

''آپ سب کو ہو کیا گیا ہے۔'' میں جاننے سے قاصر تھا وہ سب یوں اس کے دیوانے کیوں ہو رہے تھے وہ واقعی خطرناک حد تک ڈرامہ باز لڑکی تھی۔

''پہلے تم بتاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے۔ بلاوجہ اتنے کیوں چڑ رہے ہو۔ کہیں یہ چور کی داڑھی میں تنکا والی بات تو نہیں۔'' باقر بھائی جان نے چھیڑا۔ میں اپنے کلین شیو چہرے پہ ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔ اب تک خاموشی سے بیٹھی فیشن میگزین کا جائزہ لیتی شرمین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''میرے خیال میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے کم آن عاشر، اب مان بھی جاؤ کہ وہ تمہارے دوست کی بہن نہیں بلکہ وہ شہو د تمہاری دوست کا بھائی ہے۔ یہاں کون سا ظالم سماج راہ میں حائل ہے جو تم جھجک رہے ہو۔''

''تم بیچ میں مت بولو۔'' میں پہلے ہی جھلایا ہوا تھا۔ اس کی دخل اندازی نے مجھے حلق تک کڑوا کر دیا۔ باقر بھائی جان ہمیشہ کی طرح میری بدتمیزی پہ تیوریاں چڑھا کے رہ گئے۔ میری اس کے ساتھ بدتمیزی سے ان کا موڈ ہمیشہ خراب ہو جاتا تھا۔

''کیوں...... کیوں نہ بولوں۔ باقر آپ مجھ سے گلہ کرتے ہیں کہ میں سب کے درمیان نہیں بیٹھتی، ہنستی بولتی نہیں ہوں۔ امی کو بھی یہی شکایت رہتی ہے کہ میں ڈیڑھ سال کے عرصے میں گھل مل نہیں سکی تو بتایئے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ساری بات آپ کے سامنے ہے۔ ایسا کیا پرسنل معاملہ ڈسکس ہو رہا تھا۔ جس میں دخل اندازی کا مجھے حق نہیں، یا میں نے ایسی کون سی معیوب بات کہہ دی جو عاشر بھڑک کے مجھے خاموش کر رہا ہے۔ میرا ہی دماغ خراب ہے جو یہاں چلی آتی ہوں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہی ٹھیک ہوں۔ مجھ سے اب گلہ مت کرنا، الگ تھلگ رہنے کا۔ میرے سب سے کٹ کے رہنے کی وجہ عاشر ہی ہے۔ یہ کب چاہتا ہے کہ......''

حسب عادت لمبا سا لیکچر جھاڑنے کے بعد وہ ٹسوے بہانے لگی۔ امی کے پاس سوئے ہوئے فہد کو اس نے اٹھایا اور اپنے کمرے میں جانے لگی۔ بھائی جان بیچاری شکل بنا کے امی جان کو مدد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ یہ ڈرامے تو اکثر و بیشتر ہوا کرتے تھے لیکن آج یہ سین ہونے پہ میں نے شکر کا سانس لیا کہ کم از کم شرمین کے غیظ و غضب کے آگے بند باندھنے میں مصروف امی جان وہ تکلیف دہ ذکر تو بھول جائیں گی اور یہی ہوا کیسی ریشم، کہاں کی ریشم...... وہ سب بھول بھال شرمین کو پکڑ کے بٹھانے لگیں۔

میں نے اپنی ماں کو ہمدردی سے دیکھا، ایک ہی بہو تے ان کے سارے دم خم کا خاتمہ کر دیا تھا اور وہ دوسری لانے کے چکر میں ہیں...... اور وہ بھی ریشم جیسی پٹاخہ...... خیر امی جان بھی کیا کرتیں، ریشم کا جو رویہ تھا کل رات کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ حسین تھی اور

معصوم ''نظر'' آتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن میں انہیں کیا بتاتا کہ ہر خوبصورت نظر آنے والی چیز ''اچھی'' نہیں ہوتی اور اگر وہ پوچھ لیتیں کہ وہ ''اچھی'' کیوں نہیں تو میں کس منہ سے انہیں اس کے کرتوتوں سے آگاہ کرتا۔ جب وہ مجھ سے ملی تو اس کے کھلے ڈلے انداز، بے باکی اور بے تکلفی نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ میں اس کا پہلا شکار نہیں۔

ریشم سے چھ سات ملاقاتوں کے بعد ہی جب اس کا حسن بے کشش سا لگنے لگا تھا میرا اپنا دل مجھے ہزار صلواتیں سنا رہا تھا اس قدر بدذوقی کا مظاہرہ کرنے پر۔

''شرمین بچے، کیوں الٹا سیدھا سوچتی ہو۔ یہ عاشر تو ہے ہی ہڑ بولا۔ تمہیں کیا آج پتا چلا ہے، بچپن سے اسے جانتی ہو پھر بھی اس کی اونگی بونگی باتیں دل سے لگا لیتی ہو۔ بھلا تم کیوں کمرے میں بند ہونے لگیں۔ تم تو میرے گھر کی پہلی پہلی رونق ہو۔ تمہیں کیا میں کمرے میں بند رکھنے کے لیے لائی ہوں، میرے گھر کی خوشی، میرے آنگن کا اجالا۔''

امی جان نے ستر کی دہائی میں بننے والی اردو فلموں میں بولے جانے والے سارے ڈائیلاگ اس بے حس اور اکھڑ لڑکی پہ لٹا دیے۔

''میں کوئی شو پیس ہوں، ڈیکوریشن کی چیز ہوں، جسے آپ کونے میں کھڑا کر کے روشنیاں بکھیریں گے۔ جہاں میری زبان بندی کے حکم ہوں وہاں بیٹھے کا کیا فائدہ، آپ کو تو ڈمی چاہیے۔ لے آئیں وہی۔ اس کے دوست کی بہن۔ غریب غرباء کچی آبادی کے رہنے والی...... یتیم و مسکین سی لڑکی، شادی سے پہلے بھی آپ کے پیر دھو دھو کے پی رہی تھی۔

ایسی ہی کنیز نما بھولائی تھی تو بڑے بیٹے کے لیے بھی کسی کچی آبادی سے چھانٹی کی ہوتی یا دارالامان سے منتخب کی ہوتی۔ میں اپنے ماما پاپا کی لاڈوں پلی ہوں، صاحب جائیداد ہوں۔ میری بیک بھی مضبوط ہے اور بیک گراؤنڈ بھی...... کسی سے دب کے وہ رہیں جن کی جڑیں کمزور ہوں۔''

نجانے ایسی باتیں وہ کہاں سے سیکھ کے آتی تھی جو سر سے پیر تک سلگا کے رکھ دیتیں۔ مجھے بھی یک دم آگ لگ گئی۔

''بھائی جان! اگر اس گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں دیکھنا چاہتے تو خدا کا واسطہ ہے اس ''لاڈوں پلی'' اور ''صاحب جائیداد'' کو اپنے کمرے میں لے جائیں، ورنہ...... مزید اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''عاشر! اپنی ماں کی بے عزتی میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس ساری چچوایشن کے ذمہ دار تم ہو۔ صرف تم، ہمیشہ تمہاری وجہ سے ہی گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے۔''

''کیا...... ؟ میری وجہ سے؟ میں اس گھر میں پچھلے تیس سال سے موجود ہوں اور ماحول کب سے خراب ہونا شروع ہوا ہے اس کے بارے میں آپ بہتر جانتے ہوں گے۔'' مجھے ان کا بیوی کے سامنے ڈانٹنا پسند نہ آیا۔

''دیکھا آپ نے، یہ تو سونڈوں پہ بھاری ہے، ایسے تاک تاک کے طنز کرتا ہے۔''

''تم چپ رہو شرمین! بات بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔'' باقر بھائی نے اسے جھڑکنے کی ہمت کی وہ فوراً بھڑک اٹھی۔

''اپنی امی اور بھائی کے سامنے مجھ پر رعب جمانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں نصف صدی پہلے کے سڑے ہوئے سماجی ناول کی ہیروئن

نہیں اور اپنے رعب وجلال کا مظاہرہ کرنے کا شوق ہو تو پھر بیویاں بھی ویسی پسند کرنی چاہئیں جیسے کہ آپ کے بھائی نے کی ہے۔'' وہ گھوم پھر کے پھر سے وہیں آ گئی۔''ایسی فقیرنیاں جوتی تلے دب کے رہتی ہوں گی۔ مجھ سے اونچی آواز میں بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔'' وہ تن فن کرتی جانے کو تھی کہ میں نے آواز دی۔ امی کے باز رہنے کے اشارے کو میں خاطر میں نہ لایا۔

''ایک منٹ شرمین...... پہلے تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دوں کہ ریشم سے میرا کسی قسم کا کوئی تعلق ہے۔

ایسی کوئی بات ہے اور نہ ہونے کا امکان ہے۔ میرا ذوق اتنا گھٹیا نہیں، نہ ہی معیار اتنا گرا ہوا ہے۔ تم اپنا یہ نام نہاد فیملی بیک گراؤنڈ برائے نام سی جائیداد اور گھسا پٹا حسن وجمال سنبھال کے رکھو۔ جس فیملی بیک گراؤنڈ کا حوالہ تم دے رہی ہو، شاید یہ بھول رہی ہو کہ میری ماں بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے اور ظاہری کشش کے علاوہ تم میں ہے ہی کیا۔ میری پسند اتنی سطحی نہیں، تم کیا، زمانہ دیکھے گا کہ عاشر ملک کی شریک حیات ہر لحاظ سے بے مثال ہوگی۔''

میں نے چیلنج کیا وہ پیر پٹختی اندر چلی گئی۔

''حد کرتے ہو عاشر! واقعی عورتوں کی طرح لڑنے بیٹھ جاتے ہو۔'' امی جان نے بے چارگی سے کہا۔

☆☆☆

دو تین سال اور او گھتے سرکتے گزر گئے۔ میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ بھائی جان نے مجھے آفس جوائن کرنے کو کہا تو میں نے بغیر سوچے سمجھے انکار کر دیا۔

اگلے چند ماہ تک میں جاب کی تلاش میں مصروف رہا، میں نے گھر پہ وقت گزارنا اور بھی کم کر دیا۔ تلخیاں دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ شرمین نے مجھ سے الجھتے الجھتے اور امی جان کو تنگ کرتے کرتے اب فہد کے ساتھ بھی وہی سلوک شروع کر دیا۔ وہ ننھا سا بچہ، ضدی اور اکھڑ ماں کے رویے کی بھینٹ چڑھنے لگا۔ وہ نہ تو اسے امی کے پاس زیادہ رہنے دیتی اور نہ ہی خود مناسب توجہ دیتی۔ اس کی ضد اس کے لیے گورنس رکھوانے کی تھی۔ جب کہ بھائی جان بھی امی جان کی طرح مخالف تھے۔ ان کے خیال میں اگر شرمین کو اس ذرا سی ذمہ داری سے بھی آزاد کر دیا گیا تو وہ گھر میں اتنی بھی دلچسپی نہ لے گی جتنی کہ اب بیٹے کی وجہ سے لینے پہ مجبور ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی تھی، فہد تقریباً اسی طرح پل رہا تھا جیسے کہ عموماً بن ماں کے بچے پلا کرتے ہیں۔

پہلے ایک ڈیڑھ سال تک امی جان نے ہی اس کی ساری ذمہ داریاں پوری کیں۔ اسے نہلانا، دھلانا، کھلانا، پلانا، سلانا، پھر اچانک اسے نجانے کیا خیال آیا کہ وہ اب اسے کم سے کم دادی کے پاس چھوڑنے لگی۔ دو سال کی عمر میں اس نے بھائی جان سے لڑ جھگڑ کے اسے ڈے کیئر سینٹر میں ڈال دیا۔ اب وہ پلے گروپ میں تھا اور توتلی زبان میں اے بی سی اور ون ٹو کے رٹے لگایا کرتا۔ رات کو بھائی جان کے گھر ہونے کی وجہ سے وہ بیچارہ بھی اپنے کھلونوں سے اٹے پڑے کمرے سے آزاد ہوتا۔

میں ایک گھنٹہ اس سے کھیل کر، باتیں کر کے گزارا کرتا یوں اب گھر میں...... خصوصاً شرمین کے ساتھ میری منہ ماری کم ہونا شروع ہو گئی۔

یہ شوق اب وہ شوہر کے ساتھ پورے کیا کرتی۔ باقر بھائی جان بھی شاید نئی نویلی دلہن کے سحر سے آزاد ہو چکے تھے، آئے دن خوب معرکے ہوا کرتے۔ میں اطمینان سے فہد کو پیٹ پہ بٹھائے لیٹا رہتا۔

جاب تو ابھی تک نہ ملی تھی، فی الحال میرے کزن نوید نے مجھے ایک آفر دی۔ نوید اور میں اچھی سن تک ایک ساتھ پڑھے، پھر وہ بوسٹن یونیورسٹی چلا گیا۔ پچھلے ہی سال وہ واپس آیا۔ میرے تایا جان اور ابو جان کسی زمانے میں مشترکہ بزنس کرتے تھے۔ پھر بدلتے وقت کے تقاضوں کے تحت دونوں نے الگ الگ قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور اس میں خاصے کامیاب بھی رہے۔ تایا جان کا کاروبار اب ان کے دونوں بڑے بیٹے سنبھال رہے تھے۔ نوید کا مزاج کچھ میری طرح تجرباتی تھا اس نے بڑے بھائیوں کے انڈر رہ کے کام کرنے کی بجائے خود کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ تایا جان نے اس کے حصے کا سرمایہ اسے دے کر خوش دلی سے اجازت دے دی۔ نوید نے مجھے یہ پیش کش کی کہ اگر میں چاہوں تو اس کا بزنس پارٹنر بن سکتا ہوں مجھے بھی یہ آئیڈیا پسند آیا۔ بھائی جان کی زیر نگرانی کام کرنے کے خیال سے بدک کے میں جاب کرنے کا فیصلہ کر تو بیٹھا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ جاب میرے مزاج کے خلاف ہے۔ نوید کے ساتھ بزنس شروع کرنے میں مشکل اس لیے بھی نہ ہوگی کہ تایا جان خود بھائی جان سے میری بات کریں گے اور حصہ مانگنے والا تنازعہ بھی نہ کھڑا ہوگا۔

یہ کام تیزی سے شروع ہوا میں خاصا پر جوش تھا اور نوید بھی...... نوید میری عادت وفطرت سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بات بھی میرے لیے سودمند تھی بلکہ اس کے لیے بھی، وہ جانتا تھا کہ اگر میری ''میں'' کو نہ چھیڑا جائے تو میں ٹھیک ٹھاک کام کر سکتا ہوں۔ اس بات کا اس نے خاص خیال رکھا، میں مطمئن تھا، مگن تھا...... خوش تھا...... ایک لگی بندھی روٹین لائف شروع ہونے جا رہی تھی گھر کی ٹینشن اب میرے سر پہ کم سے کم سوار ہوا کرتی......

میرے مزاج پہ بھی اس کا خوشگوار اثر ہوا۔ پہلے جو میں بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتا اب مقابل کی بات سن بھی لیتا تھا اور سمجھ بھی لیتا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ امی جان کے بھی میں اور قریب ہو گیا اور بھائی جان سے جاری سرد جنگ بھی کمزور پڑنے لگی۔

شرمین سے میں نے لاتعلقی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا بچپنا اور کم عقلی جوں کی توں تھی اب بھی وہ مجھ سے بلاوجہ الجھنے کی کوشش کرتی رہتی لیکن میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کے جھلا جاتی۔ میں اب بھی اسے دیکھ کر اور اسے سن کر خاصی کوفت کا شکار ہوا کرتا لیکن اب میں نے بقول اس کے نندوں والی طعنہ زنی بند کر دی تھی بلکہ پہلے پہل اس سے کیے گئے زبانی کلامی معرکے یاد آتے تو اپنی جذباتیت پہ ہنسی آ جاتی۔

نئے بزنس کی مصروفیات اپنے عروج پہ تھیں۔ ابھی تک تو ہمارا اسٹاف بھی مکمل نہیں ہو پایا تھا۔ میں حسب عادت بہتر سے بہترین کی تلاش میں رہتا تھا۔ جیسے ہی کسی ورکر کی طرف سے بے اطمینانی محسوس کرتا، اخبار میں اشتہار دے دیتا۔ اس دن بھی امیدواروں کے انٹرویز لے رہا تھا کہ میری ملاقات اس سے ہوئی۔

''زینیا سے...... زینیا عمر سے......''

اسے دیکھ کے میں چونک اٹھا حالانکہ اس میں چونکا دینے والی کوئی بات تو نہیں تھی۔ وہ عام سی نہیں تھی۔ عام کا مطلب معمولی ہی ہوتا ہے ناں، یا پھر ویسی جیسی بہت سے لوگ ہوتے ہیں تو اگر عام کے یہ مطلب نکلتے ہیں تو پھر وہ عام ہرگز نہیں تھی۔

وہ خاص بھی نہ تھی...... خاص کا مطلب بہت الگ...... بہت منفرد یا پھر سب سے نمایاں ہوتا ہے ناں۔ تو پھر وہ خاص بھی کیسے ہو سکتی ہے۔

اٹھارہ بائی اٹھارہ کا کمرہ، باہر کے حدت آمیز ماحول...... تیز تر دھوپ، جان لیوا گرمی سے محفوظ، اے سی کی خنکی سے نعمت لگ رہا تھا، فضا

میں ائیر فریشنز کے ذریعے چنبیلی کی ہلکی ہلکی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پہ دبیز ڈارک گرے کارپٹ، سفید دیواروں پہ صادقین اور گل جی کے نادر اور قیمتی فن پارے آرائش کے حسن کو چار چاند لگانے کے ساتھ ساتھ آفس کے مالک کے اعلا ذوق اور اونچے بینک بیلنس کی بھی نشاندہی کر رہے تھے۔ ایک جانب پڑا بھاری گرے صوفہ سیٹ جس کی سینٹر ٹیبل پہ بیش قیمت کرسٹل پیسز پڑے تھے۔ اونچی منقش چھت پہ لگے جدید آرائشی قمقمے، شیشے کی دیوار کے اس طرف بڑی سی آبنوسی ٹیبل...... جس کی گلاس ٹاپ پہ فون سیٹ، کمپیوٹر، فائلز پڑی تھیں۔

ایک جانب تایا جان بیٹھے تھے، جو اتفاقاً ہی آج نوید سے ملنے اور آفس کا جائزہ لینے آئے تھے اور پھر انٹرویو ہوتا دیکھ کے دلچسپی سے وہیں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ہی رشید صاحب بیٹھے تھے جو موجودہ اسٹاف میں واحد تھے جن پہ میں مکمل بھروسا اور اطمینان رکھتا تھا۔ وہ انٹرویو میں میری معاونت کر رہے تھے۔ نوید کسی میٹنگ کے سلسلے میں پی سی گیا ہوا تھا۔ میری سیکرٹری ربیکا لارنس میری دائیں جانب بیٹھی تھی۔ ایک کے بعد ایک امیدوار آتا یا آتی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی سب مرعوب سے ہو جاتے۔ ہمارا بزنس ابھی مکمل سیٹ نہیں ہوا تھا ہماری ساکھ ابھی بننا باقی تھی لیکن میں نے آفس کی سج دھج اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے ایسی کرا رکھی تھی جیسے یہ ملک کے ٹاپ بزنس مین کا ایمپائر ہو۔ یہ سب میری ذاتی تسکین کے لیے تھا اور واقعی میری تسکین ہو بھی رہی تھی۔ جب میں کسی کو گردن گھما گھما کے آرائش کا جائزہ لیتے دیکھتا لیکن...... وہ...... اندر آئی۔ بغیر ادھر ادھر دیکھے۔ بغیر میرے کہنے کا انتظار کیے کرسی کھینچ کے میرے مقابل بیٹھ گئی اور یوں...... یوں بیٹھ گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو، کہو کیا کہنا ہے...... میں کیا کہتا، میں تو سوچتا ہی رہا۔

''آخر کیوں۔ کیا بات ہے اس میں۔ کیا وجہ ہے جو میں بار بار الجھ رہا ہوں چونک رہا ہوں، کیا کھوج رہا ہوں۔ میری عدم دلچسپی اور کھوئی کھوئی کیفیت کو رشید صاحب نے میری تھکن پہ محمول کیا۔ ویسے بھی اب تک میں کوئی بارہ امیدواروں سے اُلٹے سیدھے سوالات کر چکا تھا۔ وہ خود ہی اس سے انٹرویو کرنے لگے۔ میں اس پوزیشن میں تو نہ تھا کہ اس سے کچھ پوچھ پاتا، لیکن حیرت انگیز طور پر میرا ذہن اس کے لفظ لفظ کو اندر اتار رہا تھا۔ اور میں نے یہ اعتراف کرنے میں وقت نہ لگایا کہ وہ واقعی ذہین اور قابل ہے۔ تایا جان بھی اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔

''لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کوئی واحد تو ذہین نہیں ہے۔ ذہانت ہی نہیں کچھ اور بھی ہے اس میں...... کچھ اور...... جو چونکا رہا ہے۔''

میں اسی الجھن میں گم رہا اور وہ چلی گئی۔

''میرے خیال میں تو یہ محترمہ ہی سوٹ کرتی ہیں بلکہ بیسٹ ہیں اب جو عاشر کی رائے ہو۔'' رشید صاحب نے بات مجھ پہ چھوڑی۔ میں نے تایا جان کی جانب دیکھا۔ انہوں نے سر ہلایا۔

''میرا تجربہ تو اسی کے حق میں ووٹ دیتا ہے۔''

زینا عمر ہی سب کی متفقہ چوائس بن گئی۔ نوید اس سے ملا نہیں تھا لیکن آفس آ کر اس کی سی وی دیکھنے کے بعد اس نے بھی اسی کے حق میں ووٹ دیا۔ اس نے اگلے ہی ہفتے آفس جوائن کر لیا۔ اتفاق سے وہ جس پوسٹ پہ تھی اس کا واسطہ زیادہ تر مجھ سے رہتا۔ اس طرح پروفیشنلی سطح پہ تو دنوں میں ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہو گئی۔ وہ میرے کام کی اپروچ کو سمجھنے لگی اور اسی کے مطابق اپنی ڈیوٹی دینے لگی۔ لیکن میں ابھی بھی سمجھنے سے قاصر تھا...... وہ ایک بات......

☆☆☆

ایسے گہرے براؤن سیدھے بال بہت سی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔اس کی طرح اور بھی بہت سی لڑکیوں کی آنکھیں سیاہ ہوتی ہوں گی۔ آنکھوں، لبوں اور ناک کی بناوٹ میں بھی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ مسکراہٹ بھی نہ گدگدانے والی تھی، نہ مونا لیزا کے جیسی ڈوب کے ابھرنے والی، مدھم مدھم آواز میں نہ گھنٹیوں کا ردھم تھا، نہ آبشاروں کا ترنم......ایسی کتنی ہی لڑکیاں ہوں گی۔ بہت سے لوگ اس سے زیادہ ذہین، اس سے زیادہ خوش لباس ہوں گے۔ پھر وہ خاص کیسے ہو سکتی ہے۔ منفرد کیسے ہو سکتی ہے۔

لیکن اسے عام بھی نہیں کہا جا سکتا، وہ عام کیسے ہو سکتی ہے۔اس کی سادہ سی بے ریا آنکھوں کے آئینے کتنے شفاف تھے۔ان میں کتنا رعب، کتنا تقدس تھا اور ساتھ ہی ساتھ کتنی معصومیت بھی۔ کبھی ایسا لگتا یہ کسی مفکر کی آنکھیں ہیں۔ کبھی یوں لگتا کہ جیسے کسی سادھو کی آنکھیں ہوں، گیان میں ڈوبی ہوئی۔ کبھی لگتا کوئی نوزائیدہ بچہ دنیا میں آنے کے بعد اپنی معصوم سی حیران آنکھیں پوری کھولے نظریں گھما گھما کے سب طرف دیکھ رہا ہو۔ جیسے ہر چیز اس نے پہلی بار دیکھی ہو۔ یہ حیرانی، یہ گیان، یہ سب عام نہیں تھا۔ بہت خاص تھا۔ بہت خاص۔

اس کے لبوں پہ مسکراہٹ ہر وقت سجی نہیں رہتی تھی۔ لیکن اتنی نایاب بھی نہ تھی۔ اس مسکراہٹ کے اندر کوئی بھید نہیں تھا جسے کھوجتے میں عمریں بیت جائیں، اس مسکراہٹ میں اتنے رنگ نہیں تھے کہ ہر جانب پھول بکھر جائیں اور اس مسکراہٹ میں دل گدگدا دینے والی شوخی بھی نہ تھی کہ ایمان سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ لیکن اس مسکراہٹ میں ایک عجیب سا اپنا پن ضرور تھا۔ وہ صرف مسکراتی......ہاں صرف مسکراتی لیکن ایسا لگتا جیسے کسی بہت اپنے نے، بہت چاہنے والے نے ہاتھ تھام لیا ہو۔ اکثر اس کے مسکرانے پہ میں چونک کے اپنا ہاتھ دیکھنے لگتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے کوئی گداز لطیف لمس اسے چھو کر گزرا رہو۔ کب یہ احساس اس دنیا میں کسی اور کی مسکراہٹ سے ہوتا ہے......نہیں نا......تو پھر یہ تبسم عام کیسے ہو سکتا تھا۔

مجھے احساس ہی نہ رہا کہ اس طرح کسی دوسرے کے بارے میں بے تکان سوچ چلے جانا تو کبھی میری عادت نہیں رہا۔ مجھے تو صرف خود پہ توجہ دینے کی عادت تھی۔ میں تو صرف خود کو سوچتا تھا۔ زینیا عمر رفتہ رفتہ میرے حواسوں پہ سوار ہو گئی۔ پہلے پہل میں نے خود اسے موقع دیا، اپنے ذہن اور دل دونوں کو بالکل بے دست و پا کر کے اس کے سامنے رکھ چھوڑا اور جب وہ پوری طرح مجھ پہ، میری سوچوں پہ حاوی ہو گئی تو اب مجھے مزاحمت کرنے کا خیال آیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میرے دل نے اسے ''خاص'' تسلیم کر لیا تھا اور اب دماغ کی کسی تاویل کو وہ خاطر میں لانے پہ تیار نہ تھا۔

☆☆☆

''عاشر! آپ یہ اماؤنٹ چیک کر لیں۔ اگر ٹھیک ہے تو میں بل ''راوی اینڈ کمپنی'' کے لیے تیار کروا دیتی ہوں۔''

زینیا نے میرے سامنے فائل رکھتے ہوئے کہا۔ ہمارے آفس میں باس، میڈم اور سر والا کوئی تکلف نہ تھا۔ دوستانہ ماحول میں کام ہوتا تھا۔

''اگر تم نے چیک کر لیا ہے تو ٹھیک ہے۔'' میں نے سائن کر دیئے، وہ جانے لگی تو میں نے آواز دی۔

''زینیا! میں لنچ کے لیے جا رہا ہوں، کیا تم میرے ساتھ چلو گی۔''

مجھے اکیلے جانے میں ہمیشہ آلکسی آتی تھی۔ حالانکہ اسی روڈ پہ بہت سے ریسٹورنٹ تھے کہیں دور نہ جانا پڑتا لیکن نوید نہ ہوتا تو میں یہیں آفس میں چائے یا کولڈ ڈرنکس کے ساتھ سینڈوچز منگوا لیتا۔ جو مجھے ذرا بھی پسند نہ تھے لیکن مجبوراً اور آج تو میں ناشتا بھی ڈھنگ سے نہ لے پایا تھا۔

اس لیے لنچ بھرپور لینا چاہتا تھا ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آفس میں چلی آئی اور میں بے ارادہ ہی اس سے پوچھ بیٹھا۔ اس نے بغیر کسی تذبذب میں پڑے بنا کسی تردد اور ہچکچاہٹ کے فوری جواب دیا۔

''تو......''

''کیوں......؟'' میری تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ چاہتی تو کہہ سکتی تھی کہ مجھے یہ پسند نہیں...... آپ سے میرا رشتہ اس آفس تک ہے...... میں ہوٹلنگ کرنا اچھا نہیں سمجھتی۔ میری فیملی کنزریٹو ہے۔ میں ایسی لڑکی نہیں وغیرہ وغیرہ اور ان متوقع اعتراضات کے جواب بھی میرے پاس تیار پڑے تھے۔

''میں کون سا آفس سے باہر رشتہ جوڑنے جا رہا ہوں۔ کولیگ کی حیثیت سے ہی ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''جب آفس میں مردوں کے ساتھ جاب کرنے میں برائی نہیں تو ہوٹلنگ کرنے میں کیا برائی ہے۔''

''تمہاری فیملی کو تمہارے گھر سے نکل کے کمانے پہ اعتراض نہیں تو پھر کیسی کنزریٹو ہے۔''

''میں بھی کوئی ایسا ویسا انسان نہیں۔'' وغیرہ وغیرہ لیکن اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ پوچھا۔

''کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ لنچ کے لیے۔'' میں ہلکا پھلکا سا ہو کے اپنا موبائل اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے اپنے سوالوں کا جواب بس ملنے ہی والا تھا اگر وہ بغیر کسی سوال کے میرے ساتھ چل پڑتی تو عام سی لڑکی کہلاتی...... اگر وہ سب اعتراضات دہراتی جن کی مجھے توقع تھی تو...... تو عام تو...... لیکن اس نے مجھے لنچ کی آفر کی تو اس کا مطلب ہے کہ وہ...... لیکن کیا واقعی اس سے اس کا خاص ہونا ثابت ہوتا ہے میں یقین سے کچھ کہہ نہ سکا۔

اور تب میں حیران رہ گیا جب وہ مجھے لیے کامن روم کی طرف چلی آئی۔ لنچ آور شروع ہو چکا تھا۔ اسٹاف لمبی سی ٹیبل کے گرد اپنے لنچ باکسز کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ گھر سے لائے تھے۔ کچھ نے آرڈر دے کے منگوائے تھے۔ میں فوری طور پر کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''آج عاشر ہمارے گیسٹ ہیں۔''

سب نے تالیاں بجا کے میرا خیر مقدم کیا۔ میں بغیر کچھ کہے ایک چیئر گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے زینیا نے اپنا لنچ باکس کھول کے میرے سامنے کیا۔ ٹیبل نیپکن میں قیمے کے پراٹھے لپٹے ہوئے تھے۔ نفیس سرور نے اپنے چکن سینڈوچ پیش کیے۔ مسز علی نے بریانی۔ میں تھینک یو کہتا سب چکھتا رہا۔ زینیا اور باقی سب لوگوں کی طرح بے تکلفی سے ہر باکس میں سے شیئر کر رہی تھی۔ میں نے پراٹھے کا لقمہ توڑتے ہوئے اسے دیکھا۔

☆☆☆

آج میں معمول سے کچھ جلدی گھر آ گیا تھا، لاؤنج خالی سنسان پڑا تھا۔ میں نے ذرا دھیان دیا۔ ڈائننگ ٹیبل پہ لگا کھانا بھی جوں کا توں پڑا تھا بلکہ ایک دو پلیٹوں میں تو سالن نکال بھی لیا گیا تھا میں حیران ہوتا آگے بڑھا، سیڑھیوں کے قریب کانچ کی پلیٹ ٹوٹی پڑی تھی۔ میں سمجھ گیا ہو نہ ہو شرمین نے کوئی ہنگامہ کیا ہوگا۔ جب تک باقر بھائی جان اس کے آنسوؤں سے گھبراتے رہے وہ صرف رو پیٹ کر کام چلاتی رہی۔ لیکن جب آنسو بہانا بے کار

جانے لگا تو اب رفتہ رفتہ وہ جاہل عورتوں کی طرح بکنے جھکنے اور دنگا فساد برپا کرنے پر اتر آئی تھی۔ بلکہ جاہل عورتوں کی طرح کیا...... وہ خود بھی تو جاہل ہی تھی۔ صرف میٹرک پاس...... انڈر انٹر اور دس جماعتیں بھی اس نے کیسے پاس کی تھیں یہ میں بھی جانتا تھا۔

ادھر اُدھر دیکھتا میں فکر مندی سے امی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ انہوں نے کھانا یوں پڑا رہنے دیا ہو۔

امی جان بستر پہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی تھیں۔

میری آواز پہ انہوں نے نظر اٹھا کے دیکھا، ان کی آنکھیں متورم اور بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے گھنٹوں روتی رہی ہوں۔

''کچھ نہیں، بس ذرا سر چکرا رہا ہے، کنپٹیوں میں بھی شدید درد ہے۔'' میرے استفسار پہ کہنے لگیں۔

''اور اس سر چکرانے کی وجہ کیا ہے، وہ بھی جانتا ہوں، پلیز امی! آخر کتنی بار آپ کو بتانا پڑے گا کہ خود کو ان لڑائی جھگڑوں سے الگ رکھا کیجیے۔ یہ دونوں ہرگز نہیں سدھرنے والے۔ وہ محترمہ لڑ جھگڑ کے بہانے سے ہفتہ ہفتہ میکے رہنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں خوب تفریح اور مزے کر کے موڈ ٹھیک کیے جاتے ہیں۔ ادھر ہمارے بھائی صاحب کو موقع مل جاتا ہے ذرا کھل کے سانس لینے کا۔ وہ بھی جی بھر کے اس وقتی آزادی کو انجوائے کرتے ہیں اور جب بچے کی یاد ستانے لگتی ہے تو ناک رگڑتے سسرال جا پہنچتے ہیں۔ بیوی کو منانے کے لیے ہزاروں لاکھوں شاپنگ پہ اڑائے جاتے ہیں۔ یہ ہر مہینے بعد ہونے والا ڈرامہ ہے لیکن آپ ہیں کہ اپنا حشر کر لیتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت بھی آپ کا بلڈ پریشر انتہا درجے کا ہائی ہوگا۔ چلیں اٹھیں ڈاکٹر کے پاس۔''

''نہیں بس ٹھیک ہوں، دوا لی ہے میں نے۔''

''اور بھائی جان خود کہاں ہیں؟'' میں نے شرمین کے بارے میں پوچھنا گوارا نہ کیا کہ ہر بڑے جھگڑے کے بعد وہ گھر سے بچے سمیت نکلنے میں دیر نہیں لگاتی تھی۔

''کہاں ہوگا بدنصیب، تنگ آ کے نکل گیا۔ بیچارہ اتنی کوشش کرتا ہے اسے خوش رکھنے کی مگر...... یہ لڑکی نہ پیار سمجھتی ہے نہ ڈانٹ، تنگ آ کے کئی بار کہہ چکی ہوں الگ رہنا چاہتی ہے تو بے شک ہو جاؤ لیکن باقر کہتا ہے یہ بات بھی نہیں، اسے تو خود بیوی کا علاج نہیں سوجھ رہا۔'' انہوں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''بس امی! رہنے دیجیے۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔

''میں سب جانتا ہوں جو وقت بیوی کو رشتوں کی پہچان کرانے اور ذمہ داریوں سے روشناس کرانے کا تھا، وہ وقت بھائی جان نے دلہن کے لاڈ اٹھانے میں گزار دیا۔ اب جب اپنی من مانی کرنے اور بیہودہ گوئی کی اس کی عادتیں پختہ ہو چکی ہیں وہ بیوی کو سدھارنے چلے ہیں۔ اب تو صرف جنگیں ہی ہو سکتی ہیں چلیں چھوڑیں یہ سب باتیں......''

''کیسے چھوڑ دوں بیٹا تو وہ میرا ہی ہے، شرمین بھی غیر تو نہیں اور سب سے بڑھ کے فہد، وہ اب بڑا ہو رہا ہے۔ ماں باپ کے جھگڑوں سے سہم جاتا ہے، راتوں کو ڈر کے جاگتا ہے، کانپتا رہتا ہے۔ ان دونوں کو ذرا خیال نہیں۔'' اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں انہیں یہ کبھی

نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی فکر بھی نہ کریں۔ آخر فہد مجھے بھی بہت پیارا تھا۔

''اب تو تم سے ہی امیدیں ہیں۔ اللہ کرے تمہاری دلہن اتنی نصیبوں والی ہو کہ گھر میں پھر سے خوشیاں ہی خوشیاں بھر جائیں۔'' انہوں نے وہ ذکر چھیڑ دیا جو کہ آج کل ان کا فیورٹ تھا...... میں ہمیشہ کی طرح چڑا نہیں، میری خاموشی سے حوصلہ پا کے انہوں نے پوچھا۔

''تم ماشاءاللہ خود سمجھ دار ہو، تمہاری پسند خود بھی قابل اعتبار ہوگی۔ اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے بیٹا تو بتاؤ۔''

''نہیں...... مجھے......'' میں شدت سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن آنکھوں کے آگے دو سادہ سی بناوٹ والے لب مسکرانے لگے اور میرا ہاتھ...... میرا ہاتھ کوئی بڑے پیار سے سہلانے لگا۔

''بولو ناں۔'' امی جان نے پھر پوچھا۔

''ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا، میرا مطلب ہے میں نے اس بارے میں کبھی سوچا نہیں۔''

''تو کب سوچو گے......؟'' انہوں نے پیار سے میرے بالوں کو بگاڑا میں مسکرا کے رہ گیا۔

''بہت جلد۔''

☆☆☆

میں نے واقعی سوچنا شروع کر دیا۔ محبت سوچ سمجھ کے نہیں کی جاتی لیکن میں محبت کب کر رہا تھا میں تو اپنے لیے ''بہترین'' کا انتخاب کر رہا تھا۔ سالوں تک مجھے ایسی کوئی ہستی نظر نہ آئی جس پر مجھے کم از کم بہتر ہونے کا شائبہ ہی ہوتا۔ اب زینیا عمر واحد ایسی تھی جس پہ چند ''بہتر'' ٹیگ لگے ہوئے تھے۔ وہ ذہین تھی، پرکشش تھی، اعلا تعلیم یافتہ تھی، باوقار تھی، باکردار تھی، اعلیٰ ظرف تھی، خوش لباس، خوش مزاج اور خوش شکل بھی، پھر بھی ابھی اور بہت کچھ جانچنا پرکھنا باقی تھا۔

''اسے بہت رئیس ابن رئیس نہ سہی، مگر ہمارا اہم پلہ تو ہونا چاہیے۔'' میں نے نمبر ایک پوائنٹ سوچا۔

''شرمین کے مقابلے میں اس کی خوبصورتی کو زیادہ نمبر نہیں مل سکتے، لیکن خیر ہے تعلیم کے معاملے میں تو زینیا کے ہی پوائنٹس زیادہ ہیں۔''

دوسرا نکتہ اٹھایا گیا۔ حساب کتاب برابر ہوا۔

''بس اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کا اندازہ ہو جائے اتنا تو مجھے پتا ہے کہ اس کے والد ریٹائرڈ میجر ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ آج کل تو پیسے کی ویلیو ہے...... عہدے اور پوزیشن کی اہمیت ہے۔''

میں سارے حساب کتاب کر رہا تھا۔ میرا شاطر اور محتاط دماغ میری معاونت کر رہا تھا اور میرا دل......

میرا دل دور کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔

دور کھڑا...... ہاں بہت دور...... زینیا کے قریب......

☆☆☆

''اب آپ ریلیکس کیجیے، باقی کام میں کرلوں گی۔'' اس نے فائلز اٹھاتے ہوئے مجھے مشورہ دیا، شاید میرے بار بار ماتھا سہلانے سے اس نے اندازہ لگا لیا ہو کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

''کیوں کیا تمہیں ریلیکس نہیں کرنا چاہیے۔ آخر تم بھی تو پچھلے دو گھنٹے سے میرے ساتھ ہی اس پراجیکٹ کو ڈسکس کر رہی ہو۔'' وہ صرف نظریں نیچی کیے مسکرا دی۔ میں نے بات آگے بڑھائی۔

''کیوں نہ کچھ دیر ہم بزنس کی بورڈ سکشنز کو بھول کر ہلکی پھلکی باتیں کرلیں۔ ذہن بھی ہلکا پھلکا ہو جائے گا اور ماحول بھی۔''

''شیور......'' اس نے ہاتھ میں پکڑ فائل ایک طرف رکھ دی۔

''تم نے کبھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''میں نے انٹرویو میں سب ہی کچھ تو بتا دیا تھا۔ اس دن تو آپ کا رویہ ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ کچھ جاننا ہی نہیں چاہتے ہوں۔''

''بھئی میں اس قسم کے جاننے کے متعلق نہیں کہہ رہا۔ میرا مطلب ہے تمہاری فیملی، تمہاری پسند، ناپسند وغیرہ وغیرہ۔''

''میں کوئی فلم اسٹار ہوں، جو آپ یہ سب جاننا چاہتے ہیں۔'' اس کے بار بار بات گھما دینے پہ میں تنگ آگیا۔

''دوست تو ہو۔ اور دوستوں کو دوستوں کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔''

''دوست......'' وہ جیسے مجھ سے نہیں خود سے پوچھ رہی تھی اور شاید خود سے بھی کوئی جواب سننے کے بعد اس نے سر ہلایا اور مجھے دیکھ کے کہنے لگی۔

''ہاں دوست......اور دوست......کو دوست کے متعلق واقعی علم ہونا چاہئے۔'' اسے راستے پہ آتا دیکھ کے میں اپنے ذہن میں سوال مرتب کرنے لگا کہ وہ بول پڑی۔

''چلیے پھر بتایئے اپنے متعلق......آخر دوستی کے پہلے دعوے دار بھی تو آپ ہیں۔'' اس نے بڑی ہوشیاری سے بال میرے کورٹ میں ڈال دی۔

''کیا بتاؤں......؟ گھر میں بس میں ہوں، امی جان ہیں۔ بھائی جان اور شرمین۔''

''شرمین!''

''بھائی جان کی بیوی......'' میں نے مختصراً بتایا۔

''یعنی آپ کی بھابی......'' اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا میں شانے اچکا کے رہ گیا۔

''اور فہد ہے۔''

''فہد!'' میں نے اس کی آواز میں واضح لرزش محسوس کی۔

''بھتیجا ہے میرا...... بڑا پیارا سا، گپلو سا......'' میرے لہجے میں خود بخود ہی حلاوت سی آ گئی، اسے دیکھا تو اس کی پراشتیاق آنکھوں میں بھی وہی حلاوت تھی۔

''لگتا ہے تمہیں بچے بہت پسند ہیں۔''

''بہت......بہت زیادہ اور فہد تو......میرا مطلب ہے فہد بھی بہت پیارا ہوگا ناں......ویسے تو سب ہی بچے بہت پیارے ہوتے ہیں۔'' ''ہوتے ہوں گے، مجھے تو صرف فہد اچھا لگتا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''اس سے پہلے میں نے کبھی بچوں میں دلچسپی نہیں لی تھی، بلکہ اب بھی نہیں لیتا البتہ فہد کی بات اور ہے وہ تو جان ہے میری۔''

''مجھے تو لگتا ہے آپ اور سب میں بھی بس واجبی سی دلچسپی ہی رکھتے ہیں۔'' اس کے قیاس پہ میں نے چونک کے دیکھا۔

''ماں کے بارے میں تو بتانے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے اور آپ نے بس دو لفظوں میں نمٹا دیا، اور آپ کی بھابھی......یعنی شرمین، اس سے تو آپ اچھے خاصے کبیدہ خاطر لگ رہے ہیں اگر میرے اندازے ذاتیات پر حملے کے مترادف ہوں تو معذرت چاہوں گی۔ بس یونہی مجھے لگا تو میں نے کہہ دیا۔''

''نہیں نہیں معذرت کیسی اور ذاتیات کیسی۔ دوستی میں اتنی چھوٹ تو دے دینی چاہئے۔'' میں نے دانستہ ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا ورنہ اس کی غضب کی قیافہ شناسی پہ میں دنگ رہ گیا تھا۔

''شرمین سے میں کیا، گھر کا ہر فرد تنگ ہے۔''

''ہر فرد......یعنی آپ، آپ کے بھائی اور والدہ......اور کیا فہد بھی؟'' اس کے سوال پہ میں الجھ گیا۔

''فہد کا کیا ذکر؟ وہ تو ابھی بچہ ہے لیکن سچ پوچھو تو ماں کی حیثیت سے اس کا رویہ بیٹے کے ساتھ بھی انتہائی ناروا ہے۔ وہ ایک غیر ذمہ دار ماں، لاپرواہ بیوی، بدتمیز بہو اور......''

''بیوی اور بہو کے آگے جو مرضی لگالیں لیکن پلیز ماں کا لفظ داغ دار نہ کریں، ماں صرف ماں ہوتی ہے۔'' میری بات کاٹ کے وہ بولی۔

''دیکھو زینیا جس طرح سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے، اسی طرح رشتے بھی سب ایک سے نہیں ہوتے، میں جانتا ہوں تم عورت ہونے کے ناتے اسے ایڈوانٹیج دے رہی ہو لیکن میں نے یہ روایتی سوچ کبھی نہیں رکھی سمجھیں۔

یار ساری بات ہوتی ہے جذبے کی، احساس کی اور اس سے بھی بڑھ کے فطرت کی تم نے اخباروں میں بارہا پڑھا ہوگا، چار بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ فرار......نامعلوم ماں ایک نوزائیدہ بچی کو ٹھنڈی سڑک پہ ٹھٹھر کے مرنے کے لیے چھوڑ گئی۔ بیوی نے شوہر کو زہر دے دیا۔ بے شک ایسی خبریں ہزاروں میں ایک کے متعلق ہوتی ہیں لیکن ہوتی تو ہیں اگر میں شرمین کے خلاف کچھ کہہ رہا ہوں تو اسے تم ''ماں'' کے خلاف بیان مت سمجھو۔ زینیا ماں ویسی بھی ہوتی ہے جیسی میری ہے اور ماں ویسی بھی ہوتی ہے جیسی فہد کی ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں چونک سا گیا۔ وہ روانی میں مجھے ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کہہ کے پکار رہی ہے۔ میں خوشی کے نامعلوم سے احساس کے تحت بھیگ گیا لیکن اسے جتانے کے بجائے بات جاری رکھی۔

''ابو جان کی وفات کے بعد امی جان نے اپنے طور پہ ہمیں پالا۔ بڑی خودداری، بڑی محنت کے ساتھ......لیکن اپنے صاحب حیثیت بھائیوں سے کسی قسم کی کوئی مدد نہ لینے کے باوجود نجانے کس لیے وہ ہمیشہ ان سے مرعوب رہیں۔ امی، ماموں کی بیٹی شرمین کو ایسے بیاہ کر لائیں جیسے کسی بہت بڑے احسان کا بوجھ سمیٹا ہو۔ بس اس دن سے ہمارے گھر کا ماحول خراب ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے اُکھڑا اُکھڑا، نالاں، شاکی میرا تو دل نہیں چاہتا، گھر جانے کو، پتا نہیں امی کیسے سارا دن گزارتی ہیں۔

اور زینیا! مجھے تو اس بچے کے نصیبوں کا خیال آتا ہے جو ماں باپ کے جھگڑوں کی بدولت وقت سے پہلے بڑا ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر سو سال کی سنجیدگی اور ملال نقش ہو گیا ہے۔''

میں سانس لینے کو رکا، اس کے اپنے چہرے پہ ملال اور تاسف صاف نظر آرہا تھا۔ مجھے خود پہ حیرت ہوئی میں کس طرح اس کے سامنے کھل گیا۔ کیسے وہ اتنے کم دنوں میں اتنے قریب آگئی کہ میں......عاشر ملک، خود کو سینت سینت کر رکھنے کا عادی اپنی ساری پرتیں اس کے سامنے کھولنے لگا۔ میں تو اس کی ذات کی گرہیں کھولنے بیٹھا تھا اور وہ باتوں باتوں میں مجھے کھول گئی۔

''تو......میں نے......تو سب بتا دیا اس کے علاوہ اور بتانے کو ہے بھی کچھ نہیں، دوست بس نوید ہے اور اب تم......وہ کالج، اسکول کی ناپائیدار سی دوستیاں کالج کے ساتھ ہی ختم......میں زیادہ دوست بنانے کا قائل بھی نہیں۔ اب تم بتاؤ اپنے متعلق۔''

''میں......زینیا عمر...... پاپا عمر فاروق مجتبیٰ ریٹائرڈ میجر تھے۔ چھ سال پہلے ان کی وفات ہوئی۔ مما کو گزرے نو سال ہو چکے ہیں، میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ عمر چھبیس سال، قد پانچ فٹ چار انچ، پسندیدہ رنگ سفید، پسندیدہ پھول موتیا اور چنبیلی، کھانے میں سبزیاں پسند ہیں، آئس کریم اور چاٹ بھی اچھی لگتی ہے۔ والوں سے پکی پکی دشمنی ہے۔ فیورٹ ایکٹر بریڈ پٹ، ایکٹرس کیمرون ڈیاز سنگر......''

''اسٹاپ اٹ...... جسٹ اسٹاپ اٹ......!'' میں نے پیپر ویٹ اٹھا کے اسے دھمکی دی۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی، پلکیں جھک گئیں۔ جب وہ کھل کے مسکراتی تو نگاہیں خود بخود ہی جھک جاتیں اور وہ یوں سر ہلاتی جیسے اپنی مسکراہٹ سے خود محظوظ ہو رہی ہو۔

''تم کسی فلمی کاؤنٹ ڈاؤن، میں اپنے فینز کے سوالوں کے جاب نہیں دے رہیں میں نے تم سے یہ سب نہیں پوچھا تھا۔

''کیا کروں، میری لائف میں بتانے لائق کچھ ہے ہی نہیں۔''

''یوں کہو، میں اس لائق نہیں۔'' میں نے دانستہ خفگی جتائی کہ شاید اس پہ میری ناراضگی بھرے جملے کا کچھ اثر ہو، لیکن وہ خاموش رہی تو میں نے ہار کے صرف اتنا کہا۔

''یعنی میں دوستی کا صرف پہلا ہی نہیں، واحد اور آخری دعوے دار بھی ہوں۔''

''جو مرضی سمجھ لو۔'' وہ بے پروائی سے کہتی اپنی فائل اٹھا کے چل پڑی تو میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

''عجیب گھنی لڑکی ہے۔ پہلے اپنائیت جتا کے مجھ سے سب اُگلوالیا اور اب اپنی باری میں کیسے پیر سمیٹ کے چلی گئی۔ ایسا کیا ہوسکتا ہے اس کی زندگی میں جو وہ بتانے سے کترا رہی ہے۔ کچھ تو ایسا ہوگا جس پہ پردے ڈالے جا رہے ہیں ٹھیک ہے باپ فوجی بندہ تھا لیکن کیا پتا کسی سنگین جرم کے سلسلے میں کورٹ مارشل ہو چکا ہو...... جاب کرتی ہے تو پھر ضرور مالی حالت مخدوش ہوگی۔ لیکن وہ نئے ماڈل کی کار، رکھ رکھاؤ، وہ اعلیٰ طور اطوار...... پھر ضرور کوئی اور مجبوری ہوگی...... ہوسکتا ہے کوئی نہ کوئی بھائی نشے کا عادی ہو۔ جرائم پیشہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے اس کی فیملی مقروض ہو اور......اور...... عین ممکن ہے وہ کسی ناکام شادی کا تلخ تجربہ رکھتی ہو اسے ایم بی اے کیے ڈھائی تین سال ہو رہے ہیں۔ اگر شوقیہ جاب کرنا ہوتی تو تب بھی کر لیتی۔''

اپنے تصور کے گھوڑے ہر طرف دوڑانے اور ہر امکان کو سامنے رکھنے کے بعد میں نے خود سے سوال کیا۔

''کیا میں اسے اپنانے کی ہمت کر پاؤں گا اگر ان میں سے میرا ایک وہم بھی حقیقت نکلا......''

''ہرگز نہیں۔'' میرا فوری ردعمل تھا۔'' اپنانا تو ایک طرف، میں ایسا سوچنے کی ہمت بھی نہ کر پاؤں گا۔''

میرا دل پھر سے قہقہے لگا رہا تھا۔

☆☆☆

اس دن وہ جیسے مجھے غچہ دے کر نکل گئی تھی۔ میں بعد میں کافی دیر تک سٹپٹاتا رہا۔ اپنی عادت کے خلاف میں خود کسی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے پہ مجبور ہوا اور پھر روانی میں ہی سہی، انجانے پن میں ہی سہی سچ مچ دوستی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس سے اپنی انتہائی پرسنل باتیں بھی کر

گیا لیکن جب میں نے اس سے پوچھا تو...... کیسے وہ صاف پہلو تہی کر گئی۔ میں کئی دن اس سے کھنچا کھنچا سا رہا۔ شاید اس نے میرے گریز کو محسوس بھی کیا تھا یا نہیں، اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کا انداز نارمل ہی رہا۔ میں سخت الجھن محسوس کرتا رہا۔ ایک طرف دل کی بے چینی تھی۔ دوسری طرف دماغ کے پے در پے کریدتے ہوئے سوالات اس کا محتاط طرز عمل اور ان سب سے سوا میری اپنی خود پسند فطرت...... میرے لیے یہی بہت تھا کہ میں دوستی میں پہل کر بیٹھا تھا، اب مسلسل اس کے بارے میں دلچسپی کا اظہار کر کے اسے یہ جتانا نہ چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے اتنی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے لیکن شاید میرا روٹھا روٹھا سا رویہ بھی یہ بات جتانے کا ایک انجانا سا طریقہ تھا جسے میں خود پہ بھی ظاہر نہ کر رہا تھا، کچھ ہی دن بعد اس نے پھر سے وہ ذکر خود ہی چھیڑ دیا۔

''عاشر! اگر آپ اپنے اس دعوے پہ اب تک قائم ہوں تو کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتی ہوں؟''

میٹنگ برخاست ہونے کے بعد سب ہی کیبن سے نکل گئے۔ لیکن زینیا وہیں موجود تھی۔ اس کے پوچھنے پہ میں نے پچھلے آدھ گھنٹے کے دوران چوتھی بار سلگایا ہوا سگریٹ ایک طرف رکھ کے کہا۔

''اول تو میں دعوے کرتا ہی نہیں اور اگر کر لوں تو دستبردار نہیں ہوتا۔''

''اس کا مطلب ہے میں سوال کر سکتی ہوں۔''

''نہیں اس کا مطلب ہے فی الحال تم صرف جواب دعویٰ کر سکتی ہو۔''

''اوہ یعنی جوابی کارروائی؟'' پھر وہی جھکی نظروں کے ساتھ گہری ہوئی مسکراہٹ۔

''میں دعوے نہیں کرتی عاشر! یقین ضرور دلاتی ہوں۔'' اچانک اس نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اسموکنگ تو خیر آپ کرتے ہی ہیں لیکن آج کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے۔ اب پلیز یہ مت کہنا کہ پریشانی کی وجہ سے......'' اس نے ہاتھ اٹھا کے پہلے ہی واضح کر دیا اور میں جو سچ مچ یہی کہنے جا رہا تھا، خجل سا ہو کے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلنے لگا۔

''اور اگر واقعی ایسا ہے تو کیا تم مجھ سے اپنی پریشانی شیئر نہیں کرو گے۔'' وہ پھر سے ''آپ'' سے ''تم'' پہ آ گئی۔ میں ایک بار پھر ٹریپ ہو گیا اور بتانے لگا۔

''امی کی طبیعت کل سے کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ رات کو ہاسپٹل ایڈمٹ کرانا پڑا۔ بی پی خاصا ہائی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے فالج کا خطرہ ہے۔ اس لیے ایک دو دن کے لیے انڈر آبزرویشن رکھا ہے۔ صبح بھی میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ میٹنگ کے دوران بھی دھیان امی کی جانب ہی لگا رہا۔''

''کون سے ہاسپٹل میں ہیں؟''

''ڈاکٹرز ہاسپٹل......'' میں نے مختصراً بتایا اور مجھے بالکل گمان نہ تھا کہ وہ شام کو واقعی انہیں دیکھنے آ جائے گی۔

میں آفس سے جلدی اٹھ گیا تھا اور پچھلے چار گھنٹوں سے امی جان کے ساتھ تھا۔ باقر بھائی جان بس صبح آدھ گھنٹے کے لیے کھڑے آئے تھے۔ ان کی چہیتی بیوی کو تو کل سے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی تھی، میں شاید آفس بھی نہ جا پاتا اگر تایا جان کی فیملی انہیں دیکھنے نہ آ جاتی، تائی امی اپنی بڑی بہو کے ساتھ وہیں رک گئیں اور میرے آنے تک انہوں نے امی جان کا خاصا دھیان رکھا۔ جاتے جاتے وہ بھی شرمین کی لاپرواہی اور بے حسی پہ سو باتیں سناتی

گئیں۔ میرا جی مکدر ہو گیا۔

''اونہہ، چند گھنٹے یہاں بیٹھنا کیا پڑ گیا۔ جیسے ہمارے گھر پہ تنقید کرنے کا حق ہی حاصل ہو گیا ہے انہیں۔''

''بھابھی نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔'' امی نے صفائی پیش کی۔

''اور وہ جو کہا جا رہا تھا کہ رفعت تم نے بہو کو سر چڑھا رکھا ہے۔ باقر کی لگام میں کھینچ کر رکھو۔ یہ کوئی طریقہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہیں کیا حق ہے ہمارے پرسنل معاملات ڈسکس کرنے کا۔''

ہمارا کوئی پرسنل معاملہ ان سے الگ ہے نا ان کا ہم سے عاشر بچے! زندگی یوں سب سے کٹ کے نہیں گزرتی۔ تم اور باقر کل کو میرے بعد کیا یونہی ایک دوسرے سے کٹ جاؤ گے۔ کیا تمہارا فہد پہ یا باقر کا تمہاری زندگی پہ کوئی حق نہیں رہ جائے گا۔ وہ بھی تمہارے مرحوم والد کے بھائی کا گھر ہے۔ دیکھ لو وقت پر اپنے ہی کام آتے ہیں۔ بھلے گھر الگ الگ ہیں۔ میں اپنے گھر اور بچوں میں مصروف، بھابھی اپنے کنبے کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی، ہفتوں ملاقات نہیں ہو پاتی لیکن دکھ درد تکلیف میں بھی رشتے ناطے کام آتے ہیں۔''

امی جان نے ہمیشہ کی طرح مجھے رشتوں اور ان کی اہمیت وافادیت کے بارے میں لیکچر دینا چاہا۔ میں نے بور ہو کے ان کے لیے سیب کاٹنا شروع کر دیا۔

''پلیز امی اس وقت تو خاموشی سے لیٹ جائیے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اچانک میری نظر دروازے پہ پڑی۔ ادھ کھلے بے آواز دروازے میں وہ زینیا تھی، جو بڑے دھیان سے امی کے ''فرمودات'' ذہن نشین کر رہی تھی۔

''ارے زینیا! تم آؤ......'' میں پرجوش سا ہو کے کھڑا ہو گیا۔

واقعی اس کا یہاں آنا میرے لیے غیر متوقع تھا لیکن مجھے اتنی زیادہ اور بے ساختہ خوشی ہو گی یہ خود میرے لیے زیادہ غیر متوقع تھا۔ شاید میرے چہرے پہ، میرے لہجے میں خوشی کے رنگ اتنے واضح تھے کہ چھلک چھلک کے ان دونوں پہ جا گرے۔ ناشناسا سی نظروں سے اسے دیکھتی امی جان بھی میرے چہرے کو تکنے لگیں اور خود زینیا بھی اس صورتحال سے محجوب سی ہو کے پزل ہو گئی۔ میں نے جلد ہی خود پہ کنٹرول کیا۔

''امی! یہ زینیا عمر ہیں، میرے ساتھ آفس میں ہوتی ہیں۔ بہت ذہین بہت قابل اور بہت......''

''اچھی دوست ہیں۔'' اس نے میرا جملہ مکمل کر کے مجھے یوں دیکھا۔ جیسے جتا رہی ہو ''لو اب دعویٰ مکمل ہوا۔''

''آؤ بیٹی! یہاں بیٹھو۔'' امی نے فوراً اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور کچھ ہی دیر میں وہ امی سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے انہیں عرصے سے جانتی ہو۔ امی نے اپنی عادت کے مطابق سب سے پہلے گفتگو کا رخ اپنے میکے کی جانب موڑا۔

''کشمیری خاندان سے تعلق ہے میرا۔ میری امی تو اللہ بخشے اصلی کشمیری خاتون تھیں۔ بعد میں والد صاحب لاہور آ کے بس گئے۔''

''ارے آنٹی! عجیب اتفاق ہے کہ میرے ماما پاپا بھی کشمیری فیملی سے ہیں لیکن لاہور رہتے آئے ہیں۔''

''اچھا تب ہی میں کہوں اپنی اپنی سی لگ رہی ہو۔ وہ لہجہ، وہی بول چال۔'' امی کو اپنی ہم ذات ہم نسل خواتین سے مل کے ہمیشہ خوشی ہوتی

تھی۔ میں یوں تو اس ذات پات وغیرہ پہ ذرا یقین نہیں رکھتا لیکن اس وقت اس کے بارے میں یہ حقیقت جان کے دل کو طمانیت سی محسوس ہوئی۔

''تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟''

''جی ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ویسے وہ میجر تھے اور ماما تو بہت پہلے وفات پا گئی تھیں۔''

''اوہ...... بہت افسوس ہوا۔ دیکھو ذرا، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور ماں باپ دونوں کے سائے سے محرومی، خیر اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ نجانے کیا کیا لے کر کیا کیا نواز دیتا ہے اور تمہارے بہن بھائی کتنے ہیں اور کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے شادی شدہ ہیں یا ابھی پڑھ رہے ہیں۔'' امی نے باقاعدہ انٹرویو شروع کر دیا۔

''جی میرے دونوں بھائی بڑے ہیں مجھ سے۔ میرڈ ہیں، ایک کینیڈا میں ہوتے ہیں۔''

''اچھا اچھا، اور کرتے کیا ہیں دونوں؟'' میں نے کوفت سے امی جان کو دیکھا جو طبیعت کی خرابی وغیرہ سب بھولے مزے سے سوال پہ سوال کر رہی تھیں۔ زینیا کے چہرے سے ذرا نہ لگ رہا تھا کہ سوالوں سے تنگ آ رہی ہے اس کے لبوں پہ وہی پرلمس زندہ سی مسکراہٹ تھی۔

''بڑے بھیا بیوروکریٹ ہیں انیس گریڈ کے آفیسر اور دوسرے کینیڈا میں پاکستانی ایمبیسی میں ہوتے ہیں۔''

اس کے بتانے پہ میں ایک بار پھر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اسی طرح پرسکون انداز میں اپنے متعلق بتا رہی تھی۔ اس نے پہلے کبھی ہلکا سا اشارہ تک نہ دیا تھا کہ اس کے دونوں بھائی اتنے اونچے عہدوں پہ فائز ہیں۔ ایک بیوروکریسی میں اعلا گریڈ آفیسر تھا، دوسرا فارن منسٹری میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ بلیک اینڈ وائٹ کنٹراسٹ کے کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس، بلیک شال اوڑھے، پیروں میں بلیک کینوس شوز، کانوں میں ہلکے سے گولڈ کے ٹاپس، ناک میں چمکتی سفید لونگ، سادہ مانگ کے ساتھ کھینچ کے بنائی چوٹی، بغیر کسی میک اپ کے گھریلو سے حلیے کے ساتھ وہ اس وقت میرا چھوڑا ہوا سیب چھیل رہی تھی۔ اس نے نفاست سے قاشیں کاٹ کے امی کے آگے رکھیں۔ صفائی سے ترشے مصنوعی روغن سے پاک ناخنوں اور لمبی انگلیوں والا ہاتھ...... وہ کہیں سے بھی اس کلاس کی نہیں لگ رہی تھی جس سے کہ اسے ہونا چاہیے تھا ایسے اونچے عہدوں پہ فائز بھائیوں کی وجہ سے۔

''میں تنگ آ گئی ہوں پھل کھا کھا کے۔'' انہوں نے شکایتاً کہا۔

''سوپ پینے پہ آپ تیار نہیں، دلیہ کھانے سے آپ کو اُبکائی آتی ہے۔ پھل کھا کھا کے آپ تنگ آ چکی ہیں۔ آخر آپ کی خدمت میں کیا پیش کیا جائے؟'' میں نے تنگ آ کے کہا بیماری کے دوران امی کھانے پینے پہ ایسے ہی نخرے کیا کرتی تھیں۔

''آپ آنٹی کو ان کی پسند کی چیزیں لا دیجئے ناں۔'' زینیا کی سفارش پر میں نے اسے مطلع کرنا ضروری جانا۔

''ان کی پسند کی چیزیں، کڑھی، بینگن کے پکوڑے، قیمہ بھرے کریلے۔ ماش کی دال، مولی کا پراٹھا...... ان کی پسند دیکھو اور ایک نظر یہ ای سی جی کی رپورٹس پہ ڈالو۔''

''واقعی آنٹی! یہ تو اچھی بات نہیں۔ اپنا خیال سب سے پہلے خود رکھنا چاہئے۔ عاشر کل سے اتنے پریشان ہیں آپ کے بارے میں، اپنے

پیاروں کو پریشان تو نہیں کرنا چاہیے۔ جب یہ چھوٹے تھے تو آپ نے بھی ہزاروں بار نہیں بد پرہیزی پہ ٹوکا ہوگا۔ سختی سے مضرِ صحت چیزوں سے دور رکھا ہوگا۔ گلا خراب ہے، آئس کریم نہیں کھاتی، زکام ہے، کولڈ ڈرنکس نہیں پینا۔ املی گندی چیز ہے، سوئٹس سے دانتوں میں کیڑا لگ جاتا ہے۔ زیادہ چنے کھانے سے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ......" اس کے یوں گنوانے پہ امی ہنس پڑیں۔

"تو اب میری باری ہے۔"

"بالکل، پرہیز تو کرنا ہوگا۔"

"پرہیز تو ٹھیک ہے لیکن یہ بد رنگ سوپ اور دلیے حلق سے نہیں اترتے، ڈاکٹر نے زیادہ مرچ مسالے اور گھی بند کیا ہے۔ نمک کم کرنے کو کہا ہے یہ تو نہیں کہا کہ دنیا کی ہر نعمت حرام ہوگئی ہے مجھ پہ۔"

"چلیں آج رات کا کھانا میں بھیجتی ہوں آپ کے لیے اور کل تک تو شاید آپ ڈسچارج ہو جائیں گی۔ کیوں عاشر؟"

"انشاء اللہ، بس ابھی ڈاکٹر آتی ہیں تو پتا چل جائے گا لیکن تم پلیز کھانا بھیجنے کی تکلیف مت کرنا۔ امی کا کھانا ہاسپٹل میس سے آتا ہے۔"

"تکلیف کیسی۔ واکنگ ڈسٹنس پہ میرا گھر ہے، بالکل قریب ہی میں تو یونہی ٹہلتے ٹہلتے آگئی، اچھا آنٹی اب اجازت دیجیے۔ میں چلتی ہوں۔"

"چلو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، آنٹی اکیلی ہیں، میں چلی جاؤں گی۔"

اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ کھانے سمیت موجود تھی۔ اس نے ہاٹ پاٹ کھول کر امی کے سامنے رکھا۔

"یہ دیسی مرغی کی یخنی میں کھچڑی پکائی ہے۔ مسالے بالکل نہیں، اور تیل بالکل کم ہے۔ مرغی کے ہی بالکل ذرا ذرا سے پیس کر کے مکس کر دیے ہیں اور یہ مکس سبزی بالکل مرچ کے بغیر ہے۔ اسٹیم کی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ یہ پھلکا بھی ہے۔" اس نے ایک ایک چیز نکال کے پیش کی۔

"اور میرے لیے کچھ نہیں لائیں؟" مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

"سوری، اگر میں کچھ اور لاتی تو پھر آنٹی سے یہ کھانا مشکل ہو جاتا۔"

"کھچڑی تو واقعی بہت لذیذ ہے۔" امی نے رغبت سے کھانا شروع کیا۔

اتنے میں باقر بھائی اچانک اندر داخل ہوئے، وہ حیرت سے امی کے قریب ہی بیڈ پہ بے تکلفی سے بیٹھی زینیا کو دیکھ رہے تھے۔ تو میں ان کے عقب میں بوتھا سجائے کھڑی شرمین کو دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے آنا کیسے گوارا کر لیا تھا۔ مارے بندھے اس نے ساس کو سلام بھی کر ڈالا۔ میں نے زینیا کا تعارف ان دونوں سے کرایا وہ بے چینی سے ان دونوں کے پیچھے کسی کو ڈھونڈنے لگی پھر مایوس سی ہو کے پوچھ بیٹھی۔

"فہد نہیں آیا۔"

سب کے ساتھ ساتھ میں بھی متعجب ہوگیا۔ شرمین کی تو باقاعدہ تیوریاں چڑھ گئیں وہ بیچاری خود شرمندہ ہوگئی۔ سب کے تاثرات دیکھ کے

پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہنے لگی۔

''دراصل عاشر اکثر ذکر کرتے رہتے ہیں اس کا اور ابھی آنٹی نے بھی اس کی اتنی پیاری پیاری باتیں بتائیں کہ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہنے لگا۔''

''بچوں کا ہاسپٹل میں کیا کام، ہزاروں طرح کے جراثیم ہوتے ہیں، اسے کیا ساتھ لا کے بیمار کرنا تھا میں نے۔''

شرمین تنک کے بولی، تن فن کرنے اور چبا چبا کے بولنے کی اسے ایسی بری بیماری ہوگئی تھی کہ اب وہ نارمل لہجے میں تو بات کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ہم سب تو عادی تھے لیکن کسی انجان کے سامنے اس کا ایسا چبھتا لہجہ برا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے بھی زینیا کی گھبراہٹ محسوس کر کے اسے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

''امی کو کوئی چھوت کی بیماری تو نہیں ہے۔''

''میں چلتی ہوں۔'' وہ امی کی جانب جھکی تو ایک ثانیے کو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں۔ پھر جیسے نہال ہو کے اس کا ماتھا چوم لیا۔ اسکا پیار لینے کا یہ انداز شرمین کو اور سلگا گیا۔ خود وہ ان کی بہو اور بھانجی ہونے کے باوجود کبھی قریب تک بیٹھنا گوارا نہ کرتی تھی۔ اس کے آنے کے بعد مجھے ہاسپٹل کے اس کمرے میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی میں زینیا کو گھر چھوڑنے کے بہانے وہاں سے نکل آیا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، صرف پانچ منٹ کی واک پہ، جی ون میں اس کا گھر تھا۔ چھوٹا سا مختصر سا سنگل اسٹوری مکان۔ بمشکل دو بیڈ روم پہ مشتمل ہوگا۔ میں ایک بار پھر الجھن کا شکار ہوگیا تھا۔ اتنے اُونچے رتبوں والے بھائی اور بہن اس پانچ مرلے کے، چند لاکھ کی مالیت والے مکان میں رہتی ہے۔ اتنا یقین تو مجھے تھا کہ کم از کم اس کے بھائی وہاں نہ رہتے ہوں گے۔ مکان کے باہر نہ تو کسی سرکاری افسر کے نام کی پلیٹ تھی نہ ہی سفارت کار کی پورچ میں سرکاری نمبر پلیٹ والی مرسڈیز یا پجیرو کے بجائے زینیا کی اپنی مزدا کھڑی تھی۔ اسے کی ہول میں چابی گھماتے دیکھ کے میں نے پوچھا۔

''تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''نہیں پھوپھو سوگئی ہوں گی، اس لیے میں ڈپلی کیٹ چابی لے آئی۔'' اس نے گیٹ کھولا اور اندر جانے سے پہلے مسکرا کے مجھے دیکھا۔

''اوکے عاشر! گڈ نائٹ، آنٹی کا خیال رکھنا۔'' وہ فوراً اندر چلی گئی اور دھڑ سے گیٹ بند ہوا۔ کلک کی آواز سے لاک لگا اور میری کنپٹیاں کھنچ گئیں۔

''ویری روڈ، کم از کم مجھے ایک کپ کافی تو آفر کرسکتی تھی۔'' میں نے اس کی بے نیازی پہ تلملاتے ہوئے سوچا۔ مجھے کافی کی اتنی طلب نہ تھی۔ جتنا کہ میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش رکھتا تھا۔ میں سب جاننا چاہتا تھا، سب کچھ، مجھے اپنے تمام سوالوں کے جواب چاہئے تھے۔ میں اپنے ہر وہم کی تسلی کرانا چاہتا تھا۔

شاید میں اندر سے اب تک وہی امچیور، جذباتی سا عاشر ملک تھا۔ جس نے ایک بار شرمین کے تاؤ دلانے پہ بڑے چیلنج بھرے انداز میں کہا تھا۔

''میری پسند کی ہوا تک نہیں لگ سکتی تمھیں۔

''تم کیا۔ زمانہ دیکھے گا عاشر ملک کی شریک حیات، ہر لحاظ سے بے مثال ہوگی۔''

''میں صرف ''بہترین'' کے لیے بنا ہوں۔''

اس بات کو عرصہ گزر چکا تھا لیکن میرے کہیں اندر یہ چیلنج اب تک کسمسا رہا تھا اپنا آپ منوانے کے لیے۔ اس دور کی باتوں کو بچپنا کہہ کر جھٹلا دینے والا میں اب تک اسی جذباتیت کے زیر اثر تھا۔ شرمین سے قطع تعلق اور ہر طرح کی لاپروائی برتنے کا دعویٰ کرنے والا میں دانستہ اور نادانستہ ہر بات میں اب بھی اسکا مقابلہ کیا کرتا۔ اس نے کسی زمانے میں ریشم کے حوالے سے مجھ سے جو طنزیہ باتیں کہیں تھیں میں لاشعوری طور پر اب تک ان کے زیر اثر تھا اور دوبارہ کبھی یہ طعنہ سننے کی پیش بندی کر رہا تھا۔

میں زینیا سے متاثر تھا، اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اسے اپنانا بھی چاہتا تھا لیکن ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد......اس کے ہر طرح سے مکمل اور ''بہترین'' ہونے کے یقین کے ساتھ ابھی تک بہت سی ایسی باتیں تھیں جو جاننا باقی تھیں۔ میں اس کی ظاہری عادات و رکھ رکھاؤ، قابلیت و ذہانت کا قائل تھا۔ اس کے فیملی بیک گراؤنڈ سے واقف ہو چکا تھا لیکن اس کا اپنے بھائیوں سے کٹ کر رہنا مجھے شک وشبہات میں مبتلا کر گیا۔ مجھے اور کئی طرح کے وہم ستانے لگے۔ اسی بے چینی کے زیر اثر میں اگلے ہی روز آفس میں پھر اس سے پوچھ رہا تھا۔

''تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تم ماشاءاللہ سے اتنے تگڑے قسم کے بھائیوں کی اکلوتی بہن ہو۔''

''اس بات کا تو نہ میری جاب سے تعلق ہے اور نہ ہی ہماری دوستی سے......پھر میں ذکر کیوں کرتی......؟ بلکہ عاشر صاف بات تو یہ ہے کہ ان کا مجھ سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اس تکلیف دہ ذکر کو رہنے دیں۔''

وہ اس موضوع سے فوراً گھبرا اٹھی۔ اس کی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی۔ اب وہ آنکھیں کسی جوگی کی آنکھیں تھیں۔ سب کچھ تیاگ دینے والے جوگی کی۔ میں نے کہا تھا نا یہ آنکھیں، یہ آنکھیں عام آنکھیں نہیں تھیں۔ پل پل رنگ بدلنے والی، تیور بدلنے والی۔

''کیا وہ تمہارے سگے بھائی نہیں؟'' میں نے قیاس کیا۔ ہوسکتا ہے زینیا میجر صاحب کی دوسری بیوی کی اولاد ہو۔''

''سگے......'' وہ استہزائیہ ہنسی۔ ''وہ دونوں سگے ہیں......سگے......''

''تو پھر، تمہارا اس طرح ان سے الگ، اکیلے رہنا، مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔'' میں نے کریدنا جاری رکھا۔

''مجھے بھی نہیں......'' اب وہ آنکھیں کسی میلے میں کوئی ہراساں بچی کی آنکھیں تھیں۔ شاید میں اور بھی کچھ پوچھتا۔ شاید وہ اور بھی کچھ بتاتی لیکن اتنے میں نوید کی آمد نے ہم دونوں کو یہ موضوع بدلنے پہ مجبور کر دیا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی بے چینی اور اضطراب پر قابو نہیں پا رہی۔ مجھے کسی غیر معمولی بات کے ہونے کا اندیشہ خبردار کرنے لگا۔

امی اب پہلے سے کافی بہتر تھیں۔ ہاسپٹل میں قابل ڈاکٹرز کی دو روز تک ٹریٹمنٹ نے انہیں بھلا چنگا کر دیا تھا۔ کچھ وہ بھی اپنا دھیان رکھنے لگی تھیں۔ پرہیزی کھانا کھایا جاتا، شام کو لان میں واک بھی کرتیں، سب زینیا کے اس روز کے لیکچر کا اثر تھا۔ اس شام انہیں کسلمندی سے بستر پر پڑے دیکھ کے میں ٹھٹکا۔

''کہاں کا بلڈ پریشر اور کیسی بیماری۔ میری جان کو تو ایک ہی روگ لگا ہوا ہے، شرمین اور باقر کی ناچاقی اور کل کل......'' وہ جل کے بولیں۔

''آپ نے پھر سے ان کی ٹینشن کو سر پہ سوار کرنا شروع کر دیا۔

لگتا ہے زینیا کے لیکچر کے اثرات کم ہونے لگے ہیں۔اس سے کہوں گا ایک ڈوز اور دے جائے۔'' اس کے ذکر پہ امی کا بھی دھیان اسی طرف چلا گیا۔

''ہاں کسی بہانے وہ آئے تو سہی۔ سچ بڑی اپنی اپنی سی لگی وہ بچی مجھے لگتا ہی نہ تھا کہ پہلی بار ملی ہے۔نہ کوئی ملاوٹ،نہ بناوٹ،اس دنیا کی تو لگتی ہی نہیں۔''

''اچھا میں بتاؤں گا، آپ اسے مریخ کی مخلوق کہہ رہی تھیں۔''

''چل ہٹ...... مگر اسے یہ ضرور کہنا میں اسے یاد کر رہی تھی۔ تاکید کرنا کسی روز بہت سارے وقت کے لیے مجھ سے ملنے گھر پہ آئے۔ کاش...... کاش میری کوئی اس جیسی بیٹی ہوتی۔'' بڑے عرصے کے بعد امی جان کو اپنی بھولی بسری خواہش یاد آئی۔ میں کہتے کہتے رہ گیا کہ ''آپ چاہیں،تو وہ آپ کی بیٹی بن بھی سکتی ہے۔''

''ایسی بابرکت،سعادت مند بچیاں ہی تو گھر کی رونق ہوتی ہیں۔ایسی بچیوں کا وجود نعمت ہوتا ہے۔'' وہ حسرت زدہ لہجے میں کہتی رہیں اور میں سوچتا رہا۔''یہ رونق،یہ نعمت اب بھی ہمارا نصیب بن سکتا ہے۔''میں منتظر ہی رہا کہ شاید وہ باتوں باتوں میں کوئی ایسا اشارہ دیں اس کے حوالے سے مجھ سے کوئی رائے طلب کریں۔اسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کریں لیکن وہ صرف اس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہیں،بور ہو کے میں اُٹھ گیا۔یہ سب تو میں پہلے سے جانتا تھا۔بہر حال اگلے ہی روز میں نے امی کی خواہش ضرور زینیا کے سامنے دہرا دی۔ وہ کچھ نہ بولی صرف نگاہیں جھکائے،سر کو ہلکی ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے مسکراتی رہی۔ مسکراتی رہی اور میں...... میرا ہاتھ...... وہ لمس...... وہ اپنائیت...... وہ ٹھنڈک۔

''عاشر!تم نے زینیا کو کہا نہیں کہ گھر آئے۔''امی نے پوچھا۔

''کہا تھا امی!''میں نے فہد کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر وہ آئی کیوں نہیں۔آج اتوار ہے۔آج ہی آجاتی۔تم نے ڈھنگ سے کہا بھی نہیں ہوگا۔''

''اب اور کس ڈھنگ سے کہتا۔''میں زچ ہو کے بولا۔

''گڑگڑاتے ہوئے،ہاتھ جوڑتے ہوئے،اللہ کے واسطے دیتے ہوئے۔''

شرمین نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنی کڑوی زبان کے جوہر اگلے،میرا حلق تک کڑوا زہر ہو گیا،گڑگڑانے،ہاتھ جوڑنے اور اللہ کے واسطے دینے کے مشورے وہ مجھے دے رہی تھی۔عاشر ملک کو،میں طیش کے مارے فہد کو ایک طرف اُتار کے اس کی طرف بڑھا۔وہ سہم کے دو قدم پیچھے سرکی۔امی نے دہل کے مجھے آواز دی۔

''عاشر!خدا کے لیے بیٹا......!''وہ میرے تیوروں سے ڈر گئی تھیں۔

اور شاید شرمین بھی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ میری خاموشی اور سرخ چہرے سے لیکن ذرا سنبھل کے اس نے پھر سے مجھے بھڑکانا چاہا۔

''اتنا عرصہ ہوگیا، باقر کے آفس سے کوئی ورکر گھر تک نہیں آیا۔ یہ نیا رواج نکلا ہے۔ ملازموں کو گھر تک بلا کے ساتھ بٹھا کے لاڈ جتانے کا۔''

''وہ ملازم نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اپنی یہ سرمایہ دار اور زمیندار قسم کی سوچ بدل لو۔ تعلیم تم حاصل کر بھی لیتیں تو تمہارا کچھ نہ بگڑتا۔ لیکن بدلتے وقت کے تقاضے تک تمہارے ذہن کو ہوا نہیں لگا رہے۔ وہ جتنی کوالی فائیڈ اور جینئس ہے تم اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتیں۔'' میں نے دانستہ اس پہ زینیا کا تعلیم یافتہ ہونا جتلایا تھا۔ اصل میں اس کا اسے معمولی ورکر اور ملازمہ کہہ کے بلانا مجھے تاؤ دلا گیا تھا۔

''ہونہہ، جینئس ہوگی تو اپنے گھر ہوگی۔'' وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی۔ ''میں تو صرف اتنا جاننا چاہ رہی تھی اس طرح ایک غیر لڑکی کے لیے اتنی بے تابی دکھانے کا کیا مطلب ہے۔ ایک ہفتہ ہوگیا ہے امی کے پاس اور کوئی ٹاپک ہی نہیں۔ زینیا، زینیا ہو رہا ہے۔''

''اس بات کا تم سے کیا تعلق؟ کیوں بے کار میں الجھنا شروع کر دیتی ہو۔ عادت ہوگئی ہے تمہیں تماشے لگانے کی۔'' باقر بھائی جان بھی کمرے سے نکل آئے۔ ''وہ زینیا کو یاد کریں یا کسی کو بھی تمہیں کیا تکلیف ہے۔''

''مجھے تکلیف اس بات کی ہے کہ یہ سب مجھے سنانے کے لیے کہا جاتا ہے مجھ پہ یہ جتانے کے لیے کہ ایک میرے سوا اور سب کی اہمیت ہے اور سب اچھے ہیں صرف میں ہی بری ہوں۔''

وہ چیخی، فہد سہم کے میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں اس کے بال سہلا کے دھیرے سے اسے الگ کر کے امی کے حوالے کرنے کے بعد گھر سے نکل گیا۔ گھنٹوں بے مقصد گاڑی سڑکوں پہ دوڑانے کے بعد میں تھکے ہوئے وجود اور شل ہوتے دماغ کے ساتھ گھر لوٹا تو پورچ میں زینیا کی مزدا کھڑی دیکھی۔ بے تابی سے میں اندر کی طرف بڑھا، وہ جانے کے لیے نکلنے ہی والی تھی۔

''بس تم گئے ہی تھے کہ زینیا آگئی میں نے کہا بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔''

امی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور یہ ذکر کیسا تھا اگر زینیا جان لیتی تو الٹے قدموں لوٹ جاتی۔ میں نے صبح کا واقعہ یاد آنے پہ امی جان کی بشاشت کو حیرت سے محسوس کیا۔ ایسی ہر تلخی کے بعد وہ دونوں نڈھال رہتیں لیکن یہ شاید زینیا کی آمد کا اعجاز تھا۔ میں نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔

''اب میں آیا ہوں، تو تم چل پڑی ہو، کچھ دیر بیٹھو تو سہی۔''

''نہیں...... پھر کبھی، کافی دیر ہوگئی ہے۔ پھوپھو اکیلی ہوں گی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ فہد نے آگے بڑھ کے اس کی انگلی تھام لی۔

''رک جائیں نا آنٹی! اتنا مزا آرہا ہے۔''

''مزا'' میں نے ادھر ادھر شرمین کو ڈھونڈنا چاہا۔ بھلا اس کے ہوتے ہوئے کیسا مزا آسکتا تھا۔ وہ تو صرف ''مزا چکھانا'' جانتی ہے۔

''باقر اور شرمین کو حمید بھائی کی طرف جانا تھا۔ آج ارمین کے دن رکھنے ہیں۔'' چھوٹے ماموں کی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی جو نہ صرف شرمین کی چچازاد بلکہ خالہ زاد بھی تھی اس لیے خراب موڈ کے باوجود وہ تقریب مس نہ کر سکی۔ فہد کو فلو تھا۔ شاید اسی لیے وہ گھر پہ تھا۔ اور اب زینیا سے یوں چپکا کھڑا تھا جیسے برسوں پرانی دوستی ہو۔

''لگتا ہے خوب گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔''

''فہد ہے ہی بہت اچھا، بڑا پیارا......''اس نے جھک کے فہد کا گال چوما۔

''میں پھر آؤں گی، فہد سے ملنے۔''

اس نے بچے کو وعدے سے بہلایا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں گھر سے نکلا ہی کیوں۔ اگر مجھے ذرا بھی یاد ہوتا کہ شرمین کو تقریب میں جانا تھا تو میں اس پہ لعنت بھیجتا ہوا چھٹی کا دن گھر پہ انجوائے کرتا لیکن اس وقت اس سے فرار کے علاوہ اور کچھ سوجھا بھی نہیں۔

''فہد تو یوں گھل مل گیا جیسے وہ اس کی سگی ہو۔ سچ ہے، بچہ محبت کا ہوتا ہے۔ جہاں پیار نظر آئے وہیں کھنچتا ہے۔ ان معصوموں سے زیادہ محبت کی پہچان اور کسے ہو گی اور زینیا تو ہے ہی سر سے پیر تک محبت سے گندھی ہوئی۔''امی نے پھر سے اس کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔

''لیجیے ابھی ایک ملاقات کا نشہ اُترا نہیں تھا کہ اب وہ پھر سے آپ کو اسٹارٹ کر گئی۔''میں نے بظاہر اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا، لیکن اندر سے میرا دل خوشی سے بھر رہا تھا۔

''خوشی......کیسی خوشی......کسی اپنے کی، دل سے بہت قریب ہستی کی، تعریف خوشی دیتی ہے۔ شاید اس لیے......نہیں بلکہ اس لیے کہ امی کا زینیا کی تعریف کرنا مجھے اپنی تعریف لگتا تھا، مجھے ایسے لگتا تھا جیسے وہ مجھے سراہ رہی ہوں کہ میں نے زینیا کو ڈھونڈ نکالا۔ واقعی......قابل تعریف تو میں ہوں، جو ان کے لیے ہر لحاظ سے مکمل، بہو تلاشنا چاہتا ہوں۔ ایک پرفیکٹ لیڈی، آئیڈل بیوی اور پسندیدہ بہو۔ اگر میں زینیا کو ایسا ہی پانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو سارا کریڈٹ مجھے ہی ملنا چاہیے۔''

''پاپا! کل جو آنٹی آئی تھیں انہوں نے مجھے وکس اس طرح لگائی کہ میری ناک ایک دم سے کھل گئی۔''

کئی دنوں سے سینے میں جکڑن اور بند ناک کی تکلیف میں مبتلا فہد کی طبیعت ٹھیک دیکھ کے باقر بھائی نے ناشتے کی ٹیبل پہ اس سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔ شرمین سلائس پہ جام لگاتے لگاتے رک کے اسے دیکھنے لگی، پھر اس کی سوالیہ نظریں مجھ سے ہوتی امی پہ جا رکیں۔ امی کل کی بدمزگی سے خائف تھیں، بوکھلا کے انہوں نے موضوع بدلنا چاہا لیکن میں نے شرمین کو چڑانے کے لیے فہد سے پوچھا۔

''ارے کہیں چمچے بھر کے کھلا تو نہیں ڈالی۔''

''چاچو......! آپ بھی بس......''وہ کھلکھلانے لگا۔''بھلا وکس بھی کوئی کھاتا ہے۔ آنٹی نے گرم پانی میں وکس گھولی۔ میرا منہ اس پہ کر کے زور زور سے سانس لینے کا کہا اور میں ٹھیک ہو گیا۔''

''اور اگر یہ گر جاتا گرم پانی میں، کون سی نیم حکیم آنٹی آئی تھی، میرے بچے پہ تجربے کرنے کے لیے۔''

''کوئی نہیں شرمین......! وہ تو زینیا آئی تھی۔ میری خیریت دریافت کرنے فہد کو سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی اس لیے اس نے وکس کی بھاپ دی۔''امی نے وضاحت کی۔

''اوہ تو آخر منت سماجت کر کے عاشر اسے لے ہی آیا۔ ویسے سوچنے کی بات ہے، عاشر نے کبھی گھاٹے کا سودا کیا تو نہیں۔ پھر اس لڑکی

سے ایسا کیا مفاد وابستہ ہے جو یوں سر آنکھوں پہ بٹھایا جا رہا ہے۔''

''کم از کم صبح صبح تو اپنی بکواس بند رکھا کرو۔'' باقر بھائی جان نے زور سے کپ میز پر پٹخا۔ ''تم کیوں دوسروں کے معاملات میں دخل دیتی ہو۔ جب کہ خود تمہیں اپنے کسی معاملے میں دوسرے کی دخل اندازی پسند نہیں۔ یہ صرف تمہارا گھر نہیں۔ یہاں کون کس سے ملنے آتا ہے کون کس کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ سب تم سے اجازت لینے کے بعد نہیں طے ہوگا۔'' اب بھائی جان خود ہی کافی تھے۔ کچھ اس لیے بھی میں خاموش رہتا تھا۔

''اگر تم یوں میری بے عزتی نہ کرو تو شاید میری بھی کوئی حیثیت بن پائے، اس گھر میں لیکن میں بیوی ہوں تمہاری اور تم...... تم مجھے بھی ذلیل کرنے پہ تلے ہوئے ہو۔''

''تمہاری حرکتیں ہی ذلیل کروانے والی ہوتی ہیں، تم خود دوسروں کو ذلیل کروگی تو بدلے میں ذلالت ہی حاصل کروگی۔'' وہ ناشتے سے اٹھ گئے۔

شرمین نے ٹی پاٹ ہاتھ کے دھکے سے ٹیبل پہ الٹا، گرم گرم چائے اچھل کے فہد تک گئی وہ چیخ کے پیچھے ہوا اور کرسی الٹ جانے سے نیچے جا گرا۔ میں اور امی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کی طرف لپکے۔ کمرے کی طرف جاتے بھائی جان بھی پلٹ آئے۔ شرمین فق ہوتے چہرے کے ساتھ اُٹھی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتی بھاگ گئی۔ فہد حلق پھاڑ کے رو رہا تھا۔ میں نے اسکے ریشمی بالوں سے ڈھکا سر ٹٹولا۔ کسی چوٹ یا زخم کا نشان نہیں تھا۔ کارپٹ ویسے بھی خاصا دبیز تھا وہ امی سے لپٹ کر دھاڑیں مار رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں جان گیا وہ کیوں رو رہا تھا، اسے گرنے سے چوٹ نہیں آئی۔ اس کے اندر کچھ گرا تھا۔

اس روز سارا وقت میرا موڈ خراب رہا۔ رہ رہ کے فہد کی سسکیاں یاد آتیں۔ میں مٹھیاں بھینچ کے رہ جاتا۔ دل کر رہا تھا ابھی گھر جاؤں اور فہد کے ایک ایک آنسو کا بدلہ اس سے لوں، اس سے...... فہد کی ماں سے...... اور یہ خیال مجھے ست کر دیتا۔ جو بھی تھا بہر حال اس کی ماں تھی اور میں محض چاچو ہوں وہ میری نسبت اس پہ زیادہ حق رکھتی ہے۔

''تم اب کچھ زیادہ ہی الجھے الجھے رہنے لگے ہو؟'' میرے مسلسل عدم دلچسپی کے اظہار پہ زینیا نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اور کوئی کام نہیں میرے بارے میں اندازے لگانے کے علاوہ۔'' میں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ ہمیشہ میرے اندر سے بات اگلوانے میں کامیاب ہو جاتی تھی اور جب بھی میں کچھ پوچھنا چاہتا ٹال دیتی۔

''درست اندازے۔'' اس نے بڑے سکون سے تصحیح کی۔ ''تمہاری الجھن کا سبب ضد ہے۔'' اس نے پوچھا نہیں، بتایا اس کے سچ مچ کے اندازے پہ میں حیران ضرور ہوا لیکن تسلیم کر کے اسے مغرور ہونے کا موقع دینے کے بجائے میں نے جھٹلانا چاہا۔

''فہد فہد کیوں۔ وہ ننھا سا بچہ کیسے میری پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ تم زیادہ سائیکاٹرسٹ بننے کی کوشش مت کرو۔''

''یعنی تم کہنا چاہتے ہو کہ تم سائیکک ہو۔''

''واٹ ڈو یو مین......'' میں پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

''میں تم سے صرف بات کر رہی ہوں اور تم مجھے ٹوک رہے ہو کہ میں ایسا نہ کروں کیونکہ میں سائیکاٹرسٹ نہیں ہوں اس کا مطلب تو یہی ہوا ناں کہ تمہیں سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔''

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میرے بارے میں جو اندازے لگاتی رہتی ہو وہ درست نہیں۔ عاشر ملک کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔''

''او کم آن، تم کوئی بجھاوت نہیں، ایک سیدھے سادے کھلی کتاب کے جیسے نارمل سے فرد ہو۔''

''سیدھا سادا، ہاہا کھلی کتاب ہاہاہا......'' میں دل ہی دل میں خوب ہنسا۔ ''اچھا تو اس کھلی کتاب میں کیا لکھا ہے۔''

''پہلا نام تو تمہارا اپنا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ محبت تم خود سے کرتے ہو۔'' میں نے پوری کوشش کی کہ میرے تاثرات چہرے پہ ظاہر نہ ہوں۔

''دوسرا نام 'امی' ہیں اور تیسرا نام فہد کا ہے۔'' اتنا کہہ کے وہ رکی، مسکرائی۔ میرے تنے تنے اعصاب کو اس تبسم کا لمس پرسکون کرنے لگا۔ کیا کبھی کسی نے کسی مسکراہٹ کا لمس محسوس کیا ہے۔ میں نے کیا ہے، ہزار بار کیا ہے۔ ہزار بار جب وہ مسکراتی ہے۔

''تم ان دونوں کی وجہ سے پریشان ہو سکتے ہو لیکن چونکہ امی کی اکثر پریشانیوں کا حل تمہارے پاس ہے یا یوں کہہ لو کہ تم ان کو کم کرنے کا اختیار رکھتے ہو اس لیے میں فہد کا نام لے رہی ہوں کیونکہ تمہاری پریشانی میں ایک طرح کی بے بسی مچل رہی ہے جیسے تم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہے۔''

''لیکن میں کروں گا ضرور......'' میں نے تسلیم بے شک نہ کیا لیکن انکار بھی نہ کر سکا۔ اس کی قیافہ شناسی کا میں ایک بار پھر قائل ہو چکا تھا۔

واقعی فہد کے وجود سے شرمین کا منسلک ہونا مجھے تکلیف دیتا تھا۔ وہ مجھے پیارا لگتا تھا۔ دل خود بخود اس کی جانب کھنچتا تھا لیکن اس کی ماں وہ عورت مجھے اس کی ماں کی حیثیت سے ہرگز قبول نہیں تھی۔ فہد میرے لیے ایک ایسا پھول تھا جو شرمین جیسے کانٹے کی وجہ سے میری دسترس سے دور تھا۔ میں اکثر سوچتا...... کیا تھا جو شرمین نہ ہوتی مگر فہد ہوتا...... اور پھر خود بھی اپنے خیال پہ ہنس پڑتا۔

''کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے زینیا۔ میں آج تک باقر بھائی جان اور زینیا کے تعلق کو سمجھ نہیں پایا۔ دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہیں لیکن ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں پتا نہیں وہ دونوں الگ کیوں نہیں ہو جاتے۔''

''تم اس انتہا تک کیوں سوچتے ہو، کیا اس بات کا فہد پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔''

''نہیں وہ بہت سے برے اثرات سے دور ہو جائے گا۔ میری بے بسی اور غصے کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب سے وہ پیدا ہوا، امی یا پھر کسی حد تک میں اس کا دھیان رکھ رہا ہوں وہ دونوں اس کے ماں باپ ہیں مگر صرف کہنے کی حد تک میں پوچھتا ہوں کیا حق ہے انہیں اس بچے کو اپنے پراپرٹی سمجھنے کا۔''

''پراپرٹی تو تم اسے بنا رہے ہو عاشر! تمہیں اس سے پیار ہے تم اس کا خیال رکھتے ہو۔ یہ ایک فطری سی بات ہے تمہارا اس سے خون کا رشتہ ہے تم اس کے چچا ہو لیکن تم اس رشتے سے بھی تو اس کے لیے کچھ کر سکتے ہو، تم اس کا سب کچھ کیوں بننا چاہتے ہو، کیوں یہ چاہتے ہو کہ وہ اپنے ماں باپ کا نہ رہے صرف تمہارا بن کے رہے۔

وہ کوئی چیز نہیں ہے، انسان رہے۔ انسان کسی کی بھی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ تمہارا اپنا بچہ...... عاشر...... تمہارا اپنا بچہ بھی صرف تمہارا نہیں ہو سکتا۔ اس میں بھی کوئی دوسری ہستی تمہاری حصے دار ہوگی۔ تو فہد تو پھر تمہارے بھائی کا بچہ ہے۔ شرمین تمہارے لیے کتنی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو، اسے فہد

کی ماں خدا نے بنایا ہے۔ تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟''

''مجھے اعتراض ہے.....''میں نے زور دے کر کہا ''میں اس کے لیے سب اچھا چاہتا ہوں۔ بہترین۔''

''تمہارا مسئلہ پتا ہے کیا ہے عاشر.....!تم ہر چیز صرف بہترین ہی نہیں چاہتے، مکمل اپنی بھی چاہتے ہو۔ بلکہ اپنی دسترس میں۔ اپنی مٹھی میں۔ ماں صرف تمہاری، بھائی صرف تمہارا.....یہ کیسے ہو سکتا ہے ماں صرف تمہاری تب ہوتی جب تم اکلوتے ہوتے۔ جب خدا نے ایسا نا منظور کیا تو تم بھی اس تقسیم کو کھلے دل سے مان لو۔ رہی شرمین.....تو تمہارے تسلط پسند رویے کو کچھ کچھ جانتے ہوئے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کے بجائے کوئی اور عورت بھی تمہارے بھائی کی بیوی ہوتی تم اسے ناپسند ہی کرتے۔''

''بکواس، نری بکواس۔''اس کی ہر بات سچی تھی۔ میرے دل کا چور دبک کے سنتا رہا لیکن آخر میں اس کے اندازے غلط جگہ پڑ گئے۔ مجھے احتجاج کرنے کا موقع مل گیا۔

''تم دور بیٹھی بس اندازے لگاتی رہنا۔ تم یقین کرو، وہ اس بچے کو تباہ کر رہے ہیں۔ اگر شرمین کسی قابل ہوتی، بھائی جان اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن اور خوش ہوتے تو وہ فہد کو بھی توجہ دیتے۔ پیار دیتے۔ لیکن اس شادی نے انہیں سوائے ٹینشن کے کچھ نہیں دیا۔ نتیجتاً وہ فہد سے بھی بیزار ہو گئے اور شرمین، اسے نہ شوہر سے دلچسپی ہے نہ اولاد سے، نہ گھر سے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے خود سے بھی دلچسپی نہیں۔ اگر اسے کم از کم خود سے ہی محبت ہوتی تو وہ اپنی زندگی خوشگوار بنائے رکھنے کے لیے اور کچھ نہیں تو سمجھوتہ ہی کر لیتی یا پھر.....طلاق لے لیتی۔ بھائی جان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر شریف انسان ہیں۔ یہ رشتہ امی کا بنایا ہوا ہے وہ سارے نتائج بھگتنے کے لیے امی کو آگے کر کے خود ایک طرف ہو گئے ہیں تاکہ کسی دن وہ خود ہی تنگ آ کے اس رشتے کو ختم کرنے کا حکم دے دیں اور وہ تابعداری کا ثبوت دیتے ہوئے یہ حکم بجا لائیں کہ جیسی آپ کی مرضی.....آپ نے ہی پلے باندھی، آپ کی خوشی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ امی کا بھی ایک مسئلہ ہے وہ وہی صدیوں پرانے مشرقی میکہ نواز رومانٹسزم کا شکار ہیں۔ شرمین ان کے چہیتے بھائی کی چہیتی بیٹی ہے۔ لیکن شرمین کا مسئلہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ چاہے تو آسانی سے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ بارہا وہ کہہ چکی ہے کہ یہ شادی اس کے لیے قید ہے، سزائے عمر کی۔ کیوں نہیں اپنے کروڑ پتی باپ کے ذریعے اس قید سے چھٹکارا پا لیتی۔ آئے دن شوہر کو اپنے باپ کے ہاتھوں ذلیل کروا سکتی ہے۔ تو طلاق بھی لے سکتی ہے۔ لیکن میں نے کہا ناں کہ اسے خود تک سے دلچسپی نہیں وہ اپنے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی۔''

''ویسے اس کی وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ شرمین تمہارے بھائی سے سچ مچ محبت کرتی ہو اس لیے ہزار اختلافات اور تلخیوں کے باوجود ساتھ رہنے پہ مجبور ہو۔''

''محبت.....اور شرمین اور وہ بھی باقر بھائی جان سے۔''میں دل کھول کے ہنسا۔

''اتنے سالوں میں، میں نے آج تک اس کے چہرے پہ محبت کی ہلکی سی رمق تک نہیں دیکھی ان کے لیے۔ شروع دنوں میں بھائی جان ضرور اس کے دیوانے تھے، آگے پیچھے پھرا کرتے۔ اس کی بے نیازیوں، کج ادائیوں کو ادائیں جان کے نثار ہوا کرتے۔ ہر گستاخی بدتمیزی پہ پردے ڈالا کرتے لیکن وہ اول روز سے ایسی ہے۔ شاید اسی لیے رفتہ رفتہ بھائی جان کی محبت یا کشش، جو بھی کہہ لو۔ مایوس ہوتے ہوتے بالآخر فوت ہو گئی۔ میں تو اکثر امی سے کہتا ہوں

لوگ اپنی ویڈنگ اینی ورسری مناتے ہیں، انہیں برسی منانا چاہئے۔'' تمسخر سے کہتے کہتے میں نے اسے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

آنکھیں اب کسی وحشت زدہ ہرنی کی آنکھیں تھیں۔

''ہیلو......'' میں نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ''تم سن رہی ہو......''

''آں...... ہاں...... تم کہہ رہے تھے۔ برسی......'' وہ بڑبڑائی۔

''مجھے یاد ہی نہ رہا۔''

''کیا......''

''تم سے ایک بات کرنی تھی۔ اچھا ہوا وقت پہ یاد آ گئی۔ پرسوں منڈے کو میں آفس نہیں آپاؤں گی۔ ایک ضروری کام ہے۔''

''میڈم منڈے کو اسٹرائیک ہے۔ ویسے بھی آفس بند ہو گا۔'' میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اکٹھی دو چھٹیاں مجھے بور کر رہی تھیں۔ سنڈے کو تو میں فہد اور امی کو لے کر آؤٹنگ پہ نکل گیا لیکن منڈے کو شرمین اپنے میکے چلی گئی بمعہ فہد کے اور ایسے ہی مواقع ہوتے جب مجھے بے بسی کا احساس ہوتا۔ کیوں کیوں مجھ سے زیادہ حق کوئی اس پہ جمائے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔

لنچ کے بعد میں صوفے پہ پڑا چینل چینج کر رہا تھا جب میری نظر لاؤنج کی کھڑکی سے باہر گئی۔ ایک ٹیکسی اندر آ کے رکی تھی۔ میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی میں کون آسکتا ہے اور زینیا کو ٹیکسی سے نکلتے دیکھ کے تو میں حیران ہی رہ گیا۔ وہ اندر آئی تو واضح طور پر ڈسٹرب لگ رہی تھی۔ بکھری بکھری سی۔

''زینیا تم...... ٹیکسی میں......'' میں اس کے آنے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''ہاں وہ...... میری گاڑی کل سے ورکشاپ میں ہے۔'' امی بھی اس کی خبر ملتے ہی کمرے سے نکل آئیں۔ وہ ان سے ملنے لگی میں ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔

''خیریت تو ہے زینیا، کوئی ایمرجنسی تھی کیا۔ کیسے آنا ہوا۔''

''پاگل ہوئے ہو عاشر، کیا ہمارے گھر آنے کے لیے کسی ایمرجنسی کا ہونا ضروری ہے۔'' امی نے ٹوکا۔

''نہیں امی! دراصل زینیا کی گاڑی خراب ہے۔ میرا مطلب تو یہ تھا مگر کوئی ضروری کام تھا تو مجھے فون کرتی، میں لینے آ جاتا۔''

''کام تو کوئی نہیں تھا، بس یونہی آپ سب سے ملنے کو دل چاہا اس لیے چلی آئی۔'' شاید میرے ردعمل سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی میں نے اس کے ''آپ سب'' سے کوئی خوش کن مضمون نکالنا چاہا مگر اس کے مضمحل چہرے نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

''فہد کہاں ہے۔ بہت خاموشی ہے گھر میں۔'' اس نے پوچھا۔

''فہد تو اپنے نانا، نانی سے ملنے گیا ہے۔ اسی لیے ہم ماں بیٹا یوں منہ سیے بیٹھے ہیں۔ اچھا ہوا تم چلی آئیں۔ میرا دل بہل جائے گا۔''

''اور میرا......'' اس کے لبوں نے نامحسوس سی حرکت کی۔ ''میں تو فہد سے ملنے آئی تھی۔''

''وہ تو خود تمہیں یاد کرتا رہتا ہے گھر ہوتا تو بہت خوش ہوتا، ارے تم اب تک کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو......'' امی نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

''نہیں آنٹی، میں چلتی ہوں۔ بس میں تو فہد...... فہد سے اچھا خدا حافظ......'' وہ ٹوٹے الفاظ ادا کر کے پلٹی۔ امی بھی ہکا بکا تھیں اور میں بھی۔ وہ تو حیرت کی شدت سے اسے روک تک نہ سکیں۔ میں ہی پکار بیٹھا۔

''رکو، زینیا! میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' میں نے چابیاں اٹھائیں۔

''زینیا بیٹا! کچھ دیر رک جاتیں......''

''میں پھر آؤں گی آنٹی، ابھی نہیں، ابھی میں......'' وہ لب کاٹنے لگی۔

سارے راستے وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے ڈرائیونگ کے دوران کئی بار کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ ہلکے سبز رنگ کا سوٹ شکنوں سے پر تھا۔ دوپٹے کا ایک پلو نیچے تک جا رہا تھا۔ سوکھے لب گیلی پلکیں...... ایسی تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''لو تمہارا گھر آ گیا۔'' میں نے بریک لگائی اس نے میکانکی انداز میں لاک کھول کے قدم باہر نکالا میں اتر کے بیل دینے لگا۔ ایک سانولی سی لڑکی نے دروازہ کھولا جو شاید ملازمہ تھی۔

''تسی کتھے چلے گئے سی باجی، خالہ ہوراں بڑے پریشان سی۔'' (آپ کدھر چلی گئی تھیں باجی خالہ جی بہت پریشان تھیں) اس نے ہاتھ سے ملازمہ کو پیچھے ہٹایا اور اندر بڑھی۔ وہ لڑکی مجھے دیکھ کے منہ کھولے کھڑی رہی۔

''زینیا کہاں تھیں تم؟......'' ایک عمر رسیدہ پریشان صورت خاتون آگے بڑھیں اور مجھے دیکھ کر رک گئیں مجھے اپنے اب تک دروازے پر ڈھٹائی سے جمے رہنے پہ سخت خفت محسوس ہوئی۔ میں سلام کر کے کھسکنے کو تھا کہ انہوں نے پوچھا۔

''آپ عاشر بیٹا ہو؟'' پتا نہیں وہ مجھے کیسے جانتی تھیں۔ خیر میرے اثبات میں سر ہلانے پہ انہوں نے مجھے اندر آنے کا کہا۔ بظاہر ان کے پرزور اصرار پہ میں اندر داخل ہو گیا۔

''بیٹا! تم بیٹھو۔ معاف کرنا۔ میں نماز پڑھ رہی تھی۔ دو نفل رہتے ہیں۔''

انہوں نے چہرے کے گرد لپیٹی چادر اور درست کی۔ ان کے اشارے پہ میں پہلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ سفید اور پیلے رنگ کی آرائش سے آراستہ اس کمرے کی فضا بے حد افسردہ تھی۔

گلدان میں پیلے رنگ کے گلاب سوکھ رہے تھے اور بیڈ کراؤن پہ بڑا سا سن فلاور نقش تھا۔ سفید پردوں پہ بھی پیلے گلابوں کے نقش تھے۔ اچانک باتھ روم کا دروازہ کھلا اور گیلے چہرے کو تھپتھپاتی زینیا باہر نکلی اب وہ قدرے بہتر لگ رہی تھی۔

''ہاں اب بتاؤ کیوں فرار ہوئیں وہاں سے......؟'' میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس سے پہلے وہ مجھے کھنگالتی آئی تھی۔ اب میری باری تھی۔

''میں تمہارے گھر سے فرار ہو کے نہیں آئی۔ بلکہ فرار ہو کے وہاں گئی تھی۔ مگر پناہ نہ ملی۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی میں فہد سے ملنے گئی تھی۔ وہ نہیں تھا اس لیے واپس آ گئی۔'' اس کے کپکپاتے لہجے سے صاف لگ رہا تھا وہ زبردستی کی یہ بشاشت پیدا کرنے کے لیے کتنا زور لگا رہی ہے۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں تھا، امی بھی تھیں۔ انہوں نے تمہیں اتنے پیار سے رُکنے کے لیے کہا اور تم باہر نکلتی چلی گئیں۔

''میں ان سے سوری کہہ دوں گی۔'' وہ مسکرائی۔ میرے ہاتھ سے کسی کا کپکپاتا نم ہاتھ مس ہوا۔

''لیکن پھر بھی کوئی تو وجہ ہوگی جو تم بغیر گاڑی کے اتنی پریشان سی حالت میں......''

''تمہیں میرا گھر کیسا لگا...... ارے پھوپھو نے تم سے چائے، کافی کا پوچھا۔ لنچ تو کیا ہے ناں تم نے......؟'' اس نے میری بات ٹالنے کے لیے اکٹھے تین چار سوالات الٹ دیئے۔

''میں تمہاری پھوپھو کا نہیں تمہارا مہمان ہوں، لنچ میں کر کے آیا ہوں۔ کافی کا موڈ نہیں۔ چائے اگر اچھی بناتی ہو تو ضرور پیوں گا۔ اور تمہارا گھر مجھے بالکل بھی پسند نہیں لگا۔ ہر شے سے اداسی اور یاسیت ٹپک رہی ہے۔ سفید رنگ پاکیزگی، امن اور سکون کی علامت ہے لیکن تم نے اس میں جا بجا زرد رنگ کی آمیزش کر کے اسے وحشت زدہ بنا رکھا ہے۔ میرا بالکل خیال نہیں تھا کہ تم اندر سے اتنی بدذوق قسم کی خاتون ہوگی۔ آفس میں تو......''

''میں چائے بالکل اچھی نہیں بناتی۔ پھوپھو سے کہتی ہوں۔'' میری بات کاٹتی وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا آج اس کی شخصیت سے سارے پردے نوچ کے رہوں گا، آر یا پار...... کچھ تو فیصلہ ہو۔

اندر ہی اندر میرا دل ایک بار سکڑ سا گیا۔

''اور اگر تمہارا ایک بھی امکان حقیقت نکل آیا تو......''

''تو کیا؟ ''بہتر'' سے بہترین کی تلاش۔''

''اور یہ عام سی لڑکی...... جو کبھی خاص ترلگتی ہے۔''

''اسے اپنا آپ خاص ثابت کرنا پڑے گا۔

''تم نے بتایا نہیں، اتنا ڈپریس قسم کا ماحول کیوں طاری کر رکھا ہے تم نے اپنے گھر پہ۔'' اس کے دوبارہ کمرے میں آنے پر میں نے پوچھا۔

''تمہیں یونہی لگ رہا ہے ظاہر ہے اپنے بنگلے کے آگے تمہیں یہ غریبانہ سا مکان ڈپریشن کا شکار بھی لگے گا اور میری مسکین سی متاع، بدذوقی کا شاہکار۔'' اس نے کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

''غریبانہ...... مسکین......'' میں طنزیہ انداز میں چبا چبا کے بولا۔

''جو لڑکی اتنے نامی گرامی بھائیوں کی اکلوتی بہن ہو، ایسی زندگی اس کی اپنی پسند ہو تو ہو، اللہ نے تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔''

''اب تم خدائی کاموں میں تو دخل اندازی مت کرو۔ میرے ذوق اور معیار میں جتنے کیڑے نکالنے ہیں نکال لو۔''

''تمہارے ذوق اور معیار کا تو میں شروع سے قائل ہوں۔ اسی لیے گھر پہ تمہارا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کے دھچکا سا لگا ہے۔

خود کو جان بوجھ کر قنوطیت پسند بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ جا بجا زرد رنگ، یہ سرہانے رکھے سوکھے پیلے گلاب، یہ غروب آفتاب کے منظر کی پینٹنگ۔'' میں کھڑا ہو کے جائزہ لینے لگا اور ایک ایک چیز کی نشاندہی کرنے لگا۔

''یہ فیض، ناصر کاظمی اور جون ایلیا کے شعری مجموعے، یہ بلھے شاہ کی کافیاں، یہ غلام علی کی غزلیں اور یہ...... یہ کون ہے۔''

ڈریسنگ ٹیبل پہ سلور فریم میں سجی ہنستے مسکراتے بچے کی تصویر دیکھ کے میں نے پوچھا۔

''یہ فہد ہے میرا فہد۔'' وہ یوں ہار مان کے بولی جیسے اب بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

''یہ فہد ہے، میرا فہد۔''

میں بے یقین سا ہو کے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے بارے میں سوچ کے رکھے وہ تمام امکان میرا منہ چڑانے لگے۔ کسی حقیقت پسندی سے وہ سب سوچتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ سنایا تھا کہ اگر ان میں سے میرا ایک وہم بھی حقیقت نکلا تو میں زینیا کو اپنے ذہن سے جھٹکنے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں لگاؤں گا اور اب بغیر پلکے جھپکے میں اس کے جھکے سر اور لرزتی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے اپنی جڑیں ہی میرے اندر پھیلا رکھی ہوں گی تو بھلا مجھے کتنی دیر اور لگے گی اور اپنے وجود سے اسے کاٹ پھینکنے کی...... اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور تصویر کو دیکھنے لگی وہ شفاف پوتر آنسو...... اور ان سے وضو کرتی بچی بچی آنکھیں...... جڑیں اور تیزی سے پھیلنے لگیں۔ میرے دل میں، دماغ میں، سوچوں میں ہر طرف ایک جنگل پل ہی پل میں کھڑا ہو گیا۔ میں اس جنگل کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔ جڑیں جلا دینا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بچے کی ماں، طلاق یافتہ یا پھر شاید بیوہ عورت کو میں......

''میں...... اس کی......'' کتنی دیر بعد اس کی آواز آئی۔ میں چونک اٹھا۔

''وہ میرا فہد تھا، عاشر...... میرا اپنا...... میرا سب کچھ۔'' وہ بتانے لگی اور میں پورے دھیان سے سننے لگا۔

''میں نے ابھی بچپن سے دامن چھڑایا تھا کہ میری ماما مجھے چھوڑ کے چلی گئیں۔ اس عمر میں میں نے زندگی میں پہلی بار خود کو تنہا محسوس کیا۔ حالانکہ گھر میں صرف ماما نہ تھی، پاپا تھے، بڑے بھیا زید فاروق اور چھوٹے بھیا زین فاروق تھے۔ میری بیوہ پھوپھو بھی ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہتی چلی آئی تھیں۔ وہ بے اولاد تھیں اور مجھے ہمیشہ سے انہوں نے اپنی بیٹی جانا کیونکہ جب وہ شوہر کی وفات کے بعد اس گھر میں آئیں تو میں صرف دو ماہ کی تھی۔

میرا بچپن ویسا ہی گزرا جیسا کہ کسی بھی آسودہ حال مکمل فیملی میں رہنے والے بچے کا گزرتا ہے۔ سلجھا ہوا ماحول، دولت کی فراوانی، محبت کرنے والے ماں باپ، دو قابل فخر بھائی، عمدہ اسکولنگ...... زندگی ایک سیدھے ٹریک پہ رواں دواں تھی کہ ماما کی اچانک ڈیتھ نے ہلا کے رکھ دیا میں تب فرسٹ ایئر میں تھی۔

بھائیوں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ زید بھیا نے سی ایس ایس نمایاں کامیابی کے ساتھ کلیئر کر لیا تھا۔ ماما ان کی منگنی اپنی بھانجی سے اپنی

زندگی میں کر گئی تھیں۔ زین بھیا کی تعلیم بھی آخری مراحل میں تھی۔

ماما کو گزرے سال بھی نہ ہوا تھا کہ آنٹی نے زویا کی رخصتی کا ایشو کھڑا کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاپا ان سے، بھیا سے، مجھ سے، پھوپھو سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید وہ ماما کے فوراً بعد گھر میں شادی نہیں رکھوانا چاہتے۔ خیر پورے خاندان کے مشورے سے ماما کی پہلی برسی کے دو ماہ بعد شادی مقرر ہوئی۔ پاپا حیرت انگیز طور پر پرسکون نظر آنے لگے۔ اکثر ان کی پھوپھو سے لمبی لمبی میٹنگز چلا کرتیں۔ وہ عموماً انہیں آہستہ آہستہ آواز میں کچھ سمجھایا کرتیں وہ کبھی تو بے زاری سے اثبات میں سر ہلاتے رہتے۔ کبھی شدت سے نفی میں سر ہلانے لگتے۔ مجھے اس سے زیادہ غور کرنے کا وقت نہ ملا۔ گھر کی پہلی پہلی شادی تھی۔

بھابھی کو گھر آئے دو ماہ ہوئے تھے۔ اس دن زید بھیا ایک عجیب سی خبر کے لے آئے۔

''زینی! میں مکمل تصدیق کے بعد ہی یہ راز تمہاری سامنے کھول رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ بابا نے ٹھیک گیارہ ماہ پہلے یعنی ماما کی ڈیتھ کے صرف چھ ماہ بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ دوسری بیوی انہوں نے مری والے کاٹیج میں رکھی ہوئی ہے اور ان کا ہر ویک اینڈ وہیں گزر رہا ہے۔''

''اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ ماما کے بعد ان کا دل گھر میں نہیں لگتا دوستوں میں وقت گزارتے ہیں۔''

''یہ تو پتا نہیں تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ نہیں، ایک عورت کے پاس دل بہلاتے ہیں۔'' زین بھیا بھی تلملا رہے تھے۔

زویا بھابی کیوں پیچھے رہتیں۔

''اور جب میری ماما نے شادی کا مسئلہ اٹھایا تو سب کہنے لگے، ابھی تو آنٹی کو گئے سال ہوا ہے۔ برسی کے فوراً بعد شادی رکھ لی...... جب کہ انکل نے تو برسی تک کا انتظار نہ کیا۔''

میں اگرچہ صدمے کی کیفیت میں تھی لیکن زویا بھابی کے منہ سے پاپا کے بارے میں ایسے تحقیر آمیز کلمے اچھے نہ لگے۔ پھوپھو بول پڑیں۔

''بس کرو زویا! تمہیں اپنے سسر کے معاملے میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔''

''پھوپھو، وہ بھی اسی گھر کی فرد ہے، وہ بھی اسی صدمے سے گزر رہی ہے۔'' زید بھیا سے بیوی کی بیچاری سی شکل دیکھی نہ گئی۔

''اور کیا، کیا مجھے غم نہیں کہ انکل نے آنٹی کی قبر کی مٹی بھی خشک نہ ہونے دی۔ اتنے سالوں کے ساتھ کو اتنی جلدی بھلا دیا۔''

''دیکھو زویا! عمر نے کوئی غیر شرعی فعل نہیں کیا، نہ ہی کسی کا حق غضب کیا ہے۔ ہاں جوان بچوں کو لاعلم رکھنے کی غلطی ضرور ہوئی ہے اس سے اور میں تو اس سے کہتی ہی رہی کہ یہ باتیں بھلا چھپانے سے چھپتی ہیں، خود ہی بیٹوں کو اعتماد میں لے لو۔''

''پھوپھو! آپ جانتی تھیں۔'' دونوں بھائی ان سے بھی شاکی ہو گئے بھابھی کو اور موقع مل گیا۔

''واقعی عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ پھوپھو آپ کو اپنی اس بھابھی کا ذرا خیال نہ آیا۔ انکل نے تو خیر بیوی کی وفائیں بھلا ہی دیں تھیں۔''

''زویا زیادہ بڑھ چڑھ کے مت بولو۔ ورنہ میں نے کچھ کہہ دیا تو منہ چھپاتی پھرو گی۔ میری بھابھی کو خدا جنت نصیب کرے وہ واقعی ایک بہترین عورت تھی۔

وہ اب اس دنیا میں نہیں اور عمر کو اللہ نے اور مذہب نے حق دیا۔ جس کا اس نے استعمال کرنے کے بعد مجھے صرف مطلع کیا، اس میں کس عورت پہ ظلم ہوا اور رہیں وفائیں بھلانے کی بات...... تو وہ تب ہوتا اگر عمر پہلی بیوی کے ہوتے دوسری شادی کرتا جیسا کہ تمہارے بھائی نے کی۔''

''دیکھیں...... دیکھیں زید! آپ دیکھیں ذرا پھوپھو کو۔'' وہ ٹپٹا گئیں۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بڑھ چڑھ کے مت بولو ورنہ اب تم عورت پہ عورت کے ظلم کی بات کرتی ہو، تمہاری بڑی بہن سارہ بھی تو کمال محمد کی پہلی بیوی کو طلاق دلوانے کے بعد بیاہی گئی ہے۔''

پھوپھو ایسی ہی تھیں، کھری کھری سنانے والی۔

یہ مسئلہ تو پھوپھو کی مداخلت کے باعث دب گیا، اب مرحلہ پاپا سے بات کرنے کا، پھوپھو نے اس موقع پہ بھی مکمل تعاون کیا۔

پاپا آئے، شرمندہ شرمندہ سے، جھینپے جھینپے سے، کچھ گلے شکوے ہوئے کچھ صفائیاں پیش ہوئیں۔ زندگی پھر نئے سرے سے شروع ہوگئی۔ پاپا پہلے کی طرح ہفتے میں دو تین دن مری گزارنے لگے۔ تب ہم اسلام آباد میں رہا کرتے تھے۔

پاپا کی شرمندگی بھی رفتہ رفتہ زائل ہوگئی۔ لیکن ان میں اور اولاد میں ایک پردہ سا حائل ہو چکا تھا۔ اسی طرح دو ڈھائی سال اور گزر گئے۔ میں نے اپنے بی کام کے ایگزامز دے رکھے تھے۔ اور گھر پہ وقت گزار رہی تھی۔ زید بھیا یہیں تھے لیکن زین بھیا کی پوسٹنگ آئر لینڈ ہو چکی تھی۔ زویا بھابھی کے دو بچے تھے تب ہی پھوپھو کے ذریعے اطلاع ملی کہ پاپا کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا ہے۔ مجھے بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ بھیا بھی طنزیہ فقرے سنا کے رہ گئے۔ زویا بھابھی اب پھوپھو کے رعب میں نہ آتی تھیں۔ جو دل چاہتا کر جاتیں کہہ جاتیں۔ پھوپھو کا سارا دم خم اور دبدبہ بھی ہوا ہو چکا تھا۔

جب بھائی نے اپنا احترام اولاد کے آگے کھویا تو وہ اولاد انہیں کیا احترام دیتی۔

پاپا نے فیصلہ سنا دیا کہ اب وہ روبینہ (ان کی دوسری بیوی) اور بچے کو مری میں نہیں رکھیں گے۔ وہ اسی گھر میں رہیں گے۔ اس فیصلے نے تین سال سے طاری جمود اور سمجھوتے کی فضا کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ دونوں بھائی بھڑک گئے۔ زین بھیا فون پہ مسلسل رابطے پہ تھے۔ دونوں نے اپنا جوابی فیصلہ سنا دیا کہ یا تو اس گھر میں وہ عورت رہے گی یا پھر ان کے بیٹے۔

یہ فیصلہ فون پر پاپا کو سنا دیا گیا۔ انہوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا صرف یہ کہا کہ ہم پرسوں آ رہے ہیں۔ زویا بھابھی نے اپنا سارا میکہ اکٹھا کر لیا گھر میں اس دن ہمارا سارا خاندان پاپا کو لعن طعن کرنے کے لیے جمع تھا۔ زید بھیا بپھرے بیٹھے تھے اور پھر وہی ہوا جو پاپا نے کہا تھا اور وہ بھی جو بھیا نے کہا تھا۔

پاپا نے کہا تھا اب وہ روبینہ کے ساتھ رہیں گے۔ وہ دونوں اب ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے اپنے ابدی سفر پہ روانہ ہو چکے تھے۔ ایک کار ایکسیڈنٹ نے دونوں کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا تھا۔

بھیا نے کہا تھا انہیں اس گھر میں جگہ نہیں ملے گی نہ ان کا ٹھکانہ کہیں اور ہوگا اس گھر میں یا تو وہ رہیں گے یا پاپا...... اور پاپا کو واقعی اس گھر میں اب جگہ نہیں مل پائی ان کا ٹھکانا تو اب قبرستان تھا۔

اس عورت کی آخری رسومات کا انتظام دونوں بھائیوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسی گھر میں کیا، وہ پاپا کے ساتھ ہی رخصت ہوئی۔

اس کا باپ، بہن اور دیگر رشتہ دار ہمارے گھر جمع تھے جو شکل سے اور عادات سے بھی اپنا ہلکا پن ظاہر کر رہے تھے۔ یقیناً پاپا ان فریبی لوگوں کے ہاتھ بری طرح ٹریپ ہوئے تھے۔ جب سوئم کے بعد بھیا نے ان لوگوں کو یہاں سے جانے کے لیے کہا تو کچھ عجیب سے حساب کتاب کھلنے لگے۔ بھیا نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اس قسم کی امید مت رکھیں۔ پاپا کی وصیت میں صرف ان تین بہن بھائیوں کا ذکر ہے۔ کسی کو پھوٹی کوڑی تک نہ ملے گی۔ شاید پاپا کو خود بھی زندگی سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ دوسری شادی کے بعد انہوں نے وصیت میں ترمیم کی فی الحال ضرورت نہ سمجھی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تو بھیا کو عدالتی کارروائی کی دھمکی دے سکتے تھے آخر وہ وصیت تب کی تھی جب انہوں نے ان کی بیٹی سے شادی نہیں کی تھی۔

میرے بھائیوں کے مرتبے اور حیثیت سے مرعوب ہو کے وہ دب گئے لیکن جاتے جاتے ایک ننھا سا چند دن کا بچہ آگے رکھ گئے۔ بلکہ رکھ کیا گئے، پھینک گئے یہ کہتے ہوئے۔

''ہم نے بھی پرائی اولادیں سمیٹنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ اس کا باپ تمہارا بھی باپ تھا، اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے جو تمہاری رگوں میں ہے۔ اس لیے تم ہی اسے سنبھالو۔''

بھیا خوب گرجے، لیکن وہ کان لپیٹے اس بوجھ کو اتار کر چلتے بنے۔ زویا بھابھی، زین بھیا، زید بھیا سب کا تلملاہٹ کے مارے برا حال تھا۔ خود میں کوفت اور بیزاری کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کارپٹ پہ پڑے ننھے سے کیڑے کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے ٹانگیں چلا چلا کے خود سے لپٹا کمبل نیچے گرا لیا تھا اب اس کی سوکھی سوکھی زرد ٹانگیں ہوا میں چل رہی تھیں۔ اس کے کپڑے حد سے زیادہ میلے اور بدبودار تھے۔ شاید پچھلے دو تین دن سے انہیں بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ اس کا پچکا ہوا پیٹ ہر سانس کے ساتھ پسلیوں سے الگ ہو کے بالکل کمر سے جا لگتا اس کے نیلے پڑتے ہونٹ اور حلق سے رونے کی کوشش میں عجیب سی خرخراہٹ نکل رہی تھی۔

ننھی مٹھیاں اس زور سے بھینچی ہوئی تھیں کہ انگلیاں برف سی سفید ہو رہی تھی۔ بھائیوں کے غیض وغضب کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف پھوپھو کی نظر اچانک اس پر پڑی تو تڑپ کے آگے بڑھیں۔ ایک شکایت آمیز سی نظر مجھ پہ ڈالی جو قریب ہی بیٹھی اسے سانسیں لینے کی جدوجہد میں مصروف دیکھ رہی تھی۔

''غضب خدا کا، اتنے سے بچے کو ٹھنڈی زمین پہ ڈال گئے۔ خون سفید ہو گیا ہے۔ خوف خدا تک نہیں رہا۔ بچے تو معصوم فرشتے ہوئے ہیں ان سے کیا نفرت......''

مجھے ایسے لگا جیسے پھوپھو در پردہ مجھے سنا رہی ہوں۔ میں پیر پٹختی اندر چلی گئی بعد میں کسی رشتہ دار خاتون کے تعاون سے پھوپھو اسے ہاسپٹل لے کر گئیں۔ اس بچے پہ یرقان اور نمونیے نے اکٹھا حملہ کیا تھا۔ پھوپھو نے ایک بار پھر بھائیوں کے آگے دوہائی دی۔

''کیوں باپ کی روح کو دکھی کرتے ہو۔ اللہ کا ڈر خوف بھی نہیں ہے لیکن اس دنیا کا تو خوف کر لو جس میں رہ رہے ہو۔ کل تک تمہارے ساتھ

بڑھ چڑھ کے عمر کی دوسری شادی کے خلاف بولنے والے لوگ اب تمہاری بے حسی اور تنگ دلی پہ تبصرے کر رہے ہیں کیوں خود کو تماشا بنا رہے ہو۔''

اور پھر شاید خوف خدا سے لرز کے، یا پھر پاپا کی روح کی تسکین کے لیے یا شاید بچ دنیا کے اعتراضات سے ڈر کے۔انہوں نے اس کے علاج معالجہ میں خاطر خواہ دلچسپی لے ہی لی۔

اس بچے کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق نمونیے نے اس کے پھیپھڑوں پر اثر ڈالا تھا۔ساتھ ہی وارد ہونے والے یرقان نے جگر اور گردے تباہ کر دیے تھے۔

بھیا نے سوچا، مر تو وہ رہا ہے یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر لاوارث مرا تو بڑی بدنامی ہوگی۔

مگر وہ بچ گیا۔ادھورا، ادھ مرا سا۔ایک گردہ ناکارہ ہونے کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا کمزوری نے اسے تنکے برابر کر چھوڑا تھا اس میں دوسرے بچوں کی طرح چلا کر رونے کی ہمت تک نہ رہی تھی۔ ڈاکٹرز نے ویسے بھی سختی سے کہا تھا کہ اسے رونے سے ہر ممکن بچانا ہے۔وہ مریل سا بچہ پھوپھو سینے سے لگائے گھر لوٹیں تو سب ٹپٹا کے رہ گئے۔پھوپھو نے صاف کہہ دیا۔

''یہ بچہ اللہ نے میرے لیے بچایا ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو تمہاری ماں سمجھ کے اپنی ممتا کی تسکین کی تھی، تم لوگوں نے مجھے ماں سمجھنے سے انکار کر دیا تو میرے رب نے مجھے پھر سے ماں بنا دیا۔''

کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ ماما اور پاپا دونوں نے ساری عمر پھوپھو کا اتنا احترام کیا تھا کہ ہم لوگ ان سے گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔یوں بھی پاپا نے وصیت میں اپنی بڑی بہنوں کے لیے کافی کچھ چھوڑا تھا۔اگر بھیا انہیں یہاں سے نکل جانے پہ مجبور کر بھی دیتے تو الٹا ان ہی کی جگ ہنسائی ہوتی، پھوپھو کا کیا نقصان ہوتا۔زویا بھابھی البتہ ضرور بڑبڑائیں۔

''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور یہ تو پیدائشی یرقان کا مارا ہوا ہے۔سارے گھر میں اب ہیپاٹائٹس کے جراثیم پھیلیں گے۔''

پھوپھو چپ چاپ انیکسی میں شفٹ ہو گئیں۔ ماما اور پاپا کے بعد وہی میرا جذباتی سہارا اور وابستگی تھیں، بھیا تو اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ بھابی نے کبھی قریب آنے ہی نہیں دیا ایسے میں پھوپھو بھی جب فہد میں گم ہو کے رہ گئیں تو میں اور اکیلی ہو گئی۔ میں پھوپھو سے شاکی بھی تھی اور فہد سے نالاں بھی۔ہاں فہد، وہ فہد تھا۔پھوپھو نے اس کا نام فہد رکھا تھا۔فہد عمر عجیب اتفاق تھا۔پاپا نے اپنے نام عمر فاروق مرتضیٰ کے نام کا ایک حصہ فاروق دونوں بیٹوں کے نام کے آگے لگایا تھا اور دوسرا حصہ عمر اپنی بیٹی کے نام کے آگے لگایا تھا اور اب پھوپھو نے بھی اس کے نام کے آگے عمر لگا دیا۔پتا نہیں کیوں؟

میں رزلٹ آنے کے بعد اپنی اسٹڈیز میں بزی ہو گئی۔پھوپھو سے انسیت اب بھی ویسی کی ویسی تھی اگرچہ وہ گھر کے اندرونی حصے سے ذرا دور، انیکسی میں رہتی تھیں لیکن گھر کے مکینوں سے زیادہ میرا خیال رکھتیں۔

لیکن میں نے کبھی ان سے یہ نہ پوچھا کہ انہیں ایک بیمار، چھوٹے سے بچے کو سنبھالنے میں کوئی مشکل تو نہیں پیش آ رہی۔فہد کا ذکر ہمارے درمیان آتا مگر یکطرفہ وہ ہی بتاتیں۔کل اس نے ساری رات جگایا۔صبح وہ مسکرایا۔آج اس کی طبیعت بہتر تھی۔ میں چپ چاپ سنتی رہتی۔

رفتہ رفتہ میں اس کے ذکر میں دلچسپی لینے لگی لیکن میں نے کبھی وہ دلچسپی ظاہر نہ کی۔ رات کو انیکسی سے آتی گھٹی گھٹی سی سسکیاں مجھے اٹھ کے کھڑکی تک آنے پہ مجبور کرتیں اور میں اپنی کھڑکی سے انیکسی کی کھڑکی کے اس طرف پھوپھو کو گود میں بچہ اٹھائے تھپکیاں دیتے یہاں سے وہاں ٹہلتے دیکھتی۔ اس عمر میں پھوپھو کے یہ رت جگے یہ مشقتیں مجھے بے چین کر دیتے۔

انہوں نے ایک بار بڑے ہلکے سے شکوہ کیا تھا۔

''زینیا! تم سے، زین اور زید سے میرا رشتہ عمر کی وجہ سے ہے۔ میں تمہاری پھوپھو ہوں۔ یعنی باپ کی بہن، اور جانتی ہو فہد کی میں کیا لگتی ہوں، پھوپھو یعنی اس کے بھی باپ کی بہن ہوں۔ اگر میں نے اپنا بہن ہونے کا فرض ادا نہ کیا تو میں عمر کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ مجھے میرے فرض کی ادائیگی پہ مت ٹوکو۔ آخر عمر کے پاس جانے میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔''

پھوپھو فہد کو کبھی اپنے ساتھ نہ لاتیں عموماً اسے سلانے کے بعد مجھ سے ملنے آتیں۔ دو دن تک جب وہ نہ آئیں تو میں بے چین ہو گئی۔ مجھے یہی گمان گزرا کہ ضرور اس بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی اس لیے وہ آنہ سکیں۔ کیونکہ کچھ دن پہلے انہوں نے اس کی بیماری کا ذکر کیا تھا اسے کوئی دودھ بھی تو سوٹ نہیں کرتا تھا۔ ایک دو دن میں نے ضبط کیا پھر تیسرے دن اس خیال کے تحت چلی آئی کہ بعد میں پھوپھو یہ نہ کہیں کہ میں ان کا پتا کرنے بھی نہ آئی۔

یہ تو مجھے خیال تک نہ آیا تھا کہ پھوپھو خود بھی بیمار ہو سکتی ہیں۔ ان کی دگرگوں حالت دیکھ کے میں دنگ رہ گئی۔ فہد، ہماری ملازمہ پروین کی گود میں سو رہا تھا اور پھوپھو، نڈھال وجود، متورم سرخ آنکھوں کے ساتھ چادر اوڑھے کہیں جانے کی تیاری میں تھیں۔

''بخار ہو رہا ہے پچھلے چار دن سے۔ ساتھ میں بلڈ پریشر بھی ہائی رہا ہے۔ فہد کی بیماری نے مجھے تھکا ڈالا۔ شکر ہے اب وہ کچھ بہتر ہے لیکن میرا حال برا ہو گیا تم نے بھی......'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں میں نے فوراً صفائی پیش کی۔

''پھوپھو! میرے ٹیسٹ ہو رہے تھے، لیکن مجھے یہ گمان بھی تو نہ تھا کہ آپ بیمار ہوں گی۔ ورنہ ٹیسٹ ہوتے ہی تو میں آجاتی۔ آپ ڈاکٹر کی طرف جا رہی ہیں، آیئے میں لے چلوں۔''

ڈاکٹر کے پاس تو پچھلے ایک ہفتے سے چکر لگا رہی ہوں مگر فہد کے لیے.....اپنی خاطر دھکے کھانے کی ہمت نہیں، پہلے زید پوچھ لیتا تھا۔ اس کی آنکھ میں لحاظ تھا، اب تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے، اس کے سامنے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہوں، قریب سے گاڑی لے کر گزر جاتا ہے۔''

ان کے درد بھرے لہجے پہ میں شرمندہ ہو گئی۔

''فی الحال تو میں بینک جا رہی تھی۔ کچھ پیسے نکلوانے ہیں۔ فہد کو عام ڈبے کا دودھ موافق نہیں۔ ڈاکٹر نے کوئی اور دودھ لکھ کے دیا ہے۔ اچھا خاصا مہنگا ڈبہ ہے۔ میں اکٹھے لے کے رکھ لیتی ہوں لیکن اس نے پچھلے دو ہفتے بہت دودھ لیا اس کا معدہ اتنا کمزور ہے کہ اب تک ٹھوس غذا ہضم نہیں کرتا۔ حالانکہ چھ مہینے کا ہو چکا ہے۔ کل پروین سے میں نے سو روپے ادھار لے کر ڈبہ منگوایا۔ میرا بلڈ پریشر اتنا ہائی تھا کہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا دشوار تھا۔ چکر آیا اور ڈبہ نیچے گر گیا۔ تقریباً آدھے سے زیادہ دودھ ضائع ہو گیا۔ اب سوچا، ہمت کر کے باہر نکلوں، بچے کو بھوکا تو نہیں مارنا۔''

میں لرز کے رہ گئی۔ پھوپھو تکلیف میں ہیں اس کا اندازہ مجھے تھا، لیکن پھوپھو سے ہمدردی کر کے میں زید بھیا کی ڈانٹ نہیں کھانا چاہتی تھی۔ لیکن اس وقت میں خود کو نرم پڑنے سے روک نہ پائی۔

میں پھوپھو کو پہلے ڈاکٹر کے پاس اور پھر بینک لے کر گئی۔ ڈاکٹر کے مطابق پھوپھو جسمانی کمزوری کے ساتھ ساتھ ذہنی تھکان، نیند کی کمی اور ڈپریشن کا شکار تھیں۔

راستے میں اسٹور پہ رک کے صرف پھوپھو کی تسلی اور خوشی کے لیے فہد کی بے شمار چیزیں خریدیں۔ ڈائپرز کے پیک، دودھ کے ڈبے، سیریلیک کے فلیوزر بے بی لوشن، فیڈر، کھلونے وغیرہ۔

میں نے انہیں آرام زیادہ سے زیادہ کرنے کی تلقین کی جواباً وہ فہد کو دیکھنے لگیں، میں نظریں چرا گئی۔ پروین چلی گئی تو پھوپھو کو اپنے سامنے کھانا کھلا کے، دوا پلا کے، سلانے کے بعد میں آہستہ سے وہاں سے نکلی۔ ابھی دروازہ بند ہی کیا تھا کہ فہد کے رونے کی آواز آئی شاید بھوک سے بے تاب ہو کے وہ جاگ گیا تھا، میں نظر انداز کرنا چاہتی تھی مگر ایک پل سے زیادہ نہ کر سکی۔ اگر میں اندر جا کے اسے نہ بہلاتی تو پھوپھو جاگ کے اسے سنبھالنے لگتی۔ مجبوراً مجھے اندر جانا پڑا۔ اُٹھنے کی کوشش کرتی، پھوپھو مجھے دیکھ کے مطمئن ہو کر پھر لیٹ گئی۔ شاید انہیں یقین تھا میں فہد کو سنبھال لوں گی اور میں نے ان کا یقین نہ توڑا، میں نے فہد کو..... فہد عمر کو اپنے بھائی کو۔ اپنے پاپا کی آخری نشانی کو..... اس کی آواز کانپی۔

''فہد کو پہلی بار چھوا۔ میرے جسم میں گرم سی لہر دوڑ گئی، جیسے ڈھیروں خون شریانوں میں اُمنڈ آیا ہو۔ اسے خاموش کرانے کے لیے بے ساختہ سینے سے لگا کر تھپکا تو جیسے دھڑکنوں میں تلاطم آ گیا۔ میری آنکھیں امنڈ آئیں۔ اس کی نیپی بدلتے ہوئے فیڈر تیار کرتے ہوئے گھٹنے پر لٹا کے دودھ پلاتے ہوئے۔ ہل ہل کر اسے سلانے کی کوشش کرتے ہوئے میں روتی رہی۔ مسلسل روتی رہی۔ وہ سو گیا۔ میری گود میں بے فکر، منہ میں انگوٹھا دبائے سو گیا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے اور میرا وجود یک بیک ممتا سے بھیگ چکا تھا۔

میں نے اس کے ماتھے پہ اپنا پہلا بوسہ دیا اور میرے لبوں سے اس کی پیشانی تک ایک اٹوٹ رشتہ بندھ گیا۔ اب وہ میرا فہد تھا۔''

وہ چپ ہو گئی۔ آنکھیں ساکت تھیں لیکن لب مسکرا رہے تھے جیسے ابھی ابھی کسی نرم سی پیشانی کے گدگداتے لمس نے انہیں کھلنے پہ مجبور کر دیا ہو۔ کچھ دیر اسے اسی طرح گم صم دیکھتے رہنے کے بعد میں ضبط نہ کر سکا۔

''پھر..... پھر کیا ہوا۔ تمہارے بھائی سے تو یہ برداشت نہ ہوا ہوگا۔''

''برداشت.....'' وہ پھر سے ماضی میں چلی گئی۔

''برداشت تو کیا، وہ تسلیم کرنے پہ بھی تیار نہیں تھے کہ میں حق پہ ہوں اور وہ غلطی پہ..... انہوں نے اب پھوپھو سے بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ دیے۔ ان کے مطابق پھوپھو نے مجھے ورغلایا اور وہ جائیداد کے لیے گھر میں محاذ قائم کرنے کی خاطر مجھے استعمال کر رہی تھی۔ بہت ہنگامے ہوئے لیکن میں ڈٹی رہی۔ اتنے بڑے اور رکیک الزام نے پھوپھو کو سخت دل گرفتہ کیا۔ انہوں نے مجھے پلٹنے کو کہا اور یہ بھی کہ وہ اکیلی اسے پال سکتی ہیں۔ لیکن میں نے پلٹنے سے انکار کر دیا۔ میرا خون سفید نہیں ہوا تھا۔ وہ تھا پاپا کا بیٹا..... زینیا عمر کا بھائی۔ فہد عمر.....

میں نے کوئی پروانہ کی اور پھوپھو اور فہد کے ساتھ مگن ہو گئی۔

وہ اب مجھے پہچاننے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کے ہوا میں ہاتھ بلند کر لیتا، جیسے اڑ کے مجھ تک آنا چاہتا ہو۔ اس نے پہلا قدم میری انگلی تھام کے اٹھایا تھا۔ اس کے لبوں سے پہلا لفظ ''آپی'' نکلا تھا وہ چار سال کا ہو چکا تھا البتہ اس کی صحت پہلے جیسی تھی۔ جب اس کی حالت بگڑتی، میں کانپ جاتی۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر آزما لیا۔ پیدائش کے ساتھ ہی حملہ آور ہونے والے یرقان اور نمونیا اور پھر ابتدائی طور پہ برتی گئی لاپروائی اور غفلت نے اس کی صحت تباہ کر رکھی تھی۔

وہ انتہائی سردیوں کے دن تھے، پھوپھو کی اور میری لاکھ احتیاط کے باوجود وہ پھر سے نمونیے کا شکار ہو گیا۔ ہاسپٹلائز کرنے کے بعد، اینٹی بائیوٹکس کے بے دریغ استعمال نے اس کے اکلوتے گردے پہ اثر ڈالا۔ نمونیے کے اثرات دور ہو گئے لیکن ڈاکٹر کے مطابق یہ گردہ اب اس کے وجود کا بوجھ اٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جسمانی طور پہ اتنا کمزور تھا اور صحت کی دیگر پیچیدگیاں کچھ اس طرح اس کی جان سے چمٹی ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر تبدیلی گردہ کا آپریشن کرنے سے ہچکچا رہے تھے اور یہی واحد حل تھا اسے بچانے کا۔ ڈاکٹر حمید کے مشورے کے مطابق میں نے شکاگو ہاسپٹل میں نیٹ کے ذریعے اس کی رپورٹس وغیرہ بھیجیں۔ جلد ہی اس کا حوصلہ افزا جواب آ گیا لیکن علاج اور ٹکٹ کے اخراجات میرے اور پھوپھو کے اختیار سے باہر تھے۔

پھوپھو کے نام وصیت میں نجانے کس لیے پاپا نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں یہ جائیداد بیچ نہیں سکتی تھیں۔ شاید انہوں نے بیوہ اور بے اولاد بہن کا اس میں کوئی بھلا سوچا ہو کہ کہیں کوئی انہیں بیچنے پہ مجبور کر کے خالی ہاتھ نہ کر دے۔ ان کے حصے میں آئی آبائی زمینوں کے علاوہ ایک مکان تھا اور بینک اکاؤنٹ میں چند لاکھ روپے جو اب تیزی سے ختم ہو رہے تھے بھیا نے ان کی طرف سے بالکل ہاتھ کھینچ رکھا تھا۔ وہ اتنا عرصہ اسی بینک اکاؤنٹ سے فہد کو پالتی آئی تھیں۔ مجبوراً ہم دونوں نے زید بھیا کے آگے فہد کی زندگی کے لیے ہاتھ پھیلایا اور انہوں نے مرے ہوئے باپ کی لاج نہ رکھی تھی۔

ماں جیسی پھوپھی کو زندگی سے خارج کر دیا تھا تو پھیلے ہوئے ہاتھوں کا مان کیا رکھتے۔ بات چند لاکھ کی نہیں تھی۔ بات ان کی ضد تھی۔ وہ ہر حال میں فہد کو منظر سے غائب دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے ان کی منت سماجت بھی کر کے دیکھ لی، خون کا حوالہ بھی دیا۔ خاندان کے چند سرکردہ بزرگوں کی سفارش بھی کرائی، خدا کا خوف بھی دلایا اور واسطہ بھی دیا۔ سب بے سود......

اب میری پاس آخری کارڈ تھا اور میں نے اس آخری حربے کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا، اب میں کوئی سترہ اٹھارہ سال کی ناسمجھ لڑکی نہ تھی جو بھائیوں کے نقش قدم پہ چلتی۔

آخر کار زین اور زید بھیا دونوں کی جانب سے صاف انکار سننے کے بعد میں نے وہ آخری قدم اٹھانے کا سوچ ہی لیا۔ پھوپھو نے مجھے بہت روکنا چاہا لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ میں اپنے بھائیوں کی سوسائٹی میں پوزیشن فراموش کر چکی تھی مجھے صرف فہد کو انصاف دلانا یاد تھا۔ پھوپھو نے ایک بار پھر سمجھانا چاہا۔

"کیوں خود کو تنہا کر رہی ہو۔ نہ ماں ہے، نہ باپ، یہ دو بھائی ہی تمہاری چھت ہیں اور یہی سہارا۔

وہ بے لحاظ اور بے مروت ہو چکے ہیں، اپنی ضد پوری کرنے کی خاطر، ہر قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان کے دل نفرت نے سیاہ کر ڈالے ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ سمجھوتہ کر لو۔ اگر فہد کی زندگی ہوئی تو تمہیں اس سے کون الگ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر خدا نے اس کی عمر اتنی ہی لکھی ہے تو تمہارے کچھ بھی کرنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں البتہ تم ساری عمر کے خسارے میں رہو گی۔"

"نہیں پھوپھو...... ! میں فہد کو یوں بے بسی اور لاچاری سے مرتے نہیں دیکھ سکتی۔" میں نے تہیہ کر لیا اور اسی شام وکیل سے ملی۔ اگلے ہی دن میں نے کورٹ میں فہد کی سرپرست کی حیثیت سے زید فاروق مجتبیٰ پر جائیداد میں حصہ کی اپیل کر دی۔ فہد کے وارث ہونے کے دعوے کو ثابت کرنے کی میں نے خوب کوشش کی لیکن جانتے ہو عاشر کیا ہوا...... ؟ میں سمجھتی تھی قانون فہد کو عمر فاروق کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے برابر کا حق دے گا میں اسے علاج کے لیے باہر لے جاؤں گی۔

پتا ہے...... عاشر! بات میرے وہم و گمان سے بھی آگے تھی میں تو کیا مجھے اچھا برا سمجھانے والی پھوپھو تک دنگ رہ گئیں۔

انہیں اپنے بھائی کے خون سے اس ہلکے پن کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے تو وہ کیا کہ میں کسی کو یہ بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتی ہوں کہ وہ میرے بھائی ہیں۔ میرے اپنے بھائی۔ میرے اپنے باپ کی اولاد جنہوں نے اپنے ہی باپ کی اولاد کو......" وہ لب کاٹنے لگی تو میں بے تابی سے کہہ اٹھا۔

"کیا انہوں نے فہد کو مروا دیا...... ؟"

"انہوں نے اپنے مرے ہوئے باپ کو ایک بار پھر مار دیا۔" اس نے ہچکی لی۔

"عاشر انہوں نے اپنے اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے فہد کی ماں کے رشتہ داروں کو خرید لیا اور نکاح نامے کو غائب کرتے ہی عدالت میں یہ ثابت کر دیا کہ فہد ان کے باپ کی ناجائز اولاد تھا۔ فہد کے نانا نے بھی مری ہوئی بیٹی کی قیمت وصولتے ہوئے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔ میں اتنی حیران ہوئی کہ عدالتی کارروائی کے خلاف احتجاج تک نہ کر سکی۔ مجھے یقین بھی نہیں آیا کہ یہ حرکت میرے تعلیم یافتہ، اعلا نسب خاندانی بھائیوں نے کی ہے۔

میں یہ تذلیل برداشت نہ کر سکی۔ اس دن میں نے اور پھوپھو نے فہد کے ساتھ وہ انیکسی خالی کر دی۔ وقت بہت کم تھا اور فہد کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا واحد گردہ جینے کی کوشش میں اور بھی ہلکان ہوا جا رہا تھا میں نے دوسرا اگر نسبتاً آسان راستہ منتخب کیا۔ میں چوبیس سال کی ہو چکی تھی۔ میری تعلیم مکمل تھی۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور بھائیوں نے لاتعلقی اختیار کرنے کا قانونی نوٹس دے دیا تھا۔ عدالت میں جائے بغیر بڑی آسانی سے صرف ایک نوٹس کے ذریعے میرا وکیل جائیداد میں سے میرا حصہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے اونے پونے وہ ساری جائیداد بیچی۔ ویزا لگوایا۔ پاسپورٹ بنوایا، میں پھوپھو اور فہد کے ساتھ جانے کی تیاری میں تھی کہ...... فہد...... عاشر وہ مر گیا۔ عاشر...... میں نے ایک بار پھر صبر کر لیا۔ کیا کرتی اس بار بھی لینے والا اللہ تھا۔ ہاں بھیا کو میں نے خدا نہیں بننے دیا۔ ان کو میں ہرا آئی تھی۔ اتنا اطمینان تو مجھے تھا لیکن فہد...... میرا فہد......" وہ گھٹنوں پہ سر رکھ کے رونے لگی میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کے اس کے قریب آ بیٹھا۔

''زینیا! بس کرو اس معصوم بچے کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔''

''مجھے یہ احساس کچوکے دیتا رہتا ہے۔ اگر بھیا اس کے علاج میں تاخیر کا سبب نہ بنتے تو شاید آج وہ جی رہا ہوتا۔ پتا ہے آج اس کی دوسری برسی ہے۔

فہد کی وفات کے بعد بھیا مجھے منانے آئے تھے ان کا خیال تھا کہ اب کانٹا درمیان سے نکل چکا ہے اور اس طرح اکلوتی بہن کا بھائیوں سے الگ رہنا ان کے لیے شرمندگی کا باعث تھا میں نے جانے سے انکار کر دیا۔

ان کے بار بار تنگ کرنے پر میں نے اسلام آباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا رزلٹ آچکا تھا۔ جس سابق میں نے پوزیشن لی تھی۔

پاپا کی محبت کا قرض اور فہد کی محبت کا تقاضا تھا کہ میں زندگی بھر زید بھیا اور زین بھیا کی شکل نہ دیکھوں، کیونکہ وہ دونوں ان دونوں کے مجرم تھے۔ اور اس کا واحد حل تھا کہ میں اپنے بل بوتے پہ جینے کی کوشش کرتی۔ اپنی پراپرٹی اونے پونے بیچ کے میں ویسے ہی نقصان اٹھا چکی تھی۔ جو بچا وہ سمیٹ کے پھوپھو کے ساتھ لاہور چلی آئی۔ اتنا کچھ تو تھا کہ بیٹھ کے بھی کھا سکتی تھی لیکن خود کو بہلانے کے لیے جاب کر لی۔ یہ چھوٹا سا گھر خریدا۔ جاب کرنے سے واقعی دل بہلا۔ تم جیسے دوست ملے۔ ملنا جلنا ہوا۔ پتا چلا کہ دنیا کسی ایک کے جانے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ تمہارے گھر فہد سے ملی تو احساس ہوا میرا فہد دنیا میں ایک ہی نہیں تھا۔ یہاں تو ہزاروں فہد ہیں۔ سب پیارے ہیں۔'' وہ آنسو ایک بار پھر صاف کرتے ہوئے مسکرانے لگی۔

''آج اس کی دوسری برسی پہ میں رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تمہارے گھر گئی فہد سے مل کے فہد کی یاد کو بھلانا چاہتی تھی۔

فہد کے بارے میں اور کیا بتاؤں، سوائے اس کے کہ وہ میرا سب کچھ تھا اب میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔''

''میں ہوں زینیا...... ! میں ہوں تمہارے پاس۔'' میں کہنا تو چاہتا تھا لیکن خود کو اس سپردگی پہ آمادہ نہ کر سکا۔ میرے ہاتھ بڑھے لیکن اسے سہارا دینے کے بجائے صرف دلاسا دے کے رہ گئے۔ میں اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

''میں نہیں جانتا کہ فرشتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر ہوں گی تو شاید، بلکہ یقیناً ایسی ہی ہوں گی۔ پاک آنسوؤں سے دھلی پاک آنکھیں۔ یہ آنسو نہ پچھتاوے کے تھے نہ پشیمانی کے۔ نہ دکھ کے یہ تو بڑے انوکھے سے غم کے انوکھے سے آنسو تھے۔ میں دیر تک انگلی کی پور پہ ہیرے کی کنی کی طرح دمکتے اس آنسو کو دیکھتا رہا۔

''اور آنسو ایسے بھی ہوتے ہیں۔ گدلے، مٹیالے سے بدبودار......'' اپنی سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے اچانک حال میں واپس آتے ہوئے میں نے اپنی انگلی کی پور کو دیکھا، جہاں کچھ دیر قبل میری بھی آنکھ سے ایک آنسو آزاد ہو کے گرا تھا۔ آنسو خشک ہو چکا تھا...... یا شاید گر گیا تھا اب میری انگلی پہ ایک بدنما سا سیاہ دھبا باقی تھا۔

''کیا یہ میرے دل کی سیاہی تھی جو آنسو کے راستے باہر آگئی۔ آنسو دل کے رستے ہی تو آتے ہیں۔ کیا اپنے دل کی سیاہی مکمل صاف کرنے کے لیے مجھے اور رونا چاہیے۔''

☆☆☆

اس کی اصلیت جان کر میں اب اسے پہلے سے بڑھ کے پسند کرنے لگا تھا۔ بھلے مجھ میں سو خامیاں ہوں لیکن ہر نارمل انسان کی طرح میرا بھی ایک آئیڈیل تھا۔ خامیوں سے پاک، ہر برائی سے مبرا، اعلیٰ ظرف، بلند کردار، محبتوں کی انتہا چھو جانے والا ایک مثالی کردار...... وہ ایسی ہی تھی۔

امی سے اور سب سے بڑھ کے فہد سے اس کا لگاؤ بھی ہمیں اور قریب لے آیا اب ہمارے تعلقات آفس تک محدود نہیں رہے تھے۔

وہ تو اپنی تمام زندگی میرے سامنے کھول ہی چکی تھی۔ میں بھی اپنی ہر قابل ذکر پریشانی اس سے شیئر کرنے لگا۔ لیکن میرے زیادہ تر مسئلے ایسے تھے جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ ان سے میرا اندر عیاں ہوتا تھا۔ زینیا نے اپنا آپ اس لیے عیاں کیا تھا کہ اسے اپنے ہونے پہ شرمندگی نہیں تھی۔ جب کہ میں...... میں اب گھبرانے لگا اپنے اندر کے عاشر ملک سے اپنی پر تکبر شخصیت اور خود غرض فطرت سے۔ ترک کرنے کا حوصلہ اب بھی نہیں تھا۔ بس پردے ڈالنے کا ہنر آ گیا تھا۔ میں اپنے غرور سے الگ ہو کے جی نہیں سکتا تھا۔ یہی اکڑ مجھے اس کے آگے ہتھیار نہیں ڈالنے دے رہی تھی۔ وہ لاکھ اچھی سہی۔ میں اسے اپنی مرعوبیت کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ یہی تو میری غلطی تھی۔

میرا دل اس کے آگے سجدے کرتا تھا اور میں خود پہ شرمندہ ہوتا رہتا کہ وہ اس سے...... ایک عام سی لڑکی سے مرعوب ہے۔ اس عام سی لڑکی سے جو زمانے بھر سے خاص لگتی ہے۔ اس کے اسی خاص پن سے متاثر ہونے کے باوجود میرے اندر کا عاشر ملک چاہتا تھا کہ وہ اوروں کے لیے بے شک خاص، بلکہ خاص ترین رہے۔ مگر میرے سامنے ایک عام سی لڑکی ہی بن کے رہے۔ عام سی لڑکی، جو راتوں کو میرے خواب دیکھے۔ دن کو میرے خیالوں میں گم رہے۔ میرے نام کی مالا جپنے والی۔ میرے ساتھ کی دعائیں مانگنے والی۔ میرے نام کی انگوٹھی پہننے کی تمنا رکھنے والی اور اپنے نام کے آگے میرا نام لینے کی خواہش میں جینے مرنے والی عام سی لڑکی...... میں اس کے عام ہونے کا انتظار کرتا رہا اور پہل میں کتراتا رہا۔

فہد کے لیے وہ دیوانی تھی۔ شرمین کے بدصورت رویے کے باوجود ہفتے میں ایک آدھ بار چاکلیٹس اور کھلونوں کے ساتھ اس سے ملنے آ جاتی۔

اس دن جب وہ فہد سے ملنے آئی تو سوئے اتفاق شرمین پہلے سے کسی بات پہ بھری بیٹھی تھی۔ فہد نے اس کے سامنے اس کا موازنہ کسی بات پہ زینیا سے کیا تھا اور اپنی فطری بچگانہ سادہ دلی سے کام لیتے ہوئے اپنی فیورٹ زینیا آنٹی کو زیادہ مارکس دے ڈالے۔

شرمین سے یہ سچائی ہضم نہ ہو سکی، اس نے نہ صرف فہد کو جھاڑ کے رکھ دیا بلکہ زینیا کو بھی غائبانہ بے نقط سنائیں۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میرا جھڑک کے بول اٹھنا اسے مزید مشتعل کر گیا۔ ابھی ہماری تکرار جاری تھی کہ زینیا کی آمد ہو گئی۔ سارے معاملے سے یکسر انجان وہ بے چاری فہد کا بسورتا چہرہ اور خفا خفا انداز دیکھ کے پریشان ہو بیٹھی اور صرف اتنا پوچھ بیٹھی۔

''کس نے ستایا۔ میرے بچے کو...... مجھے نام بتاؤ؟'' اس کا پچکارنا شرمین کو ایک آنکھ نہ بھایا زہریلے لہجے میں پھنکاری۔

میں ہوں نا اس گھر کی واحد ڈائن، میرا ہی منحوس سایہ ہے اس بے چارے سے بچے پہ، آؤ میرا کام تمام کرو۔ مار ڈالو مجھے۔ فہد کو میرے آسیب سے چھٹکارا دلا دو۔''

''آپ...... شرمین، یہ آپ کیا کہہ......'' وہ بھونچکی رہ گئی۔

خود مجھے اور امی کو بھی توقع نہیں تھی کہ وہ سارے لحاظ بالائے طاق رکھتی ہوئی گھر آئی مہمان کا تیا پانچہ کرنے پہ اتر آئے گی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، جس طرح تم میری اولاد کو میرے ہی خلاف بھڑکا رہی ہو اس سے تمہارے بارے میں اور کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔'' اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ زینیا کو ادھیڑ کے رکھ دے۔

''میں چلتی ہوں۔'' زینیا ابھی بیٹھی بھی نہ تھی کہ چل پڑی۔ منظر سے غائب ہونے کے سوا اور کوئی چارہ بھی اس کے پاس نہ تھا میں نے آگے بڑھ کے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''ایک منٹ زینیا! تم جا سکتی ہو مگر ایسے نہیں۔ پہلے شرمین تم سے معاف مانگے گی۔ شرمین تم نے زینیا کی جو انسلٹ کی ہے اس کا ازالہ تمہارے دو لفظوں سے نہیں ہو سکتا مگر تم یہ بھی کہہ دو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا......''

امی میرے کہنے پہ چپ ہی رہیں۔ جس کا مطلب تھا زینیا سے ہونے والی بدسلوکی اور شرمین کی بدتمیزی انہیں بھی گراں گزری ہے۔ مجھے اور شہ ملی۔

''تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا'' وہ یوں کھڑی تھی جیسے میرا یہ حکم اس کی توقع سے باہر ہو۔ اچانک وہ دھاڑی۔

''معافی......اور میں......اور وہ بھی اس سے......''

''رہنے دو، عاشر! کوئی بات نہیں۔'' زینیا نے مجھے روکنا چاہا، مگر میں نے اسے بولنے سے باز رہنے کا اشارہ دیا۔

''زینیا تم میری مہمان ہو۔ تمہاری انسلٹ میری انسلٹ ہے۔''

''اور میں......میں تمہاری کچھ نہیں لگتی......میرے مقابلے میں تم ایک معمولی سی ورکر کو اہمیت دے رہے ہو۔'' شرمین پہ میری بات سنتے ہی ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔

''وہ معمولی نہیں ہے۔ معمولی تم ہو، تمہاری ذہنیت ہے اور تمہاری خصلت ہے۔ اپنا مقابلہ اس سے کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''تم......تم عاشر......! تم مجھے ہمیشہ ذلیل کراتے ہو۔ تمہارے ہوتے میں کبھی خوش رہ ہی نہیں سکتی۔ اللہ کرے یا تم مر جاؤ، یا میں مر جاؤں۔'' اپنے بال نوچتی وہ جاہل عورتوں کی طرح بددعاؤں پہ اتر آئی۔ اب تک خاموش کھڑی امی نے اسے تنبیہ کی۔

''بند کرو یہ تماشا شرمین! تم میرے سامنے میرے بیٹے کو کوس رہی ہو۔''

''تمہارا بیٹا، ہاں تمہارا بیٹا'' وہ بدتمیزی کی انتہا پہ اتر آئی اور اچانک فہد پہ لپکی۔ ''یہ تو میرا بیٹا ہے۔ میرا اپنا بیٹا۔ میرا جو دل چاہے گا کروں گی۔ کوئی روک سکتا ہے تو روک لے۔''

اس نے اچانک فہد کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بے چارہ حیرت کی شدت سے چیخنا تک بھول گیا اور کسی بے جان گڈے کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کے جنونی ہاتھوں کی گرفت میں مار کھاتا رہا۔ زینیا کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ میں اور امی فوراً اسے چھڑانے کے لیے بھاگے۔ بمشکل اس کے ہاتھوں سے فہد کو چھڑانے میں کامیاب ہوئے۔ شرمین سرپٹ بھاگتی اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ لاک ہو گیا۔ زینیا میرے پکارنے پہ ہی فہد کو برستی آنکھوں سے دیکھتی اُلٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔

رات کو ساری روئیداد باقر بھائی جان تک پہنچی۔ کچھ امی کے بتانے پر کہ شرمین نے نہ صرف مہمان کی بے عزتی کی بلکہ ان کے ساتھ بھی تو تکار ہوئی۔

ان کے بیٹے کو منہ بھر کے بددعائیں دیں اور کچھ فہد کی حالت دیکھ کے وہ سخت مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے شرمین سے بازپرس کرنا تک نہ ضروری جانا اور اس پہ ہاتھ اٹھا لیا۔ یہ آخری قدم تھا جو ان کے ساتھ تعلقات کو تباہی کے دہانے تک لے آیا۔ شرمین اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ فہد کو بھائی جان نے لے جانے نہیں دیا۔

اگلے روز زینیا کو یہ سارا قصہ سنایا تو وہ سخت نادم ہو گئی۔

''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے عاشر! نہ میں وہاں آتی، نہ یہ سب بدمزگی پیدا ہوتی۔'' وہ تاسف سے ہاتھ مل رہی تھی۔

''کم آن زینیا! یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ شرمین اور بھائی جان آخر اور کتنا عرصہ اس تعلق کو گھسیٹتے، کبھی تو اس کا خاتمہ ہونا ہی تھا۔ تم خوامخواہ گلٹی فیل مت کرو۔ اس پاگل عورت کو بہانا چاہئے تھا تماشا کھڑا کرنے کا۔''

''کوئی ایسے ہی پاگل نہیں ہوتا عاشر، کوئی تو وجہ ہو گی۔''

''وجہ اس کا حسد تھا اور تسلط پسند رویہ وہ برداشت نہیں کر سکی کہ فہد اس کا اپنا بیٹا ہوتے ہوئے تمہارے زیادہ قریب ہو جائے۔''

''تمہارا تجزیہ کسی حد تک درست ہے لیکن میں اسے فہد والے معاملے پہ لاگو نہیں کر سکتی۔ فہد کے بارے میں وہ لاکھ بُچی ہو لیکن ایک ماں کے اندر اتنا تو یقین ہوتا ہے کہ اس کی اولاد صرف اس کی اپنی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ جذبہ رقابت تو تھا، لیکن اس کی جڑیں کہیں اور گڑی ہوئی ہیں۔'' سوچتی نظروں سے وہ مجھے تکتے ہوئے کہنے لگی۔

''کیا کہنا چاہتی ہو تم......'' میں چونکا۔

''تم نے ایک بار کہا تھا کہ شرمین کسی سے محبت نہیں کرتی بلکہ کسی سے کیا وہ اپنے آپ سے محبت بھی نہیں کرتی۔ اسے خود سے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں عاشر! کل میں نے جانا ہے کہ تمہارا تجزیہ کتنا درست تھا اور کتنا غلط تھا......''

اس نے کہنیاں میز پہ ٹکا کے اپنا چہرہ دونوں شہادت کی انگلیوں کے سرے پہ ٹکاتے ہوئے میری الجھن بھری آنکھوں میں اپنی کھوج بھری آنکھیں گاڑ دیں۔

''تم صاف صاف بات کرو پلیز۔''

''اسے کسی سے محبت ہے عاشر۔'' اس نے ''ہے'' پہ زور دے کر کہا۔

''اتنی کہ اس نے خود سے بھی محبت کرنا چھوڑ دی۔ اس محبت نے اسے بری طرح مجروح کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی تک سے بیزار ہو گئی ہے۔ اس محبت کو نہ تو اظہار کا راستہ ملا نہ پذیرائی کا۔ الٹا دھتکار اور نفرت نصیب ہو گئی۔ بدلے میں اس نے بھی اپنی محبت کو نفرت کا پہناوا دے دیا لیکن عاشر اندر سے یہ محبت پھن پھیلائے جھولتی رہی۔ کل اس کی اس محبت نے حسد اور رقابت کی آگ میں جل کے نفرت اور بےبسی کے احساس سے سلگ کے اپنی ہی زندگی کو ڈس لیا۔ یہ آخری ظلم تھا۔ جو اس محبت نے اس لڑکی پہ ڈھایا۔''

''کیسی محبت......''

''وہ محبت...... عاشر...... جو شرمین کو تم سے تھی اور ہے۔'' اس نے دھماکا کیا۔

☆☆☆

اس بار شرمین اکیلی گئی تھی۔فہد گھر پہ ہی تھا اسلیے ابھی تک بھائی جان اس کے پیچھے سسرال تک نہیں گئے تھے۔کچھ اس بات کی شرمندگی یا خوف بھی تھا کہ ماموں جان کا سامنا کیسے کریں گے۔اس سے پہلے بھی ان دنوں کے درمیان کئی جھگڑے ہوئے مگر نوبت مار کٹائی تک نہیں پہنچی تھی۔ امی جان سے تو وہ کئی بار ڈانٹ کھا چکے تھے۔لیکن اس کے باوجود وہ ان کے کہنے کے مطابق اپنے سسرال بیوی کو منانے کے لیے جانے پہ تیار نہ ہوئے۔امی جان نے دو تین بار بھائی کے گھر فون کیا لیکن شرمین سے بات کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

''عجیب ہٹ دھرم اور سخت دل عورت ہے۔مہینہ ہو چکا ہے گھر سے نکلے۔پلٹ کے شوہر اور بچے کی خبر نہیں لی۔چلو میاں سے تو ناراضگی ہے۔بچے سے کیا لڑائی۔کیا بچے کی یاد بے چین نہ کرتی ہو گی اس کم عقل کو وہ تو سارے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی ہے۔

چلو نہ جھکے، ہم ہی جھک جاتے ہیں۔ایک بار فون پہ آئے تو سہی، ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لوں گی، بہورانی سے ٹھیک ہی ہے۔غیروں کے لیے اپنے گھر میں کیوں فساد پیدا ہو۔اگر اسے نہیں پسند تو میں منع کر دوں گی۔زینیا کو فہد سے ملنے کے لیے اگر چاہے تو باقر کے کان بھی اس کے سامنے کھینچ لوں گی۔مگر بی بی بات تو کرے۔''

وہ مسلسل بڑبڑاتی رہتیں۔میں چپ چاپ سنتا رہتا۔میری چپ تب بھی نہ ٹوٹی جب باقر بھائی جان کو شرمین کی جانب سے خلع کا نوٹس ملا ۔اس انتہائی قدم کی امید کسی کو نہ تھی۔

طلاق کے بارے میں شاید باقر بھائی جان نے کبھی نہ سوچا ہو۔یا شاید وہ سوچ چکے ہوں لیکن بیوی کی طرف سے ملنے والا نوٹس ان کی مردانہ انا پہ کاری ضرب کا باعث بنا۔تذلیل کے احساس سے وہ بپھرے ہوئے تھے۔امی جان نے بڑی مشکل سے انہیں قابو کر کے ماموں کے گھر فون کیا۔وہ الگ پریشان تھے۔

''کیا کروں آپا! میں خود سمجھ نہیں پا رہا۔اس نے پچھلے ہفتے پہلی بار مجھ سے ذکر کیا میں نے تو ظاہر ہے فوراً انکار کر دیا۔ڈانٹا ڈپٹا، سمجھایا بھی کہ طلاق یافتہ عورت کا معاشرے میں کیا مقام ہے۔لیکن وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔کچھ سننے پہ تیار ہی نہ ہوتی۔حتیٰ کہ اس نے خودکشی کی دھمکی دے دی کہ اگر باقر سے اس کی طلاق نہ کروائی گئی تو وہ زہر کھا لے گی۔''

''اور تم ڈر گئے۔'' امی نے شرم دلائی۔

''جانتے بھی ہو کہ وہ کس قدر جذباتی اور غصیلی لڑکی ہے، لیکن کم ہمت بھی۔مرنے کی ہمت نہیں اس میں، تم اس کی خالی خولی دھمکیوں میں آ کے اس کی زندگی برباد کر رہے ہو۔''

''وہ اب کم ہمت نہیں رہی آپا۔آپ نے محسوس ہی نہیں کیا وہ کتنی بدل چکی ہے۔جنونی ہو چکی ہے لیکن میں تو اسے جھوٹی تسلی سے ٹال رہا تھا لیکن اس نے چپ چاپ اپنے طور پر نوٹس بھجوا دیا۔اب آپ ہی بتا دیجئے کہ اس میں اتنی ہمت آئی ہے تو اس نے اپنے بل بوتے پہ یہ قدم اٹھا لیا۔''

''یہ ہمت بھی تم نے ہی دی ہے قاسم! اس کی ہر جا بے جا ضد پوری کی۔اس کی ہر بے وقوفی میں اس کا ساتھ دیا۔اسے گھر بسانے کی تعلیم دی ہوتی تو اب اس کے کام آتی، وہ تمہارے کہے میں ہوتی۔''

امی نے ان کی تربیت کو الزام دیا تو اب تک تحمل سے بات کرتے ماموں جان بھڑک گئے۔

''بس کیجئے آپا! زندگی میری بچی کی برباد ہو رہی ہے اور باتیں بھی مجھے سننا پڑ رہی ہیں۔ یہ تو میری شرافت ہے جو تحمل سے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں ورنہ پہلے تو باقر سے باز پرس کرتا کہ آخر اس نے ایسا کیا کیا کہ میری بچی اس حد تک خود سے اور زندگی سے بیزار ہو گئی۔

اور اگر وہ میرے کہنے میں نہ ہوتی تو باقر سے شادی ہی کیوں کرتی، اس نے کتنی بار کہنا چاہا کہ اس کی اور باقر کی عمر میں بہت فرق ہے لیکن میں نے بختی سے یہ اعتراض رد کر دیا کہ عمر کا یہ فرق تب میرے نزدیک معنی نہیں رکھتا تھا۔

پھر ساری عمر بیٹی سے شرمندہ ہی رہا۔ ہر بار اس کے میکے آنے کے بعد اس کے سوالوں کے جواب دینا پڑے۔ ڈیڈی آپ تو کہتے ہیں......

آپا! بات اب میرے بس میں نہیں رہی۔ باقر سے کہیں وہ اگر یہ رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے تو اپنے طور پہ کوشش کرے۔ شاید معاملہ دب جائے۔''

بڑی مشکل سے امی جان نے باقر بھائی جان کو منتیں واسطے دے کر فون کرنے پہ آمادہ کیا۔ ادھر ماموں بھی بمشکل شرمین کو فون تک لا سکے۔

طوعاً کرہاً بھائی جان نے اپنے طرز عمل کی معافی بھی مانگی، آئندہ ایسا کچھ نہ کرنے کی یقین دہانی بھی کرائی۔ جواباً وہ بڑے تمسخر سے ہنسی۔ بھائی جان نے فون کے اسپیکر آن کر رکھے تھے تا کہ امی کو اندازہ ہو سکے انہوں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے۔

''آئندہ ایسا ہوگا بھی کیسے۔ بس تمہارا اور میرا ساتھ یہیں تک تھا مسٹر باقر......!''

''شرمین! ابھی ہمارے سامنے زندگی پڑی ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے بلکہ میری زندگی تو شروع ہی اب ہو گی۔ تمہارا نام اپنے نام کے آگے سے کھرچنے کے بعد، میری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔''

''میں نے تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔''

''تمہیں کیا پتا میری خوشی کیا ہے؟''

''تم نے کبھی بتانے کی ضرورت بھی تو محسوس نہیں کی۔ آخر میں بھی انسان ہوں کتنے سال پتھر سے سر پھوڑتا۔ میں نے تمہیں بے تحاشا محبت دی، مان دیا، تمہاری ہر بات چاہے وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو برداشت کی۔ لیکن تمہاری سرد مہری ختم نہ کر سکا۔ جھنجھلا کر میری محبت بھی ہار مان گئی لیکن اگر تم ساتھ دو تو وہ دن پھر لوٹ سکتے ہیں۔ میں سب بھول جاؤں گا۔ بھلے تم پہلے کی طرح مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہو۔ میں پھر بھی تمہیں......''

''مجھے نہیں چاہئے تمہاری یک طرفہ فقیرانہ محبت۔'' بھائی جان کی اس درجہ مفاہمت پہ بھی اس کا لہجہ نرم پڑا نہ دل۔

''نہیں چاہیے ایسی زندگی جس میں...... میں خود...... کسی کو پیار کرنے کے لیے ترستی رہوں۔ مجھے صرف تمہاری محبت نہیں چاہئے۔ میں جب خود تم سے محبت نہیں کر سکی تو تمہارے ساتھ کیسے رہوں کس طرح؟''

''تم......'' غصے کی زیادتی سے وہ کچھ بول نہ سکے۔ یہ سب سے بڑا حملہ تھا جو ایک عورت نے ایک مرد کے پندار پہ کیا تھا۔

''تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں، میں خود تم پہ تھوکنا تک پسند نہیں کرتا۔ یہ میری ماں کی خواہش تھی اور میرے بچے کی زندگی کا سوال۔ اس

لیے تمہیں فون کرلیا۔ تمہیں عزت راس نہیں آئی تو ٹھیک ہے۔ تمہیں طلاق نامہ مل جائے گا مگر صرف...... طلاق نامہ، فہد کا خیال تک دل میں مت لانا۔

وہ صرف میرا بیٹا ہے صرف میرا..... خبردار جو اس کے بارے میں کوئی سوال کیا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔ مگر اپنا خون ایسی عورت کے حوالے نہیں کروں گا جو مجھے نفرت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔"

ان کا خیال تھا شاید یہ دھمکی شرمین کو لرزا کے رکھ دے گی۔

وہ روئے گی، گڑگڑائے گی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا، چند سیکنڈ وہ چپ رہی پھر اس کی آواز آئی۔

"مجھے منظور ہے بلکہ میں لکھ کے دینے پہ تیار ہوں کہ میں علیحدگی کے بعد فہد کا مطالبہ ہرگز نہیں کروں گی۔ میرا وکیل یہ کاغذات تیار کروا کے ثبوت کے طور پہ تمہیں بھجوا دے گا۔ سندر رکھنا۔"

"تم اور تمہارا وکیل......!" بھائی جان طیش کے مارے گالیاں بکنے لگے۔ امی نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے کر رکھنا چاہا تاکہ شرمین کے کسی اور اشتعال انگیز فقرے سے کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائیں لیکن وہ ایک ہاتھ سے انہیں پرے کرتے بولتے رہے۔

"سنبھال کے رکھو اپنے وکیل کو اور اپنے کاغذات کو میں لعنت بھیجتا ہوں عدالتوں پہ تم میری طرف سے ابھی اسی وقت فارغ ہو۔ لو سنبھالو اس آخری تحفے کو۔ تم اس کے لائق تھی۔ تمہیں رونمائی میں بھی یہی تحفہ ملنا چاہیے تھا۔ طلاق...... طلاق...... طلاق......" ایک طوفان آ کے گزر گیا۔

امی کئی دن فہد کو گود میں لیے آنسو بہاتی رہیں۔ باقر بھائی جان نے خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں...... میں حیرت انگیز طور پر پرسکون تھا۔ یہ ہونا ہی تھا بلکہ یہی ہونا چاہیے تھا اس گھر کے لیے۔ ہم سب کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ شرمین کا ہم سب سے دور جانا۔

زینیا کو بھی اس واقعے کا بے حد افسوس ہوا۔ اس نے مجھ سے اس بارے میں بات کرنا چاہی لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔

"میرا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں تم اب کیا جاننا چاہتی ہو۔ یہ باب ختم ہوا اگر تمہیں اس پہ اتنا ہی افسوس ہے تو جاؤ جا کے امی اور بھائی جان سے اظہار افسوس کر آؤ۔ بلکہ......!"

لیکن اس مرے ہوئے رشتے کا پوسٹ مارٹم مت کرنے بیٹھ جانا۔ سوائے تعفن کے اور کچھ نہ ملے گا۔" میں اس بےزاری سے بولا کہ وہ کتنی دیر شاکی نظروں سے مجھے تکتی رہی۔

"تم کس قدر بے حس ہو۔"

"تمہیں آج پتا چلا ہے۔" میں ہنسا۔ "میں تو ہمیشہ سے بے حس ہوں۔"

"میں نے کہا تم بے حس بنتے ہو۔" اس نے بنتے ہو پہ زور دے کے کہا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ تم ضرورت سے زیادہ حساس "بنتی" ہو۔"

میں نے چڑ کے جوابی کارروائی کی۔ بے حسی میرا پسندیدہ وصف تھا۔ مجھے اس پہ اچھا خاصا فخر تھا اور وہ مجھے اس سے محروم ظاہر کر رہی تھی۔ بھلا بے حسی سے بڑھ کے نعمت اور کون سی ہوگی۔ زمانے بھر کا احساس پالے رکھنا تو نری دردسری ہے۔

''کہہ لو، تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں جو ہوں، سو ہوں۔''

اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ وہ جو تھی۔ واقعی بس وہ ہی وہ تھی کوئی اور اس جیسا ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن میں اس سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں تو کھل کے خود سے بھی یہ اقرار کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ مجھے اپنے دل کا اس کے آگے متاثر ہو جانے والا فدویانہ انداز ذرا پسند نہ آیا۔

☆☆☆

کیا قیامت ہے کہ دل جس کا نگر ہے محسن

دل پہ اس کا بھی اجارہ دیکھا نہیں جاتا

زینیا کا گھر پہ آنا اور تسلسل سے بڑھ گیا۔ وہ امی جان کی دلجوئی کرنے اور فہد کو سنبھالنے کا فریضہ خوش دلی سے ادا کرنے لگی۔ وہ دونوں اس کے عادی بنتے جا رہے تھے اور میں زینیا کو ان دونوں کا خصوصاً فہد کا عادی بنتا دیکھ کے مطمئن ہو رہا تھا، بس اب منزل کچھ ہی دور تھی۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب زینیا...... ایک عام سی لڑکی بن کے میرے آگے اپنی ہار مان جاتی۔ اپنی خاموش محبت کو زبان دینے پہ مجبور ہو جاتی۔ مگر وہ دن آ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی جھکی آنکھوں والی پرلس دھیمی مسکراہٹ اب میرے سامنے اور بھی ریشم سی ہو جاتی۔ میری ہتھیلیاں اس مسکراہٹ کی لطیف سی گرفت میں بھیج جاتیں اور مجھے یقین ہونے لگتا۔ عاشر ملک، زینیا عمر تمہیں چاہتی ہے۔ ٹوٹ کے چاہتی ہے اسے چاہنے دو۔ چاہتے رہنے پہ مجبور کرتے جاؤ۔ یہاں تک وہ خود ٹوٹ جائے۔ پھر اس ٹوٹی ہوئی عام سی زینیا عمر کو میں اپنے ہاتھوں سے جوڑ کے اپنے گھر میں سجادوں گا۔ عاشر ملک کا حوالہ ملنے سے وہ پھر سے عام سے خاص بن جائے گی لیکن وہ ٹوٹ ہی نہ پا رہی تھی۔ میں نے لاکھ کوششیں کیں۔

ویلنٹائن ڈے پہ سرخ گلابوں کا بوکے اس کی ٹیبل پہ رکھ کے میں خاموشی سے اپنی ٹیبل پہ آ کے بیٹھ گیا۔ گلاس وال سے اس کے کیبن کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ آئی، ٹھٹک کے بوکے کو دیکھنے لگی۔ پلکیں جھک گئیں۔ دو تین بار سر بالکل ویسے ہی ہلایا جیسے اپنی مسکراہٹ کی لطافت سے خود ہی محظوظ ہو رہی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں بوکے تھا۔ جب وہ اگلے ہی لمحے میرے کیبن میں موجود تھی۔

''یہ میری ٹیبل پہ کیا کر رہا ہے؟'' حالانکہ میں نے اپنا نام نہیں لکھا تھا لیکن وہ براہ راست مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

''سب کی ٹیبل پر کوئی نہ کوئی پھول، کوئی نہ کوئی گلاب پڑا تھا، تمہاری خالی تھی میں نے سوچا کہ تم ویلنٹائن ڈے کا مزا کیوں نہ لو۔''

''بڑی عنایت آپ کی۔ لیکن مجھے یہ مغربی روایات نہ پسند ہیں، نہ میں انہیں مانتی ہوں۔ خیر ٹیبل تو آپ کی بھی خالی ہے۔'' اس نے بوکے میری ہی ٹیبل کے ایک طرف رکھ دیا میں جھنجلا گیا۔

''تم ان سرخ گلابوں کے قابل ہی کہاں تمہیں تو وہ منحوس پیلے گلاب پسند ہیں اچھا ہوتا میں سرسوں کا پودا اکھاڑ لاتا، تمہارے لیے۔'' وہ ہنسنے لگی۔

''لانا کیا بہت ضروری تھا۔ ویسے بھی پھول دو موقعوں پہ اچھے لگتے ہیں، شادی پہ یا میت پہ......''

''اچھا تو جب تم مرو گی ناں، تو پلیز مجھے ضرور بتانا، میں یہ پھول لے کر سب سے پہلے پہنچوں گا۔''

میں اس کی بے نیازی پہ چڑتا جا رہا تھا۔ کتنی مشکل سے میں نے خود کو اس پیش رفت پہ آمادہ کیا تھا کہ شاید ان گلابوں کی مہک سے مسحور ہو کے اگلا قدم وہ اٹھائے لیکن وہ الٹا مذاق اڑائے جا رہی تھی۔

''تم نے شاید غور سے سنا نہیں، میں نے کہا۔ شادی پہ یا میت پہ، تم دوسری جانب کیوں زور دے رہے ہو۔ میری شادی پہ کیا خالی ہاتھ آؤ گے۔''

پیپر ویٹ گھماتے ہوئے، چیئر کی بیک سے ٹیک لگائے، وہ عجب کریدتے انداز سے پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت کے ساتھ کچھ اُگلوا لینے کی خواہش بھی چمک رہی تھی۔ مجھ پہ اچانک انکشاف سا ہوا کہ میری طرح وہ بھی میری جانب سے پہل کے انتظار میں ہے۔ میں نے اپنے قلعے کے دروازے اور مضبوطی سے بند کر دیے۔

''خالی ہاتھ کیوں؟'' ''آخر دوست ہوں تمہارا۔ پورا پھولوں کا ٹرک بھجوا دوں گا۔''

میں نے دوست پہ زور دے کے کہا۔ وہ جھکنا نہیں جانتی تو کیا عاشر ملک کوئی کمزور چیز ہے۔ جو گھٹنے ٹیک دے، مجھے توقع تھی وہ بڑی آس سے پوچھے گی صرف دوست...... لیکن اس نے فوراً ہاتھ آگے کیا۔

''تو پھر وعدہ کرو، ٹرک نہ سہی، کم از کم ایسا ہی ایک بوکے ضرور بھیجو...... نہیں بلکہ لے کر آؤ گے۔''

میں نے ایک نظر اپنے آگے پھیلی اس گلابی ہتھیلی کو دیکھا۔ دل پھر بے ایمان سا ہو کے کہنے لگا کہ اس بوکے سے ایک گلاب توڑ کے اس ہتھیلی پہ سجا دوں لیکن میں نے ان سنی کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

''وعدہ......''

☆☆☆

''میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔''

میں نے اپنی سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے اس ہلکے گلابی کاغذ پہ انگلیاں پھیریں، وہ دس الفاظ پہ مشتمل فقرہ...... اور وہ فقط ایک فقرے سے سجا مبہم سا خط...... یہ خط ہی باعث بنا تھا، مجھے خود فراموشی کی اس دلدل سے کھینچ لانے کا۔

بہت دنوں بعد

تیرے خط کے اداس لفظوں نے

تیری چاہت کے ذائقوں کی تمام خوشبو

میری رگوں میں انڈیل دی ہے

بہت دنوں بعد

تیری باتیں

تیری ملاقات کی دھنک سے دہکتی راتیں

اجاڑ آنکھوں کے پیاس پاتال کی تہوں میں

وصال وعدوں کی چاند چنگاریوں کو سانسوں کی آنچ دے کر

تیرے مہکتے مہین لفظوں کی آبشاریں

بہت دنوں بعد پھر سے

مجھ کو رلا گئی ہیں

بہت دنوں بعد میں نے سوچا تو یاد آیا

کہ میرے اندر کی راکھ کے ڈھیر پہ ابھی تک

تیرے زمانے لکھے ہوئے ہیں

بہت دنوں بعد میں نے سوچا تو یاد آیا

کہ میں بھی کتنا بدل گیا ہوں

بچھڑ کے تجھ سے

کئی لکیروں میں ڈھل گیا ہوں

میں اپنے سگریٹ کے بے ارادہ دھوئیں کی صورت

ہوا میں تحلیل ہو گیا ہوں

نہ ڈھونڈ میری وفا کے نقش قدم کے ریزے

کہ میں تو تیری تلاش کے بے کنار صحرا میں

نجانے کس راہ میں کھو گیا ہوں

میں واقعی کھو گیا تھا، نجانے اس نے مجھے کیسے ڈھونڈ نکالا۔ میں تو خود اپنی تلاش میں تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے کھوج نکالا بلکہ مجھے مجھ سے ملوا بھی دیا اور میں عرصے بعد خود کو دیکھ کے حیران تھا پریشان تھا اور پشیمان تھا...... یہ میں ہوں۔ عاشر ملک۔ کیا میں زندہ ہوں، کیا میں زندہ تھا اگر تھا تو کہاں رہا......

☆☆☆

"سوری رانگ نمبر۔"

صبح سے پانچواں فون تھا جس پہ دوسری طرف سے آتی آواز کو سنتے ہی میں رانگ نمبر کہہ کے فون رکھ دیتا تھا۔ موبائل پہ الگ شور مچا ہوا تھا، آف تو کر کے نہیں رکھ سکتا تھا البتہ نمبر پڑھ کے آن کرنے کی ہمت گوارا نہیں کی۔"

آفس کے فون سیٹ کا ریسیور اتار کے رکھ نہیں سکتا تھا، کئی ضروری فون آتے تھے۔ سارا دن یہی تماشا ہوتا رہا۔ آفس سے نکلتے ہی میں نے اپنے موبائل سیٹ کو آف کر دیا۔ گھر پہنچتے ہی امی کو سختی سے تاکید کی، کسی کا فون بھی آئے مجھے ہرگز ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اپنے کمرے کے سیٹ سے میں نے پلگ کھینچ کے الگ کیا اور سکون سے بیڈ پہ لیٹ کے آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

امی جان سے بات کرنے کا اب درست موقع آچکا تھا اس سے پہلے کہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو، ان سے بات کر لینی چاہئے۔ یہ بات کتنی ضروری تھی۔ میں جانتا تھا لیکن میں کروں گا کیسے، یہ نہ جانتا تھا، آخر کیسے...... کیسے میں امی سے کہتا، مجھے اس کی ضرورت ہے۔ عاشر ملک کو کسی کی ضرورت ہے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

”تو پھر کیا کہوں......“ میں سوچتا۔ ”یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ اس گھر کو، آپ کو فہد کو زینیا کی ضرورت ہے، ہاں یہ ٹھیک ہے، دل کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور امی اور بھائی پہ احسان الگ کہ ان کی خاطر ایک عام سی لڑکی کو اپنانے پر مجبور ہو گیا۔“

اس نکتے پہ دل اور دماغ دونوں متفق ہو گئے۔ دل کی مراد بھی پوری ہو رہی تھی۔ بغیر جھکے آسانی سے من پسند چیز حاصل ہو رہی تھی اور دماغ کے خود غرض تقاضے بھی پورے ہو جاتے، ایک اور احسان میرے کریڈٹ پہ آجاتا، میں نے اگلے روز کا انتظار شروع کر دیا۔

اگلے روز ایک الگ تماشا میرا منتظر تھا۔ آفس جاتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران مسلسل موبائل کی بیپ اور اس پہ لکھا نمبر مجھے ڈسٹرب کرتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ اگلے ایک دو روز تک ایسا ہی ہونے والا ہے۔ میرا اگنور کرتے رہنا ہی اس مسئلے کا واحد حل تھا۔ آخر کوئی کب تک بند دروازوں سے سر پھوڑ سکتا ہے۔ بند دروازے کے اس طرف میں بڑے سکون سے بیٹھا یہ سوچتا رہا، یہ خیال تک نہ آیا کہ دروازے توڑے بھی جا سکتے ہیں اور دروازہ ٹوٹ ہی گیا۔

میں زینیا سے ہاشمی گروپ کا پراجیکٹ ڈسکس کر رہا تھا جس کی پریزنٹیشن کے لیے ہم دونوں کو ہی کل جانا تھا کہ میری سیکرٹری نیلم نے انٹر کام پہ مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی۔ ایک ثانیے کو تو میں ٹپٹا کے رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کی ہمت اتنی بڑھ جائے گی۔ میں نے اسے فی الحال پس منظر میں رہنے کا سختی سے حکم دیا تھا۔ خیر اگر اسے اس معاملے کو اتنی جلدی نمٹانا ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھے بھی ٹینشن مول لینے کا شوق نہیں۔ اچھا ہے جتنی جلدی یہ قصہ تمام ہو لیکن اس طرح...... زینیا کے سامنے سب کے سامنے اس بات کا کھلنا میرے لیے سودمند نہیں تھا۔

”کہہ دو، میٹنگ میں ہوں اور یہ بھی کہ یہ میرا آفس ہے۔ یہاں میں پرسنل میٹرز کی ڈسکشن افورڈ نہیں کر سکتا۔“

میں نے سختی سے کہا۔ زینیا الجھن بھرے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی اس نے انٹر کام پہ نیلم کے ذریعے سن لیا تھا کہ مجھ سے ملنے کون آیا ہے اور میں کس سے ملنے سے کترا رہا ہوں۔ اس کے خاموش سوال کا جواب میں نے ٹال مٹول سے دینا چاہا۔

”پاگل ہے، وہی فضول کے رونے، پہلے غصے میں اتنا بڑا اور سنگین فیصلہ کر لیا اب بچے کے لیے تڑپتی پھر رہی ہے۔“

اور دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔ شرمین سچ مچ تڑپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے اسے روکنے کی کوشش کرتی نیلم تھی میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ زینیا بھی پیچھے مڑ کے اسے دیکھنے لگی، وہ زینیا کو دیکھ کے وہیں رک گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ پرشکن، بے ترتیب

لباس، بکھرے بال اسے اور وحشت زدہ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں دیوانگی ناچ رہی تھی۔ لب خشک تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پہلی بار میں خوفزدہ ہوا۔

میں نے ڈرے ڈرے انداز سے زینیا کو دیکھا۔ شرمین کے تیور میرا بنا بنایا کھیل برباد کر سکتے تھے۔

''تو...... یہاں بھی موجود ہے، تب ہی...... تب ہی تم مجھ سے ملنے سے کترا رہے ہو......'' وہ باری باری ہم دونوں کو دیکھ کے کہنے لگی۔ میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

''یہ آفس ہے شرمین! یہاں زینیا نہیں ہوگی تو کیا تم ہوگی اور میں تم سے اس لیے...... میرا مطلب ہے فی الحال اس لیے نہیں ملنا چاہتا تھا کہ میں ایک ضروری میٹنگ کر رہا تھا، پرسنل باتیں کہیں اور بھی، کسی اور وقت بھی ہو سکتی ہیں۔''

بظاہر ٹھنڈے لہجے میں لیکن شعلے برساتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے میں نے آخری الفاظ پہ زور دے کر اسے کچھ باور کرایا۔

''اوکے عاشر! میرا خیال ہے آج کی میٹنگ کا ٹائم تو ختم ہو گیا ہے کل میٹنگ میں ملاقات ہوگی ہاشمی چیمبرز میں۔''

زینیا اپنا بیگ اور فائلز اٹھاتی باہر نکل گئی۔ میرے سر سے ایک خطرہ تو ٹلا۔ اب میں با آسانی شرمین سے نمٹ سکتا تھا۔ آگے بڑھ کے اس کے بازو کو اپنی آہنی گرفت میں دبوچتے ہوئے میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''تم سے کہا تھا کہ چپ چاپ بیٹھی رہنا، ذرا حالات قابو میں آ جائیں تو میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔''

''تمہیں حالات کی فکر ہے، میرا دل قابو میں نہیں آ رہا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان تھام لیا اور بلک اٹھی۔

''اپنے دل اور جذبات پہ قابو پانا سیکھو۔'' میں نے جھٹکے سے اپنی شرٹ اس کے ہاتھوں سے چھڑائی۔

''یہ تم اب مجھے کہہ رہے ہو۔ میں نے تو کتنا عرصہ بند باندھ کے رکھا تھا تم نے ہی مجھے بے قابو کیا اور اب جب میں خود کو سنبھالنے سے قاصر ہوں تو تم مجھے سنبھالنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ مجھ سے کترا رہے ہو۔ دو دن سے میں تم سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ہوں لیکن تم بری طرح اگنور کر رہے ہو۔''

''تم کیوں نہیں سمجھتی ابھی ہمارا ملنا مناسب نہیں ہے اگر کسی کو شک ہو گیا تو......''

''ہوتا رہے شک، اب چھپا کے کیا کرنا ہے۔ ہم ساری دنیا سے کٹ کے تو نہیں رہ سکتے۔ تم اب مجھے کیوں دنیا سے ڈرا رہے ہو، تب تو تم نے ہی میرے سارے ڈر ختم کیے تھے مجھے بے خوف کیا تھا یہ کہہ کر کے تمہیں کسی کی پروا نہیں کوئی کچھ بھی کہتا رہے تم مجھے اپنا کے رہو گے۔ تمہاری یقین دہانی پہ میں نے باقر سے......''

''پہلے کی بات اور تھی۔ مجھے بھی یہ سارا کھیل بہت آسان لگا لیکن تم نے جارحانہ طرز عمل اپنا کے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اب بہت پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ تم نے باقر بھائی سے اور امی جان سے جس طرح کا رویہ اپنایا۔ اب میرے لیے تمہیں اپنانا اور مشکل ہو گیا ہے۔ خیر آسان تو پہلے بھی نہیں تھا۔ صاف بات کہوں تو اب یہ صرف مشکل بلکہ ناممکن......!'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔

''ناممکن کا مطلب جانتے ہو تم یعنی کہ اب یہ ہو نہیں سکتا کبھی ہو ہی نہیں سکتا ایسا کیسے کہہ سکتے ہو......''

تھکے تھکے قدموں سے پیچھے ہٹتی وہ دیوار سے جا لگی۔ اس کی شکستگی دیکھ کے میری شرمندگی زائل ہوئی اور میرے اندر کا کمینہ انسان پوری طرح طاقتور ہو کے اس کو اور ضربیں لگانے لگا۔

''میں سب کچھ کر سکتا ہوں شرمین قاسم علی! جب تک تم شرمین باقر ملک تھیں سب کچھ کرنے کا خیال، صرف خیال ہی رہتا تھا لیکن اب جب کہ تم اپنے نام کے آگے سے میرے بھائی کا حوالہ کھو چکی ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں اس نام کو ادھوا کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں اب میں سب کچھ کر سکتا ہوں، سب کچھ...... میں تمہیں اکیلا بھی کر سکتا ہوں اور وہ میں نے کیا۔ میں دھوکا بھی دے سکتا ہوں اور میں نے دیا ہے۔ میں جھوٹ بھی بول سکتا ہوں اور وہ میں نے بے دریغ بولے ہیں۔ میں تمہیں فریب بھی دے سکتا ہوں اور وہ میں نے دیا ہے میں تمہیں بے وقوف بھی بنا سکتا ہوں اور شرمین...... وہ تم بن چکی ہو۔''

میں مزے لے لے کر کہنے لگا وہ کرب سے مجھے دیکھنے لگی۔

''تو وہ سب فریب تھا۔ جھوٹ تھا۔''

''تو کیا سچ تھا۔ تم نے عاشر ملک کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ مجھے کیا لڑکیوں کی کمی ہے جو میں ایک شادی شدہ بچے کی ماں، ایک بے ڈول سی بھدی عورت کے پیچھے پاگل ہو کے سارے خاندان سے دشمنی مول لوں۔ تم میں ہے ہی کیا، جس کے زعم میں تم میرے ان جھوٹے دعووں پہ ایمان لا بیٹھیں تم نے ایک بار بھی سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ تمہارے اندر ایسی کیا بات ہے جو عاشر ملک جیسے انسان کو متاثر کرے۔ تمہارا حسن دھندلا چکا ہے تمہاری خوبصورتی روندی جا چکی ہے۔ تم ایک برتی ہوئی بلکہ تھوکی ہوئی عورت ہو۔ تعلیم، ذہانت، کردار، اخلاق، آخر کیا ہے تم میں؟ کن ہتھیاروں سے لیس ہو کے تم مجھے فتح کرنے چلی تھیں۔''

''میں تو سارے ہتھیار ڈال کے آئی تھی۔ میں تمہیں فتح کب کرنے آئی تھی۔ میں تو اپنا آپ تمہیں دینے آئی تھی......''

''اور میں کیا کروں گا تمہارا۔'' میں نے حقارت سے کہا۔ ''مجھے اپنے گھر سے تمہیں دور کرنا تھا اور بس، تمہیں پتا ہے نا کہ مجھے ہر چیز ''بہترین'' چاہیے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا کہ تمہارے جیسی عورت میرے گھر پہ رہے، میرے بھائی سے وابستہ رہے اور میرے فہد کی ماں کہلائے۔''

''تم نے پلاننگ سے فہد کو بھی مجھ سے دور کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس سے جدائی اپنے مقدر میں لکھ لی۔'' وہ سسک پڑی۔

''تو تم ایسا نہ کرتیں......'' میں نے شانے اچکائے۔ ''میں نے کچھ بھی تم سے زبردستی نہیں کروایا حتیٰ کہ میں نے تو اصرار نہیں کیا۔ صرف چند راستے بتائے تھے جن پہ چلنا یا نہ چلنا تمہاری اپنی مرضی پہ منحصر تھا۔ اتنی ہی ممتا کی ماری ہوتیں تو ٹھکرا دیتیں میرے مشورے کو۔''

میں نے اسے آئینہ دکھایا جو سچ تھا۔ واقعی اگر وہ خود کچی مٹی کی طرح میرے ایک اشارے پہ ڈھل نہ جاتی تو میں کیسے کامیاب ہو پاتا، اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں۔

''بہت بڑے کھلاڑی ہو نا تم...... ہے نا عاشر ملک۔'' اس نے اچانک اپنے آنسو پونچھے۔

''بہت اونچا گیم کھیلا ہے تم نے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا ہے تم پھر ''بہترین'' چیز چاہتے ہو تو عاشر ملک بھی اپنے

دل کو زیادہ نہیں تو کچھ تو بہتر بنانے کی کوشش ضرور کرنا۔ لیکن میں جانتی ہوں تم ایسا کرو گے نہیں کیونکہ تم خود میں کسی خامی کو تسلیم کر ہی نہیں سکتے۔ تو اسے سدھارنا تو بہت دور کی بات ہے تم خود کو مرد کہتے ہو تم نے ایک عورت کو ہر طرح سے نہتا کرنے کے بعد اس کی لاعلمی میں اس پہ وار کیا ہے۔ لعنت ہے تمہاری مردانگی پہ" اس نے زمین پہ تھوکا۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

"گیٹ آؤٹ۔" میں نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"ابھی اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں تمہارے پاگل پن کا لحاظ نہیں کروں گا۔ دھکے مار مار کے ساری دنیا کے سامنے تماشا بنا دوں گا۔"

"تماشا تو اب میں بناؤں گی اور یاد رہے میں تمہاری طرح بزدل نہیں۔ میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں خود کو بچا سکتے ہو تو بچالو۔ ورنہ تمہاری زندگی میں کچھ بھی بہترین نہیں رہے گی، نہ تم...... نہ تمہاری زندگی...... دونوں بد سے بدتر ہوتی جائیں گی۔" وہ دھمکی دیتی چلی گئی۔

میں جانتا تھا وہ ذہنی طور پہ مفلوج عورت میرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے تو کچھ کر نہ سکی۔ میرا کیا نقصان کرے گی۔ بلکہ میں اب پرسکون تھا۔ پچھلے دو روز سے اس کی فون کالز نے جو ڈسٹربنس پھیلا رکھی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ کچھ کانٹے آسانی سے تو نہیں نکلتے۔ انہیں کھینچ کے اکھاڑنا پڑتا ہے اور میں نے شرمین کو اکھاڑ پھینکا تھا۔

☆☆☆

اس دن امی جان نے ایسی بات کی کہ میں نے بے ساختہ خود کو اپنی بروقت پلاننگ پہ جی بھر کے داد پیش کی۔ سب کچھ میرے حسب منشا ہو رہا تھا۔ جیسا میں چاہتا تھا۔

"شرمین کے جانے سے گھر کو تو کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس نے خود کو گھر کا حصہ بنایا بھی کب تھا لیکن پھر بھی اس کا اس طرح ہم سب سے کٹ جانا سانحہ ہی تو ہے۔ باقر کا گھر اجڑ گیا فہد سے ماں چھین گئی۔ چاہے وہ برائے نام ہی سہی، لیکن تھی تو ماں...... یوں ادھورا، لٹا پٹا سا گھر مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

"تو آپ بھائی جان کی دوسری شادی کروادیں۔ انہیں اس طرح اکیلا تو نہیں رکھنا ساری عمر۔" میں نے بظاہر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے لیکن ابھی اتنی جلدی، نہ میں اس سے یہ بات کرنا چاہتی ہوں اور نہ ہی وہ ذہنی طور پر تیار ہوگا۔ تھوڑا وقت گزرنے دو اگر تم ہامی بھرو تو میں تمہاری شادی کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ فی الحال میں صرف انہیں سننا چاہتا تھا کچھ دیر میرے ردعمل کو کھوجنے کی کوشش کرنے کے بعد امی جان نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

"ویسے تو تمہارے لیے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

لیکن عاشر اب میں تمہاری شادی کا سوچوں تو ذہن میں بس ایک ہی نام آتا ہے۔ زینیا اس کے سوا اب کوئی سوجھتی ہی نہیں تمہارا کیا خیال

ہے۔۔۔۔۔۔“

”میرا خیال۔۔۔۔۔“میں چپ رہا مگر اندر سے قہقہے لگا رہا تھا۔

☆☆☆

”تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔“ زینیا نے مجھے چونکا کے بعد میری رائے طلب کی۔اس کا تجزیہ میرے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ میں کچھ کہہ نہ سکا۔اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔

”شرمین تم سے محبت کرتی ہے؟“

اور اب مجھے حیران کردینے کے بعد وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ ”میرا کیا خیال ہے۔“

”میرا خیال۔۔۔۔۔میرے خیال میں تو تمہارا دماغ خراب ہے تم نے ایسا سوچا ہی کیسے۔تم سے مجھے اس حماقت کی توقع نہیں تھی زینیا۔۔۔۔۔! سچ تم نے واقعی مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“

میں اس پہ اپنی برہمی ظاہر کررہا تھا لیکن میرے اندر کچھ جل بجھ رہا تھا جیسے کوئی اشارے مل رہے ہوں۔وہ بات بے بات شرمین کا مجھ سے الجھنا، وہ جھنجھلانا میری بے نیازیوں پہ کلسنا، ریشم کے بارے میں تلملا کے ریمارکس دینا اور پھر اب عرصے بعد زینیا نے اس کو اور بھڑکا دیا تھا۔میرا اس کی جانب جھکاؤ شاید وہ بھانپ گئی تھی اور امی جان کے ارادے کی سن گن بھی مل گئی ہو اس لیے اس کی آمد اسے مشتعل کردیتی تھی تو کیا واقعی۔۔۔۔۔سچ مچ شرمین مجھ سے، مجھے سوچ میں دوبارہ دیکھ کے وہ نادم سی ہوگئی تھی۔

”سوری عاشر! شاید اس نے واقعی بغیر سوچے سمجھے کچھ بول دیا تمہیں جو ذہنی کوفت ہوئی، میں اس کے لیے معذر۔۔۔۔۔“

”معذرت بعد میں پہلے یہ بتاؤ یہ تمہیں سوجھی کیسے؟“میں نے اس سے پوچھا۔اصل میں میں خود یہ یقین چاہتا تھا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے۔

”پتا نہیں کیوں بس مجھے ایسا لگا حالانکہ تم نے پہلے بھی کئی بار بتایا تھا کہ تمہارے بھائی جان کے اور اس کے تعلقات ہمیشہ سے خراب ہی رہے ہیں لیکن اس طرف میرا دھیان نہیں گیا کہ ہوسکتا ہے شادی سے پہلے اس کی جذباتی وابستگی کسی اور کے ساتھ رہی ہو لیکن عاشر بالفرض ایسا ہو بھی تو پانچ چھ سال بہت ہوتے ہیں دل کو سمجھانے کے لیے اگر کسی کی یاد بھلانے میں کوئی عورت ناکام بھی رہے تو سمجھوتہ تو کرہی سکتی ہے۔اپنے لیے نہ سہی اپنی اولاد کے لیے ہی سہی۔

لیکن مجھے یہ سوچنا چاہئے تھا کہ تمہارا اس سے رشتہ کیا ہے تم اس سے لاکھ متنفر سہی مگر بہرحال اس رشتے کی اپنی ایک نزاکت ہے، اپنے تقاضے ہیں تمہیں جو کوفت۔۔۔۔۔“

”تم میری کوفت اور جذبات کو مارو گولی۔میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم نے کیا اندازے لگائے۔“

میں نے بے تابی سے پوچھا لیکن اس کی حیران شکل دیکھ کے بات بنائی۔

”آخر مجھے بھی تو پتا چلے تم میں ماہر نفسیات بننے کی کتنی صلاحیت موجود ہے؟“

اصل میں میں خود کو یقین دلانا چاہ رہا تھا کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے میں وہ سب جاننا چاہتا تھا جنہیں اب زینیا وہم قرار دے کے شرمندہ ہو رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بے معنی سے وہم...... ان سے میں کچھ معنی ڈھونڈ ہی نکالوں۔

''تمہارا اپنی بھابھی سے سلوک واقعی کچھ عجیب سا اور ابنارمل ہے۔ اس کے بعد تو کسی عورت کو کم از کم میرے خیال میں اس گھر میں رہنا نہیں چاہیے تھا۔ فوراً اپنے شوہر کو لے کے الگ ہو جاتی لیکن اگر ہزار تلخیوں کے بعد بھی اس نے اتنے سالوں میں ایک بار بھی اپنے شوہر سے یہ مطالبہ نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے اس گھر میں کچھ تو ہے جس کی کشش اسے باہر نہیں نکلنے دے رہی۔ دوسری بات میں نے ابھی کہا تھا نا کہ اگر اس کا تعلق کسی اور سے ہوتا تو بھی شادی کے بعد وہ سنبھل ہی جاتی۔

تیسری بات اس کا شکستہ رویہ اور دل جلا انداز یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اس کی یہ وابستگی یک طرفہ تھی۔ وہ ہمیشہ جلسی ہوئی، سلگتی ہوئی نظر آتی تھی۔ خصوصاً تمہیں سامنے پا کے وہ اور بھی سلگ اٹھتی تھی۔

چوتھی بات...... فہد کا میری طرف جھکاؤ، وہ برداشت نہیں کر سکی۔ لیکن یہی رویہ اس نے تمہارے ساتھ بھی رکھا۔ جب تم نے غصے میں میرے مقابلے میں اس کی چند خامیاں گنوائیں، تمہیں یاد ہے ناں اس نے کہا تھا کہ...... عاشر تم مجھے کبھی خوش نہیں رہنے دو گے۔ تمہارے ہوتے میں خوش رہ ہی نہیں سکتی۔ اس وقت اس کے انداز میں غصہ تھا، نہ طیش صرف بے بسی تھی۔ ہار تھی اور یہ ہار کسی ایسی ویسی جنگ کی ہار نہ تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ خود سے لڑ رہی ہے اور جان بوجھ کے ہار مان رہی ہے۔'' وہ چپ ہو گئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بس یا کوئی پانچویں بات بھی ہے؟''

اس کے نفی میں سر ہلانے پہ میں نے سر فائل پہ جھکا لیا اور بڑے انہماک سے اسے دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ گئی اور میں نے بھی فائل سے سر اٹھا لیا۔ اب میں اپنے کیبن میں اپنے شاطر دماغ کے ساتھ تنہا تھا۔ اس کے وہ چار نکتے میرے ذہن کو نئی راہیں دے گئے۔ مجھ پہ نئے نئے راز منکشف ہونے لگے۔

پہلی بات......

میرا اس سے سلوک واقعی نارمل نہیں تھا لیکن اس کی ایک وجہ تھی اپنی ٹین ایج میں اس کے متعلق اپنے دل میں جو جذبات دیکھ چکا تھا وہ مجھے اس کو بطور بھابھی تسلیم کرنے نہیں دیتے تھے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اس سے شادی کا فیصلہ کرتا یا نہیں۔

اس کے باوجود مجھے بھائی جان سے اس کی شادی ہونا اپنی سبکی لگا۔ ایسے لگا جیسے اس نے مجھے ٹھکرا کے انہیں منتخب کیا ہو۔ فطری سی بات تھی، میری کچی پکی سی محبت بیزاری میں ڈھل گئی۔ مجھے اس کا اپنے گھر میں چلنا پھرنا زہر لگنے لگا۔ وہ جس رشتے میں بندھ چکی تھی اس رشتے کے حوالے سے میں اسے عزت واحترام دینے سے قاصر تھا۔ لیکن اس کا رویہ...... وہ تو واقعی عجیب تھا، حیرانی ہے میں نے کبھی اس پہ غور کیوں نہیں کیا۔ کیا وہ بھی اپنے دل میں میرے متعلق کچھ اور جذبات رکھتی تھی۔ کیا وہ بھی مجھے اس رشتے کے حوالے سے قبول نہیں کر پائی۔

دوسری بات......

دیکھا جائے تو بھائی جان میں کیا کمی تھی وہ خاصے کامیاب بزنس مین تھے۔ فطرتاً شریف اور بھلے مانس انسان تھے۔ شروع کے سالوں میں انہوں نے بیوی کو ٹوٹ کے چاہا بھی تھا۔ ایک خوبصورت سا بچہ اس تعلق کا تحفہ تھا لیکن اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے دل میں شوہر کے لیے جگہ نہیں پیدا کر سکی، اگر مالی آسودگی، وفادار شوہر، صحت مند بچہ بھی اسے اس زندگی کی جانب راغب نہیں کر سکا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اس کے دل کی کسک اسے زندگی کی طرف لوٹنے نہ دیتی تھی۔ اور یہ کسک دینے والا اس سے کبھی دور نہ ہوا تھا۔ ورنہ شاید وہ اسے بھول جاتی۔ اور اس کے پاس ہونے نے اسے سمجھوتوں کے قریب نہ ہونے دیا۔

تیسری بات

چونکہ میرا دل اس کے رشتے کو کبھی تسلیم نہیں کر پایا تھا اس لیے میرے اس سے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ جب ریشم کے معاملے میں اس نے امی جان سے چند طنزیہ باتیں کہیں تو شاید وہ بھی اس کے جذبات کی ترجمان تھیں اس سے برداشت نہ ہوا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے، اسی گھر میں میری من پسند ہستی کو بستا دیکھے۔ اس کا مغرور اور تکبرانہ انداز مجھے وہ چیلنج کرنے پہ مجبور کر گیا تھا کہ میں ہر حال میں اس سے لاکھ درجے بہتر شریک حیات پسند کر کے رہوں گا۔ میرا اس کے لیے کھلم کھلا اظہار ناپسندیدگی اسے واقعی سلگا جاتا ہوگا اسی لیے زینیا کو وہ سلگتی ہوئی، جھلستی ہوئی نظر آتی تھی۔

چوتھی بات......

جس طرح میں نے سب کے سامنے اس کی خامیاں اور زینیا کی خوبیاں گنوائیں اسے لگا اب اس کے پاس امید کی کوئی کرن نہیں رہی۔ اس لمحے وہ بے بسی کی انتہا پہ تھی۔ وہ ہار گئی۔ اپنے جذبات کے ہاتھوں شکست کھائی تھی اس نے اسی لیے اس کا اندر یکا یک عیاں ہو گیا۔ وہ ایک لرزش زینیا کی پکڑ میں آ گئی۔

میں نے اس کی پکڑ کو بے ساختہ داد دی۔ رہا میرا ردعمل تو وہ زینیا کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لیے ضروری تھا۔ میں اس میں کامیاب رہا تھا وہ اپنی انجانے میں کہی بات پہ معذرت طلب کرتی، واپس چلی گئی تھی لیکن میرے لیے ایک دلچسپ کھیل کا آغاز کر گئی۔

زینیا نے ہی میرے اندر کے عاشر ملک کو تھپک تھپک کے سلایا تھا۔ چاہے جانے کا خواہاں عاشر اب چاہنے کا لطف ہی لینے لگا تھا۔ میری خود پسندی اب چپکے چپکے کسی اور کو بھی سراہنے لگی تھی۔ میں اپنی ذات سے نکل کے کسی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

اور وہی زینیا عمر اس دن پھر سے اس عاشر ملک کو جھنجوڑ کے جگا گئی۔ وہ عاشر جس کے لیے چاہے جانا ایک نشہ تھا جسے دوسروں کو روندنے میں مزا آتا تھا جسے خود پر حاوی ہوتے ہر انسان کو کچل دینے کی خواہش تھی۔

اس عاشر ملک نے ایک عجیب سی چال سوچی اور اس پہ عمل کرنے میں ایک دن کی دیر بھی نہ لگائی۔ میری پہلی فون کال پہ شرمین مجھ سے بات کرنے پہ رضامند ہی نہ ہوئی مگر دوسری ہی کال میں جب میں نے اس سے یہ کہا کہ میں اس سے اس کے شوہر کے بھائی کی حیثیت سے نہیں اس دوست کی حیثیت سے بات کرنا چاہتا ہوں جس دوست کے ساتھ اس نے بچپن سے لڑکپن تک کا سفر طے کیا تھا۔ تو وہ نرم پڑ گئی۔ میں نے اسے ہمدردی کے جال میں پھنسایا۔ پہلے اپنے طرز سلوک کی وضاحت کی کہ اس کی وجہ ایسی ہے جس کا ذکر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میری اس بات پہ

چونک کے وہ یہ وجہ دریافت کرنے لگی جسے بڑی خوبصورتی سے ٹالتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا۔

''تم میری وجہ سے اپنی زندگی مت برباد کرو اپنے گھر لوٹ آؤ۔ تمہارے بچے اور شوہر کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں تو بس ایسے ہی بکواس کرتا رہتا ہوں۔ میری وجہ سے تم کیوں......''

''تمہاری وجہ سے...... ہاں تمہاری وجہ سے......'' وہ بڑبڑائی۔ ''صرف اک تمہاری وجہ سے۔''

''دراصل...... اب میں تم سے کیا کہوں۔ اصل میں شرمین مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں، یہ تو ساری قسمت کی بات تھی اور میں تمہیں الزام دیتا رہا اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی سزا دیتا رہا اب تمہیں بھلا کیا پتا تھا کہ......''

میں خود پہ مصنوعی قنوطیت طاری کرتے ہوئے الجھے الجھے ڈائیلاگ جھاڑتا رہا اور وہ ٹریپ ہوتی رہی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو عاشر؟'' اس کے لہجے میں اب واضح ارتعاش تھا ایک ہیجان تھا۔

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میری سب بدتمیزیاں، گستاخیاں بھلا کے گھر لوٹ آؤ۔ تم نے کہا تھا کہ صرف میری وجہ سے تم وہاں خوش نہیں ہو۔ تو دیکھو تمہاری خاطر میں یہ کر رہا ہوں کہ اپنا گھر، شہر سب چھوڑ کے یہاں سے دور جا رہا ہوں اگر میں یہاں رہا تو پھر تمہارے لیے مشکلات کھڑی کروں گا۔ مجھے خود پہ بس نہیں رہتا۔ تمہارے سامنے آنے پہ جو میں غصے سے پھٹ پڑتا ہوں تو یہ غصہ تم پہ نہیں خود پہ ہوتا ہے کہ میں نے تاخیر کیوں کی۔ میں تمہیں ہمیشہ اس گھر میں دیکھنا چاہتا تھا مگر اس حیثیت سے نہیں جس حیثیت سے تم آج یہاں ہو بلکہ...... شرمین یہ نفرت نہیں بلکہ محبت ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میری یہ محبت تمہارے لیے سزا بن گئی ہے۔''

یہ سراسر جھوٹا اظہار محبت کرتے ہوئے نہ میری زبان لڑکھڑائی، نہ دل کانپا، نہ ہی میری گھمنڈی فطرت کو کوئی گزند پہنچا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ سچ بولنے کا صرف سوچتا ہی تھا اور میرے خود ساختہ بت میں دراڑیں پڑنے لگتی تھیں۔ اس وقت اگر میں اس کے سامنے سر جھکائے یہ کچے ریشم کے جال بن رہا تھا تو صرف اس لیے کہ بعد میں اسی ریشم سے مجھے اس کی گردن گھونٹنی تھی۔

''میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، بہت دور۔''

''نہیں...... نہیں...... عاشر! ایسا مت کرو۔'' بس یہ انتہا تھی اس کے ضبط کی...... وہ پھٹ پڑی۔ میں وہ کہہ رہا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا ہوگا میں وہ کہہ رہا تھا جو وہ کبھی کہنے کی ہمت تک نہ کر سکی۔

''نہیں عاشر! خدا کے لیے کہیں مت جانا، میری نظروں سے دور مت ہونا۔ تم نہیں جانتے۔ میں تمہاری وجہ سے وہاں سے واپس نہیں آئی مجھے زبردستی وہاں بھیجا گیا تھا اور اتنے سال میں نے صرف تمہاری وجہ سے وہاں گزارے۔

میں خود سے بھی چھپ چھپا کے تمہیں چاہتی رہی لیکن میرا ضمیر مجھے چین نہ لینے دیتا تھا۔ میں تنگ آ گئی تھی اس لعنت ملامت سے۔ اس لیے وہ گھر چھوڑ دیا۔ یہ تو میں نے سوچا تک نہ تھا کہ تم بھی مجھے چاہتے ہو گے۔''

اس کے اندر سالوں سے پکتا لاوا اُبل اُبل کے باہر نکلتا رہا۔ وہ خالی ہو گئی۔ اب مجھے اپنی مرضی سے اسے بھرنا تھا اور میں نے خوب بھرا۔ وہ

کٹھ پتلی کی طرح میری انگلیوں کے اشارے پہ ناچتی رہی۔ صرف ایک باراس کے قدم ڈگمگائے جب میں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ فہد سے دستبرداری کا تحریری بیان دے۔

''سمجھا کروشرمین! باقر بھائی جان کو کبھی بھی تم سے دلچسپی نہیں رہی لیکن فہد کی وجہ سے وہ طلاق دینے میں پس وپیش سے ضرور کام لیں گے۔ابھی لوہا گرم ہے لیکن وقت گزرتا گیا توان کا ٹھنڈا پڑتا غصہ مصالحت کی راہ نکالنے کے لیے سوچنے لگے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ طلاق کا مطالبہ صرف تمہاری وجہ سے ہو۔ بلکہ اسے تم دونوں کی جذباتی اور وقتی جلد بازی کا نتیجہ سمجھا جائے گا۔ بعد میں میں خاندان کی بھلائی اور فہد کی بہتری کی خاطر تم سے شادی کرلوں گا۔

تم فہد کی خاطر ایک دوبار خودکشی کی ناکام سی کوشش کرنا۔امی موم ہوجائیں گی۔ میں تم سے شادی کرکے فہد کواور تمہیں لے کر باہر کہیں سیٹل ہوجاؤں گا۔میں فہد کا چچا ہوں، بھائی جان اورامی جان اسے بخوشی میرے حوالے کردیں گے۔''

اوراس نے میرے کہنے پرعمل کیا۔سب کچھ میری خواہش کے مطابق ہو چکا تھا۔شرمین اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوگئی تھی۔

زینیا کے دل سے میں نے یہ شک فوراً ہی رفع دفع کردیا تھایوں بھی اپنی تمام تر ذہانت اور معاملہ فہمی کے باوجودوہ بنیادی طور پرایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔شایداس کے اپنے اُصول پرست دماغ نے یہ ساری کہانی قبول نہ کی ہوگی۔ کیسے ایک شادی شدہ عورت، اپنے ہی دیور کے عشق میں......وہ کیا جانتی تھی کہ کہانیاں سچ سے بھی بن جاتی ہیں توایک آدھ عورت شرمین جیسی بھی ہوتی ہے۔رشتوں میں ڈنڈی مارنے سے نہ چوکنے والی بھی۔

فہد بھی میری توقع کے مطابق جلد ہی بہل گیا تھا۔اس کے ساتھ امی نے بھی زینیا کودل میں جگہ دے دی تھی۔ مجھے لب کھولنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی اوروہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

''اب میں تمہاری شادی کا سوچوں تو ذہن میں بس ایک ہی نام آتا ہے......زینیا......اس کے سوااب کچھ سوجھتا ہی نہیں۔''میں سن کے مسکرادیا۔

''میری بات کا جواب دو۔زینیا کے بارے میں تمہاری کیارائے ہے؟''

''میری کیارائے ہونی ہے۔''میں نے شانے اچکائے۔''حالات اورہوتے تو میری رائے بھی اور ہوتی لیکن آپ کی اس بات سے میں بھی متفق ہوں کہ اس گھر کوزینیا جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ بہت عرصہ آپ نے گھرداری میں جان کھپالی۔فہد کے لیے بھی زینیا سے بہتر کوئی اورنہیں ۔ٹھیک ہے امی جان، اس گھر کی بہتری کے لیے آپ نے جوسوچا ہے، اچھا ہی سوچا ہوگا۔''

''یہ کیابات ہوئی گھر اورفہد کے علاوہ زینیا تمہارے لیے بھی تو مناسب ہے تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے......''

''ایک ہی بات ہے امی جان! میں کیا اس گھر سے الگ ہوں۔''

نہ جانے کون سی بات تھی جو مجھے ماں تک کے آگے کھلنے نہ دیتی تھی کاش......کاش......میں تب اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کے کہہ دیتا۔

''آپ کتنی اچھی ہیں امی، آپ نے کیسے میرے دل کی بات چرالی۔ زینیا سے اچھی لڑکی مجھے مل ہی نہیں سکتی۔ میں تو ہمیشہ سے یہی چاہتا تھا۔''

مگر میں نے یہ نہ کہا۔ میں تو اپنے ہی دل کی خوشی کا سامان بھی کر رہا تھا اور دماغ کو بھی سیر کر رہا تھا کون کہتا ہے کہ دل اور دماغ دونوں کی ماننا ناممکن ہے۔ میرا دل چاہتا تھا...... زینیا کو خود سے وابستہ دیکھنا۔ میں نے پوری ہشیاری اور پلاننگ سے اس کے امکان پیدا کیے، میرا دماغ کہتا تھا، عاشر کسی کے سامنے کمزور مت پڑنا۔

محبت کو چونکہ میں کمزوری سمجھتا تھا اس لیے کبھی یہ اعتراف نہیں کیا کہ مجھے زینیا سے محبت ہے۔ میں خود کو بھی بار بار یہ باور کراتا کہ بہت سی بہترین چیزوں میں ایک اور بہترین کا اضافہ کرنے کے لیے مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں دل کی بھی مانتا رہا اور دماغ کی بھی سنتا رہا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ قسمت نے کب وار کیا......

ہاں ایک تیسری چیز بھی تو ہوتی ہے جو دل اور دماغ دونوں کے فیصلوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ وہی بادشاہ، وہی وزیر...... اور قسمت نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''شکر ہے، میرے خدا نے نہ مجھے کسی امتحان میں ڈالا اور نہ تمہیں۔''

شام کو زینیا کے گھر سے واپس آنے کے بعد امی نے میرے نزدیک بیٹھتے ہی کہا۔ میں خاموشی سے اخبار پڑھتا رہا۔ کسی بے تابی کا اظہار کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔

''تم نے تو اس بے دلی سے زینیا کے لیے ہامی بھری کہ میرا دل ہی اتھل پتھل ہو گیا تھا۔ یہ تمہاری سعادت مندی تھی کہ ماں کا دل رکھنے کو ہاں کر بیٹھے، فہد کی محبت میں اسے ایک ماں دینے کے لیے تیار ہو گئے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے روکھے پھیکے انداز اور ڈھیلی سی ہاں نے میرا دل بھاری کر دیا تھا۔''

''یہ آپ کیا باتیں لے بیٹھیں۔''

مجھے حقیقتاً ان کی تمہید خوفزدہ کرنے لگی تھی۔

''اور کیا بیٹا! تمہاری من مانی کرنے کی عادت سے میں خود نالاں رہتی تھی لیکن ماں ہوں نا...... دل پسیج گیا تمہیں چپ چپ دوسروں کے لیے من مارتا دیکھ کے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ آپ نے اس سے بات کی یا نہیں......'' میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے ان سے اصل بات اگلوانا چاہی۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ تم دل سے راضی ہوتے تو تمہارے لیے زینیا کی پھوپھی سے بات کرتے ہوئے میں یوں نادم نہ ہوتی۔ دل پہ بوجھ سا تھا۔

خیر میں نے ان سے تمہارے لیے زینیا کا ہاتھ مانگا، وہ تو ظاہر ہے خوشی سے نہال ہو گئیں لیکن رسمی طور پر زینیا سے بات کرنے کا وقت مانگا۔''

میں نے سکون بھی سانس لی۔ امی جان تو مجھے ڈرائے دے رہی تھیں لیکن شکر ہے کہ وہ بات کر ہی بیٹھیں۔ ورنہ انہیں دوبارہ بھیجنے کے لیے رضامند کرنے میں مجھے اپنے خول سے باہر آنا پڑتا۔ رہا زینیا سے پوچھنے کا مرحلہ تو اس کے با آسانی نمٹنے کی مجھے سو فیصد اُمید تھی۔ بھلا مجھ میں ایسی کیا

خامی تھی جو وہ انکار کرنے کی حماقت کرتی اور میں نے اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی پسندیدگی بھی تو کئی بار بھانپی تھی۔ اور اس کی وہ بھیگی بھیگی سی مسکراہٹ جس کے لبوں پہ پھیلتے ہی مجھے اپنی ہتھیلیاں نم محسوس ہتیں۔ ایسا لگتا جیسے اس نے ہولے سے اپنی نازک انگلیوں سے میرا ہاتھ سہلایا ہو، وہ تبسم وہ لمس، وہ نمی، وہ احساس، سب بے معنی تو نہیں ہو سکتا۔ میں بے فکر ہو کے نیم دراز ہو گیا اب مجھے امی جان کی مزید گفتگو میں دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ بولتی رہیں

''اب وہ زمانے تو نہیں رہے پھر خود ماشاء اللہ سمجھدار اور خود مختار لڑکی ہے وہ پوچھنے پچھانے کی رسمیں وضع داری نبھانے کا ایک طریقہ ہوتی ہیں۔ زینیا میں حیا بھی ہے، وقار بھی اور رکھ رکھاؤ بھی۔ اس لیے جب وہ اسی وقت، اپنی پھوپھی کے سامنے ہی مجھ سے اس رشتے پہ بات کرنے چلی آئی تو میں ذرا حیران نہ ہوئی نہ کوئی غلط گمان کیا......''

''کیا کہا اس نے......؟'' مسکراتے ہوئے میں نے پوچھا۔ میں اس کا جواب جانتا تھا لیکن اپنے کانوں سے سننا چاہتا تھا۔

''اس لڑکی کی سمجھداری کی میں قائل ہو گئی۔ کہنے لگی اگر آپ فہد کی وجہ سے مجھے لے جا رہی ہیں تو میں بھی صرف فہد کی وجہ سے ہی آپ کی بہو بننے پر تیار ہوں۔''

امی کی زبانی اس کا جواب سن کے مجھے دھچکا لگا یعنی وہ شادی کے لیے ہامی بھر کر مجھ پہ احسان کر رہی تھی۔

''اور پھر کہنے لگی کہ اگر فہد ہی اس شادی کی وجہ ہے تو آنٹی کیوں نہیں آپ مجھے سچ مچ فہد کی ماں بنا دیتیں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ تمہارے بجائے باقر سے شادی کرنا چاہتی ہے وہ بھی اگر باقر راضی ہو تو......''

امی کا یہ کہنا مجھے دھڑا دھڑ نیچے گراتا چلا گیا۔ میں نے شدت سے اپنے اس بھائی سے نفرت محسوس کی جس نے اس کھیل میں حصہ لیے بغیر دوسری بار مجھے ہرا دیا تھا۔

''سچ پوچھو عاشر! تو میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی لیکن زینیا اتنی بھلی لڑکی ہے اس کے سامنے اپنے شادی شدہ بیٹے اور ایک بچے کے باپ کا رشتہ لے جاتے میں ہچکچا رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے اس نے میری مشکل آسان کی۔

زینیا نے خود ہی باقر کے حق میں فیصلہ دے دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فہد کے لیے کتنی سچی ہے۔ اس کے لیے اس نے گھر آئے بہترین رشتے کو مسترد کر دیا تاکہ ممتا کی کسوٹی پہ پوری اتر سکے۔ میں تو شکرانے کے نفل ادا کروں گی۔''

وہ اٹھ گئیں لیکن مجھے توہین اور ذلت کے احساس سے سلگتا چھوڑ گئیں۔

''زینیا عمر! یہ تم نے اچھا نہیں کیا...... میرے بھوکے نفس کے آگے سے روٹی اٹھا لی۔ اور بھوکا شیر کتنا خطرناک ہوتا ہے تمہیں اندازہ ہی نہیں۔ آخر تم نے ایسا کیوں کیا۔ کس لیے......؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

''یہ سوال میں تم سے نہیں کروں گا کبھی بھی نہیں۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی۔ میرے دل میں کیا تھا۔ مجھے تمہاری قسمت پہ افسوس ہو رہا ہے زینیا! تم نے بڑے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ عمر بھر کی ذلت، پچھتاوا اور محرومیاں خرید لی ہیں، یہ تمہیں وقت بتائے گا۔ میں نہیں بتاؤں گا۔''

میں نے تہیہ کر لیا تھا کل آفس میں اس سے معمول کے مطابق ملوں گا۔اپنے رویے سے کسی طور پہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ مجھے اس کے فیصلے سے کوئی فرق پڑا ہے، نہ اچھا نہ برا۔اس سے کسی قسم کی جواب طلبی نہیں کروں گا لیکن میں اس کی سزا ضرور دوں گا۔

میں نے خود کو خدا تصور کیا اور سزا اور جزا دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ایک ذلیل سا منصوبہ بنانے لگا یہ جانے بغیر کہ اوپر جو خدا بیٹھا ہے۔

☆☆☆

اُردو تنقید کا اصلی چہرہ

اردو تنقید کا اصلی چہرہ عارفہ صبح خان کا ایم فل کے لیے لکھا گیا ایک تحقیقی مقالہ ہے اور اس میں درج ذیل ابواب/موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔موضوع کا تعارف، مفروضات......تحدید بندی، زیر تحقیق موضوع کی اہمیت، تنقید کی داغ بیل، ابتدائی تنقید کے نقوش، تنقید کے معانی و مقاصد، تنقید کی اقسام، تنقید کے بنیادی اصول، نقاد کا منصب، اردو تنقید کا آغاز و ارتقاء، اردو تنقید کا وجود، اردو تنقید کا منبع و ماخذ، اردو تنقید کے عناصر خمسہ، مولانا حالی......اردو تنقید کے بانی، اردو تنقید کا چلن، اردو تنقید کا عبوری دور، عبوری تنقید کے سات برج، اردو تنقید انگریزی کے زیر اثر، اُردو تنقید کے دبستانوں پر تنقید، دبستان کی اصطلاح، ضرورت و اہمیت، تنقید کے مختلف طبقہ ہائے فکر، تنقیدی دبستانوں کی اقسام، عمرانی تنقید، تاثراتی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاریخی تنقید، نفسیاتی تنقید، رومانی تنقید، مارکسی تنقید، تقابلی تنقید، تشریحی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ہیئتی تنقید، ساختیاتی تنقید، آرکی ٹائپل تنقید، تنقید کی منزلیں، ہندوستان میں تقسیم سے پہلے اور بعد کی تنقید، آزادی کے بعد پاکستان میں تنقید، اردو نقادوں کے رویے اور رجحانات، میراجی......پیکر خاک میں لطیف روح اور تنقیدی ذہن، اختر حسین رائے پوری......ادب، انقلاب اور ترقی پسندی کا داعی، محمد حسن عسکری......نظریات پر نظر رکھنے والا مباحث کا خوگر!! کلیم الدین احمد......مغربی تیشہ سے مشرقی ادب کھودنے والا، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی......تنظیمی و تخلیقی اصولوں کا خالق، پروفیسر جیلانی کامران......جدید اور قدیم علوم کے سنگم پر تنقید، ڈاکٹر وحید قریشی......تنقید و تحقیق کا بہتا ہوا سرچشمہ، ڈاکٹر وزیر آغا......سائنسی نقطہ نظر اور نئے زاویے تراشنے والا، ڈاکٹر سلیم اختر......نباض، نکتہ رس، دیدہ ور، نفسیات پسند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ......جدید ترین تنقید کا متعارف کنندہ، جدید ترین تنقید پر تنقیدی نشانات، ساختیات کی تعریف اور مباحث، پس ساختیات اور اس کے ادوار، تشکیل رد تشکیل، لسانیات اور شعریات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، تنقید......حدود و امکانات، معیاری ادبی تنقید کی ضرورت، کیا اردو تنقید عالمی معیار پر پرکھی جا سکتی ہے؟ اردو تنقید اکیسویں صدی میں، کیا تنقید سائنس ہے......؟؟؟ اردو تنقید کا جائزہ اور نتائج

''ڈیڑھ سو روپیہ۔''

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی اور ڈرائیور نے کرائے کی رقم بتائی۔ مجھے اسی وقت احساس ہوا کہ میرے پاس پاکستانی کرنسی نہیں تھی۔ میں پریشان ہوا تھا۔

''میرے پاس تو صرف ڈالرز ہیں چلیں گے۔''

''نو سر!'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''بڑا لمبا جھنجھٹ ہے۔''

''ڈیڑھ سو سے اُوپر بنے گا۔'' میں نے چند ڈالرز اس کے آگے لہرائے وہ ہنوز انکاری تھا۔

''سر! آپ اندر سے پتا کر لیں۔''

''اندر......'' میں نے گرے بڑے سے گیٹ کے اندر جھانکا۔ باہر کھڑا گیٹ کیپر میرے لیے نیا تھا۔ میں نے گیٹ کے اندر جھانکنا چاہا بڑا سا کار پورچ خالی تھا۔ یقیناً بھائی جان گھر پہ نہ تھے۔ کچھ سوچ کے آگے بڑھا۔ گارڈ سے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس سے ڈیڑھ سو روپیہ طلب کیا۔

''ام کو کیا کھبر، تم کون اے۔ کھامخواہ تم کو ڈیڑھ سو روپیہ دے دیں۔ ام کو پاگل واگل سمجھا ہے۔'' اس نے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔

گیٹ کیپر نے میرے کہنے پہ انٹر کام پہ اندر سے کسی کو بلایا ایک آیا ٹائپ عورت باہر نکلی، وہ بھی میرے لیے ناآشنا تھی۔

''باجی! یہ صاحب کھود کو بڑے صاب کا بھائی بتاتی ہے۔''

''ہاں، ہاں میں نے ان کی تصویر اندر لگی دیکھی ہے۔ فہد کے کمرے میں بھی اور بڑے ہال کمرے میں بھی آئیں صاحب! اندر آئیں۔'' مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب تک میرا چہرہ، میرا وجود اس گھر کے مکینوں کے لیے اپنا ہے۔ اسی ملازمہ نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور مجھے اندر لے آئی۔

''صاحب آپ کا کمرہ روز صاف ہوتا ہے لیکن چابیاں بڑے صاحب کے پاس ہیں، وہ ایک ٹور کے سلسلے میں کراچی گئے ہیں، آج لوٹیں گے۔ فہد بابا سو رہے ہیں۔ آپ فی الحال گیسٹ روم میں آرام کیجیے۔ صاحب ناشتا، چائے۔''

''صرف ایک کپ کافی۔'' میں کہہ کر اندر چلا آیا۔ گھر میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں اور بہت سی چیزیں اب تک ویسی تھیں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو گھر کی ظاہری حالت میں اب پہلے سے کہیں بڑھ کے امارت اور آسودگی ٹپک رہی تھی۔

''یہ کس کی توجہ کا حاصل ہے......'' میں نے گھوم پھر کے اعلا درجے کے نفیس اور قیمتی شاہکاروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پہلے ہی دولت کی کمی تھی، نہ خوش ذوقی کی۔ مگر امی جان کی سادگی زیادہ شوشا کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اب وال ٹو وال بچھے گہرے رنگوں کے کارپٹ، ڈیزائنر فرنیچر، قیمتی فانوس اور امپورٹڈ ڈیکوریشن پیسز۔

''کہیں باقر بھائی جان نے دوسری شادی تو نہیں کر لی۔'' پہلا خیال مجھے یہی آیا۔

''لیکن نہیں، ملازمہ نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا جس سے یہ اندازہ ہوتا۔'' میں نے خود ہی خیال رد کر دیا۔

''ضرور بھائی جان کی تنہائی نے گھر کی ویرانی کو دور کرنے کے لیے یہ مصنوعی اور کھوکھلے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔''

میں ایک نتیجے تک پہنچ گیا۔ پورے استحقاق کے ساتھ میں پورے گھر میں گھوم پھر کے جائزہ لے رہا تھا۔ ایک کپ گرم کافی نے بھی سفر کی ساری تکان زائل کر دی۔ امی جان کے کمرے کے بند دروازے کے آگے میں ٹھٹھک گیا۔ ہاتھ کے ہلکے سے دھکیلنے پہ دروازہ یوں کھل گیا جیسے میرے چھونے کا انتظار کر رہا ہو۔

سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، وہی امی جان کے جہیز کا بڑا سا بیڈ، اس پہ بچھی سفید دودھ جیسی بے شکن چادر۔ امی جان کی وہی پسندیدہ رضائی، میری خشک بنجر آنکھوں کے فرش پل میں گیلے ہو گئے۔ میں نے کمرے کی دیوار پہ لگی اپنی اور باقر بھائی جان کی تصویروں کو دیکھنا چاہا۔ سب ویسی ہی ویسی تھیں وہی تھیں ان میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔

اچانک میری نظر بائیں طرف والی دیوار پر لگی امی کی بڑی سی تصویر پہ پڑی۔ یہ تصویر اس کمرے میں نیا اضافہ تھا میں بے جان قدموں کو گھسیٹتا اس تصویر کے آگے کھڑا ہو گیا۔ امی کے چہرے پہ آسودگی تھی۔ آنکھوں میں خواب تھے اور کھٹنائیاں پوری کرنے کا سرور بھی۔ یہ تصویر باقر بھائی جان کی شادی کے موقع پر کھینچی گئی تھی اور تب آخری بار میں نے انہیں اتنا شاد و مطمئن دیکھا تھا۔ وہ کیا جانتی تھیں کہ یہ شادی...... پتا نہیں یہ تصویر یہاں کب لگائی گئی۔ اپنی زندگی میں تو وہ کبھی ایسا نہ کرنے دیتیں۔ شاید یہ تصویر بھائی جان نے ان کے جانے کے بعد لگائی ہو۔

ان کی وفات کی خبر مجھے تب ملی جب انہیں گزرے دو ہفتے ہو چکے تھے اور مجھے نیویارک آئے ڈیڑھ سال ہو رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد کتنا عرصہ میں اس ڈر سے چھپا چھپا رہا کہ کوئی مجھے کھوج نہ نکالے۔ کئی بار جاننے کی خواہش دل میں ابھری کہ ایک بار پتا تو کروں وہاں سب کیسے ہیں، میرے جانے کے بعد کیا ہوا لیکن کسی انہونی کے خدشے سے دبک کے بیٹھ جاتا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں جب میرا ضمیر خود ہی مجھے کوڑے مار مار کے تھک گیا اور میری بزدلی جسے میں ہمیشہ اپنا غرور سمجھتا رہا دم توڑ گئی تو میں نے ہمت کر کے پاکستان کی خیر خبر لینا چاہی اور پہلی خبر جو ملی وہ یہ تھی کہ امی جان کو گزرے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ یہ خبر اتنی اندوہناک تھی میرے لیے کہ دوبارہ کبھی کسی خبر کو جاننے کی آرزو کبھی دل میں نہ جاگی۔

میں نے آہستہ آہستہ تصویر پہ اپنی انگلیاں پھیریں۔

''مجھے معاف کر دیں امی! میں آپ کے پیار کے قابل نہ تھا۔ میں بدنصیب تھا جو سب ٹھکرا رہا تھا۔ دعائیں بھی، وفائیں بھی۔ اور ایک وقت آیا کہ دعاؤں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ وفاؤں نے خود مجھ سے منہ موڑ لیا۔''

اور یہ سچ تھا مجھے دعا دینے والے لب کب کے خاموش ہو چکے تھے مجھ سے وفا کا عہد کرنے والے ہاتھ اب مجھے کچھ بھولے بسرے عہد یاد دلا رہے تھے۔

ہر شخص میں ڈھونڈتا ہوں خود کو
شاید میں کسی میں کھو گیا ہوں
اب تیرا وصل رائیگاں ہے
میں کب کا اداس ہو چکا ہوں

اندھا ہوں پکڑ لے ہاتھ میرا

اے ہجر کی شب، میں بے عصا ہوں

خوش ہوائے بلندیوں کی خواہش

میں نوک سناں پہ سج گیا ہوں

دریا کو شکست دی ہے میں نے

مشکیزے میں پیاس بھر رہا ہوں

کرتا ہے کون قبول مجھ کو

کٹے ہوئے ہاتھ کی دعا ہوں

سچ یہ ہے کہ اجنبی ہوں خود سے

کہنے کو میں سب سے آشنا ہوں

یہ چند اشعار...... یہ غزل گزرے ان برسوں میں میں نے اتنی بار پڑھی تھی کہ اب اس کے مصرعے وقت بے وقت میرے اندر گونجتے رہتے۔ میں نے سچ مچ اپنے مشکیزے میں پیاس ہی تو بھری۔ اپنے ہاتھوں صحرا خرید کرلایا تھا۔

ماں کس کی سدا جیتی رہتی ہے لیکن میں ان بدنصیبوں میں سے تھا جنہیں ماں کا آخری دیدار تک نصیب نہیں ہوتا۔ جنہیں اپنی ماں کے گزرنے کے کئی دنوں بعد پتا چلتا ہے کہ ان سے کیا چھینا جا چکا ہے۔

☆☆☆

''چاچو! آپ میرے چاچو ہیں......؟''

جاگنے کے بعد جیسے ہی فہد کو میرے آنے کی خبر ملی تو وہ دوڑ کے میرے کمرے میں آ گیا۔

''فہد، میرا فہد، چاچو کا فہد۔''

میں نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ کیا وقت تھا، جب یہ جان کر کہ زینیا نے مجھ پر باقر بھیا کو صرف ضد کی وجہ سے فوقیت دی ہے مجھے اس معصوم بچے سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اس بچے سے جو دنیا کی واحد ہستی تھی جس سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے میں کبھی ہچکچایا نہیں۔ یہ نفرت بھلے ہی بس ایک لمحے بھر کی تھی لیکن پچھلے کئی سالوں سے میں اس ایک لمحے کے ہونے پہ پچھتاتا رہا۔ شرمندہ رہا۔ شاید میں عمر بھر اسے ٹوٹ کر چاہنے کے بعد بھی اس ایک بدصورت لمحے کا ازالہ نہیں کر سکتا تھا۔

کتنی ہی دیر میں اسے بازوؤں میں بھینچے، سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ وہ دس گیارہ سال کا دبلا پتلا بچہ بھائی جان کی طرح لمبا سا تھا۔ میرے شانوں سے اوپر آتا۔ وہ میرے احساسات کو نئے نئے پیراہن اوڑھاتا رہا۔ اس کی تیز دھڑکنیں میرے سینے میں یوں دھک دھک کرتی مدغم ہو رہی تھیں جیسے اس کا دل میرے اندر گھس آنا چاہتا ہو۔

''کیا ابو جان بھی مجھے سینے سے لگا کے ایسے ہی محسوس کرتے تھے۔''

میں نے اس کی آرمی کٹنگ والے بکھرے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

اسے آہستگی سے خود سے الگ کرتے ہوئے میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کے غور سے دیکھنا چاہا، میرے دل پہ ایک گھونسہ سا لگا۔ وہ کھوئی کھوئی آنکھوں والا بچہ، بچپن کو کہیں دور چھوڑ آیا تھا۔ اس کی سنجیدگی وقت سے کہیں پہلے سرپٹ بھاگ کے اس کے پاس آ پہنچی تھی۔ شاید ان سب کا بھی ذمہ دار میں ہی ہوں۔

وہ میرے پاس بیٹھا میرے چھوٹے چھوٹے سوالوں کا جواب دینے لگا۔ بھائی جان کے متعلق، ان کے بزنس کے بارے میں، اپنے اسکول کی باتیں، تعلیمی ریکارڈ وغیرہ، جب میں نے اس سے، اس کے دوستوں کے بارے میں پوچھا تو جیسے وہ شروع ہی ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار دلچسپی کے رنگ دیکھے۔ اس کے بہت سے دوست تھے اور اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اس کے دوست میرے دوستوں کی طرح محض ٹائم پاس نہیں تھے۔ ان کے لیے محبت اور خلوص اس کے لہجے سے ٹپک رہا تھا۔ رشتوں کی کمی نے شاید اسے دوستی کے سہارے تلاشنے پہ اُکسایا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی پرجوش گفتگو سنتا رہا اور خود کو ملامت بھی کرتا رہا۔

☆☆☆

''عاشر ملک! فہد کی زندگی مکمل ہونے جا رہی تھی۔ اس کو ماں ملنے والی تھی، صرف نام کی نہیں، بلکہ سچ مچ کی ماں...... شاید گزرتے برس اسے بہن بھائی کے رشتے بھی دے جاتے لیکن تم نے سب اس سے ایک جھٹکے میں چھین لیا۔ ایک بار اس کی ماں تم نے اس لیے الگ کی کہ وہ تمہیں پسند نہ تھی اور دوسری بار تم نے اس کی ماں اس لیے چھینی کہ وہ تمہیں پسند تھی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو عاشر؟'' امی جان میری ہرزہ سرائی پہ دنگ رہ گئیں میں نے بات بھی تو انہیں پریشان کن حد تک حیران کر دینے والی کی تھی۔

''بات یہ ہے امی جان! کہ...... سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے کہوں۔ اگر زینیا کے بارے میں آپ اتنی سنجیدہ نہ ہوتیں تو شاید میں کبھی اس کی ذاتیات میں دخل نہ دیتا۔ وہ میری کولیگ ہے اور آفس ٹائم میں ہم اچھے دوستوں کی طرح رہتے ہیں، فہد سے اس نے اپنی انسیت ظاہر کی تو میں نے اس کے گھر آنے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا لیکن آپ کے اسے بہو کے طور پر منتخب کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس کے بارے میں کچھ تو چھان بین کرنا چاہئے۔ زمانہ بہت خراب ہے امی جان، لوگ ہزار چہرے ایک چہرے پہ سجا کے ملتے ہیں۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو، سیدھی طرح کہو؟''

''اس سے پہلے بھٹی صاحب نے اور مس انیتا دونوں نے اس کے بارے میں کچھ اندیشوں کا اظہار کیا تھا لیکن میں نے اسے پروفیشنل جیلسی جان کے جھٹلا دیا۔ اور پھر امی بڑے باوثوق ذرائع سے مجھے علم ہوا ہے کہ اس کا اپنے بھائیوں سے جھگڑا وہ نہیں جو اس نے مشہور کر رکھا ہے اصل بات کچھ اور ہے بدنامی کے خوف سے اس کے گھر والوں نے اس سے قطع تعلق کر رکھا ہے۔ اس کے نام پہ تھوکتے ہیں وہ۔''

اور میری اتنی بات پہ ان کا حیران ہونا تو لازم تھا۔ میں نے اسی پہ اکتفا نہ کیا۔

''اور وہ لڑکا جسے وہ اپنا سوتیلا بھائی بتاتی ہے اس کا اپنا بچہ تھا۔ کچھ پتا نہیں، جائز یا ناجائز اس کے باپ نے اسے جائیداد سے بے دخل کر دیا تھا۔ یہ بنگلہ، یہ کار، یہ سابق ایم این اے سے تعلقات کا نتیجہ ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس نے تمہارے کان بھرے ہیں۔ میں بات کرتی ہوں زینیا سے۔'' میں نے فوراً انہیں روکا۔

''اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔ بھلا چور اپنی چوری تسلیم کرتا ہے۔ میں مکمل تصدیق کر کے یہ بات آپ سے کر رہا ہوں۔ آپ کی مرضی۔ یقین نہ کریں اور بیڑا غرق کر لیں اس گھر کا۔ جو کمی شرمین کی جانب سے رہ گئی تھی وہ اب پوری ہو جائے گی۔''

میری وارننگ پہ وہ متفکر سی بیٹھی رہ گئیں۔ ظاہر ہے انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی، زمانہ شناس نہ سہی مگر اچھے برے کی کچھ پہچان تو تھی۔ اور پھر اچھائی کی تو اپنی مہک ہوتی ہے۔ کیا یہ مہک انہوں نے زینیا سے محسوس نہ کی ہوگی۔ کی ہوگی تب ہی اپنے سگے بیٹے سے اتنے باوثوق الزام سننے کے بعد بھی وہ مکمل طور پہ یقین نہ کر پا رہی تھیں اور دوسری طرف ایک ماں ہونے کے خدشے تھے۔ وہ الجھ گئی تھیں۔

فی الحال میرے لیے اتنا کافی تھا، میری اگلی ضرب پہلے سے بڑھ کے کاری تھی اور اس کا بھی میں نے پورا انتظام کر رکھا تھا، ایک جاننے والے فوٹوگرافر کے ذریعے میں نے زینیا کی ان تصاویر کو، جو پچھلے نیو ائیر فنکشن میں لی گئی تھیں ایسے ایسے انداز دیے تھے کہ امی جان تو دیکھتے ہی اس پہ لعنت بھیج دیتیں۔ احتیاطاً میں نے ان تصاویر کی ایک کاپی باقر بھائی جان کے لیے بھی بنوالی تھی تاکہ ان کی غیرت کو بھی درجہ ابال تک لے آؤں۔ کل صبح تک ان تصاویر کو امی جان اور بھائی جان کے پاس پہنچانے کا مکمل انتظام کر کے میں بڑا مطمئن بڑا فاتح سا بن کے زینیا کی طرف چل پڑا تھا۔

میں اسے یہ بتا نہیں سکتا تھا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ میں اسے یہ بھی نہیں دکھا سکتا تھا کہ دیکھو میں جیت گیا لیکن میں یہ دیکھ کے دل ہی دل میں ہنس تو سکتا تھا کہ مجھ سے ہارنے والی وہ عام سی لڑکی خود کو مجھ سے جیتتا ہوا جان رہی ہے۔

☆☆☆

''کیسے آنا ہوا......؟''

میں جو نارمل طریقے سے اس سے ملنے کے ارادے باندھ بیٹھا تھا اس کے پہلے ہی سوال پہ گڑبڑا گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی وہ بڑی بے رخی سے مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

اس کے تنے تنے چہرے پر کچھ پا لینے کا یا حاصل کر لینے کا سرور نہیں تھا جس کا میرے اندر طوفان سا اٹھا۔

''بات کیا ہے، تم اتنی اُکھڑی اُکھڑی کیوں ہو؟'' وہ خاموش رہی لیکن ایک طرف ہٹ کے اس نے گویا مجھے اندر آنے کی اجازت دیدی۔ اب وہ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھی اپنی انگلیاں مسل رہی تھی مجھے اپنے دل پہ چٹکیاں سی بھرتی محسوس ہوئیں۔ پتا نہیں اس کی مسکراہٹ کا میرے ہاتھوں سے اور اس کے ہاتھوں کا میرے دل سے یہ کیسا رابطہ تھا۔ سینہ مسلتے ہوئے میں نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

''عاشر! اب ہم کسی اور رشتے سے وابستہ ہونے جا رہے ہیں، مجھے تمہاری کمپنی میں کام کرنا مناسب محسوس نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں ریزائن کر رہی ہوں اور جب تک اس نئے رشتے کو واضح شکل نہیں مل جاتی ہمارا ملنا مناسب نہیں۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آخر ہم اچھے دوست ہیں۔ یہ نیا رشتہ ہماری دوستی پہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ان فیکٹ میں تو تمہیں مبارکباد دینے آیا تھا۔'' میں نے پر اسرار طریقے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دوستی گزرے کل کی بات تھی۔'' اس کے روکھے انداز پہ میں نے ٹنک کے پوچھا۔

''کیوں، یا پھر میں یہ سمجھوں کہ وہ دوستی آنے والے کل کو ہموار کرنے کے لیے کی گئی تھی۔'' وہ تڑپ اٹھی میرے الزام پہ۔

''میں تمہیں ایک اچھا انسان سمجھ بیٹھی تھی، اس لیے تم سے......''

وہ لب کاٹتے ہوئے رک گئی۔ پھر اس اچانک وقفے کے بعد سنبھل کے بولی۔ ''تم سے دوستی کر لی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر گھناؤنے کردار کے مالک ہو۔''

''واٹ ڈو یو مین...... '' میں غصے سے کھڑا ہو گیا۔

''اگر میں اتنا ہی گھناؤنا ہوں تو پھر صرف میرے رشتے سے انکار کرنے پہ ہی کیوں اکتفا کیا۔ میرے بھائی کو بھی ٹھکرا دیتیں۔ لیکن نہیں زینیا عمر! تم ایک سود خور ذہنیت کی مالک عورت ہو۔ پچھلے دس بارہ سالوں میں وہ اپنی ایک حیثیت بنا چکے ہیں جب کہ میں ابھی ہاتھ پیر مار رہا ہوں اور سود کے طور پر تمہیں ایک ایسا شوہر بھی مل رہا ہے جو تمہارے احسان کے بوجھ تلے دب کے ہمیشہ تمہارے تلوے چاٹتا رہے گا۔''

''بکواس کر رہے ہو تم۔'' پہلی بار میں نے اسے اس قدر جارحانہ انداز میں دیکھا۔

''تم سے شادی نہ کرنے کی وجہ بھی اور تھی اور باقر کے لیے ہامی بھرنے کی وجہ بھی اور ہے۔''

''تم اس قدر گندے، بددیانت اور مکروہ انسان ہو کہ تم نے اپنے بھائی کی زندگی میں زہر گھولتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس نہ کی۔ ایک ایسی عورت سے ناجائز تعلقات رکھنے میں تمہیں کوئی خوف خدا نہ آیا جو شرعی، اخلاقی ہر لحاظ سے تمہارے لیے محترم تھی۔ تم نے اپنے

کردار کی گندگی چھپانے کے لیے اپنے اور اس کے رشتے پہ اختلاف کے پردے ڈالے رکھے تا کہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔ جس چار دیواری کے اندر اور جس چھت کے نیچے ایسے شرمناک کھیل کھیلے جاتے ہوں میں اس گھر میں جانے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتی۔

لیکن اگر میں باقر ملک کے لیے رضامند ہوئی ہوں تو صرف فہد کی وجہ سے۔ پہلے مجھے اس میں صرف اپنے فہد کی جھلک نظر آتی تھی۔ اب خدا نے اسے میرے لیے پورے کا پورا فہد بنا دیا ہے۔ انسانیت کے ناطے صرف اور صرف انسانیت کے ناطے یہ شادی کر رہی ہوں تا کہ اس انسان کے ساتھ بے خبری میں اتنے سالوں تک جو خیانت ہوتی رہی اس کا کچھ تو ازالہ ہو سکے۔"

"کس نے کہا تم سے یہ سب۔ بولو۔ کس نے کہا۔ شرمین نے۔"

میں اس کی باتیں سن کر بپھر گیا۔ جنونی انداز میں اس کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ وہ زرد ہو کے پیچھے ہٹی۔

"مجھے ہاتھ مت لگانا عاشر......! میں شرمین نہیں۔"

اس نے پاس پڑا گلدان اٹھالیا، مجھے ایسے لگا جیسے اس نے مجھے چیلنج کیا ہو میرے اندر سے زبردست تحریک اٹھی، اسے مسل دینے کی۔ اس کا غرور چکنا چور کر دینے کی مگر میرے پیر جیسے کئی من وزنی برف کے تودوں میں تبدیل ہو گئے۔ میرے ہاتھ سن ہو کے میرے ہی پہلو میں گر گئے۔ میں نے آنکھیں پھیلا کے اسے دیکھا۔

"نہیں عاشر ملک! تم کبھی یہ نہیں کر پاؤ گے۔ کبھی نہیں، کسی کے ساتھ بھی نہیں، کم از کم زینیا عمر کے ساتھ تو کبھی نہیں۔"

میرے موبائل پہ بیپ بجنے لگی۔ ڈھیلے قدموں کے ساتھ پیچھے ہوتے ہوئے میں صوفے پہ گر گیا۔ بیپ ابھی بھی بج رہی تھی۔

"تم نے بہت برا کیا زینیا، بہت برا، میں اچھا نہیں ہوں، مجھے اعتراف ہے میں پوری سچائی اور ہمت کے ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن یہ اتنا گھناؤنا الزام، اتنا بڑا جھوٹ۔"

آج جب ضرب مجھ پہ پڑی تھی تو میں تڑپ گیا تھا۔

"کوئی عورت اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی عاشر! شرمین نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی تم سے محبت کرتی تھی لیکن تم دونوں کی شادی نہ ہو سکی کیونکہ تب تم اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ نہ تو یہ کوئی انوکھی کہانی تھی، نہ ہی ایسا پہلی بار ہوا تھا، ایسے سانحوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے ہیں، غم اٹھاتے ہیں خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے ہیں اور پھر راضی برضا ہو جاتے ہیں لیکن سانحہ تو یہ تھا عاشر ملک کہ تم نے قدرت سے راضی برضا ہونے سے انکار کر دیا۔

تم اپنے ماں اور بھائی کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے اور وہ اپنے شوہر کا حق مارتی رہی اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے سب کچھ۔"

وہ کہتی رہی اور میں بے حس و بے حرکت سنتا رہا، بیپ اب بھی وقفے وقفے سے بج رہی تھی۔

"اس نے مجھے یہ تک بتا دیا ہے کہ فہد باقر کا نہیں بلکہ تمہارا خون ہے، تمہارے اور شرمین کے غلیظ مراسم کا نتیجہ۔"

یہ آخری الزام میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے ٹیبل پر پڑی چیزوں کو ہاتھ کے دھکے سے نیچے گرا ڈالا اور وحشت سے چیخ اٹھا۔ میرا

بس نہ چل رہا تھا کہ ساری کائنات درہم برہم کردوں۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی اتنی گندی بات منہ سے نکالنے کی، وہ میرے بھائی کا بیٹا ہے، میرے بھائی کا بیٹا، ہاں وہ میرا خون ہے مگر......''
میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن لفظ میرے لبوں تک آ کے ٹوٹ ٹوٹ گئے۔

''اور وہ بچہ جسے وہ اپنا سوتیلا بھائی بتاتی ہے اس کا اپنا ہے، جائز یا ناجائز یہ پتا نہیں۔''

میرے ہی کہے الفاظ نے میرے منہ پہ طمانچہ رسید کیا۔ اب زینیا کے طمانچے کا درد کم پڑ گیا۔

''وہ بھی تو اس کے باپ کا خون تھا جسے میں نے اسی کی اولاد کہہ دیا۔ کیا یہ کم گندی گالی تھی جو میں نے اسے دی بدلے میں، میں اس سے کہیں بڑھ کے ذلالت کا مستحق تھا۔''

میں نے ساری مزاحمت ترک کر دی اور چپ چاپ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ میرے لبوں پہ ایسی مجروح سی مسکراہٹ تھی جیسے کسی سپاہی کے ہونٹوں پہ تب ابھر آئے جب اس کا ہتھیار ڈالنے کا ارادہ نہ ہو مگر اس کے بازو بھی ہتھیاروں سمیت کٹ کے زمین پہ آ رہیں۔

اب میں جان گیا تھا کہ میرے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ شرمین نے نہیں کیا، میں جو سن رہا ہوں وہ زینیا نہیں کر رہی۔ یہ سب تو میرے اعمال کی سزا ہے۔

''اب خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی اور نئی کہانی گھڑ لو عاشر ملک!''

میرے موبائل کی بیپ پھر سے بجنے لگی۔ مجھے سب سنائی دے رہا تھا۔ سب کچھ، زینیا کی لعنت ملامت بھی۔ فون کی بیپ بھی۔ مگر یہ سب پس منظر میں گونج رہا تھا۔ میرے اندر سے سب سے بلند صدا جو تھی وہ یہ تھی۔

''عاشر ملک! آج تم چاروں شانے چت ہو گئے۔ جب تک تم صرف اپنے غرور کی تسکین کے لیے، اپنی اکڑ کے زعم میں اور اپنی خود پسندی کے نشے میں چور، وہ چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں کرتے رہے اللہ نے شاید تمہاری رسی دراز کر رکھی تھی۔ یا پھر وہ تمہیں کسی شریر اور ناسمجھ بچے کی رعایت دیتے ہوئے درگزر کرتا رہا لیکن جب تم نے خدا کے کام اپنے ہاتھ لینے شروع کیے تقدیر خود رقم کرنے کے لیے قلم سنبھال لیے تو یہ رسی تو اللہ نے کھینچنا ہی تھی۔ اب تم کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہو۔

وہ عام سی لڑکی جس کی ہار کا تماشا تم دیکھنے آئے تھے تم پہ تھوکر رہی ہے وہ عورت جسے تم نے محض اس لیے ٹریپ کیا کہ اس نے تم سے محبت کرنے کی جسارت کی۔ تمہیں اس کی اپنے بھائی سے بے وفائی پسند نہیں آئی اور تم نے فریب سے اسے بھائی کی زندگی سے دور کر دیا اور تمہاری یہ بات اللہ کو پسند نہیں آئی۔ سزا دینے کا اختیار تو صرف اس کو ہے وہ شرمین کو معاف کرتا، سیدھی راہ پہ لاتا، یا سزا دیتا۔ یہ تو اس کی مرضی تھی۔

زینیا کو اپنانے کی تم نے ہر ممکن کوشش کی، اس کوشش کا اختیار اللہ نے ہی تمہیں دیا تھا لیکن اس اختیار کو غلط استعمال کرنے کی اجازت تو نہیں دی تھی تم ایک بار تو اسے محبت سے جیتنے کی کوشش کرتے، اس کے انکار کی وجہ تو جاننے کی کوشش کرتے، شاید یہ بات پہلے کھل جاتی، تم اپنی صفائی پیش کر کے اس کا دل صاف کر لیتے۔

لیکن مانگنا، گڑگڑانا تمہارے لیے مشکل تھا۔ یہ سوچنا آسان تھا کہ اگر وہ میری نہ ہوسکی تو کسی اور کا بننے بھی نہ دوں گا تم تقدیر لکھنے چلے تھے تو اب تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانا ضروری تھا۔''

میں چپ چاپ آنکھیں بند کیے یہ طعنے سنتا رہا۔ موبائل کی بیپ بھی اور زینیا کا سوال بھی۔

اچانک اس کی نظر زمین پہ پڑے مسلسل پکارتے موبائل پہ پڑی وہ چونک اٹھی۔

''شرمین......!'' اسکرین پہ شاید شرمین کا نمبر آ رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھی۔

میں نیم وا آنکھوں سے بے جان بیٹھا اسے لپک کے زمین سے فون اٹھاتے اور کان سے لگاتے دیکھتا رہا۔ اس نے آن کرتے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر وہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ شاید شرمین نے دوسری طرف سے آواز سننے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ اتنی دیر بعد رابطہ قائم ہونے پر ایک سیکنڈ کا انتظار کیے بغیر شروع ہوگئی۔ نجانے وہ کیا کہہ رہی تھی زینیا سنتی گئی اور اسکی پیشانی سے پسینہ پھوٹتا گیا۔ وہ سنتی گئی اور اس کی آنکھیں جھکتی گئیں۔ وہ سنتی گئی اور اس کے لب کپکپاتے گئے۔ کچھ دیر بعد اس نے موبائل آف کیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے سامنے والی نشست پر ٹیک لگالی۔ میں نے آنکھیں پھر سے موند لیں مجھ میں نہ تو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ شرمین نے اس سے اب اور کیا کہا اور نہ ہی اُٹھ کے یہاں سے جانے کی ہمت تھی۔

میں تو ایک الگ ہی کیفیت میں تھا۔

''اللہ اللہ، میرے اللہ مجھے معاف کردے......'' میں اسی قابل تھا مگر تو مجھے سنبھلنے کا ایک موقع دے۔'' مجھے ندامت تھی۔

''یا اللہ مجھے معاف کردے۔ کل تک کوئی مجھے اس قابل نہ لگتا تھا کہ میں اسے اپنے لیے جانتا، آج میں اس قابل نہیں کہ کسی کا ہوسکوں۔''

کتنے ہی لمحے گزر گئے تھے۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا زینیا بھی یہاں موجود ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے ہاتھ پہ کسی گیلے گیلے لمس کا احساس ہوا۔ کانپتی سی انگلیوں نے اسی طرح میرا ہاتھ سہلایا۔ جیسے بارہا سہلایا تھا۔ میں نے ذرا سی پلکیں کھول کے دیکھا۔ زینیا میرے سامنے کارپٹ پہ دوزانوں بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں پتا نہیں کیوں دھندلی سی ہو رہی تھیں مجھے اس کے لبوں پہ کوئی مسکراہٹ نظر نہ آئی۔ البتہ میرے ہاتھ پہ وہ لمس ابھی تک کلیاں چن رہا تھا۔ میں نے پلکیں جھپک کے پھر سے دیکھا۔ آنکھوں کی پتلیوں پہ تیرے بھرتے گدلے سے آنسو پلکوں کی سولی پہ ٹنگ گئے۔ منظر ذرا صاف ہوا۔ زینیا کی آنکھیں مجھ پہ جمی ہوئی تھیں مگر اس کے لب ساکت تھے۔ کسی پرلمس مسکراہٹ کی ہلکی سی رمق بھی نہ تھی۔

''تو پھر یہ کانپتی انگلیاں، وہ سہلانا۔'' میں نے چونک کے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس پہ زینیا کا ہاتھ دھرا تھا۔ میری روح پوری شدت سے کانپ گئی۔

''مجھے معاف کردو عاشر!'' بڑی دقت کے ساتھ اس نے رندھے گلے سے یہ چند الفاظ ادا کیے۔ میں پھر سے کپکپا اٹھا۔

''کیا یہ کوئی نئی سزا ہے اللہ، معافی مجھے اس سے مانگنا ہے۔''

''میں اس قابل تو نہیں عاشر لیکن مجھے معاف کردو۔ مجھے دوستی کا کچھ تو مان رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے اس کی باتوں پہ یقین کرنے

میں ذرا دیر نہ لگائی۔"

"میں تو یہ جان کر اس کی بات سننا چاہتی تھی کہ تمہیں مزید شرمندہ کر سکوں لیکن پتا ہے دوسری طرف وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی عاشر میں نے تمہیں ہرا دیا۔ تم کبھی ہار نہیں سکتے اس بات کا بڑا زعم ہے نا تمہیں۔ تم زینیا کو اپنانا چاہتے تھے۔ کیوں؟ اس میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں، میں نے اسے تم سے دور کر دیا۔ تم نے کبھی مجھے اور میری محبت کو قبول نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اس قابل کر دیا کہ کوئی تمہیں قبول نہ کرے۔ تم اپنے بھائی کی زندگی سے مجھے اس لیے دور کرنا چاہتے تھے کہ تمہارے خیال میں میں نہ اچھی عورت ہوں نہ اچھی بیوی، نہ اچھی ماں تو عاشر میں نے تمہارے اس بھائی سے یہ فخر بھی چھین لیا کہ وہ ایک باپ ہے۔ میں نے زینیا کو یہ یقین دلایا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان ناجائز تعلقات تھے، اور ان ہی تعلقات کا نتیجہ فہد ہے کیوں عاشر ملک! جھوٹ کیا تم ہی بول سکتے ہو۔ دیکھو میں نے کس صفائی سے یہ جھوٹ بولے ہیں کہ زینیا جیسی اچھی خاصی عقل مند لڑکی بھی ان بے بنیاد باتوں پہ ایمان لے آئی۔"

شرمین کی ساری باتیں دوہرا کے وہ خاموش ہو گئی۔

میں حیران تھا کیا میری توبہ اتنی جلدی قبول ہو گئی۔ کیا اللہ نے مجھے اتنی جلدی معاف کر دیا۔ کیا میرے دامن پہ لگا داغ اتنی جلدی مٹ گیا۔

"عاشر......! تم نے کبھی مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم مجھ سے......"

اب وقت آ گیا تھا جب مجھے اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنا تھا خدا کے آگے جھکنے کے بعد، گڑگڑانے کے بعد، مجھے احساس ہوا کہ معافی مانگ لینے میں تو نفع ہی نفع ہے۔ کیسے اللہ نے میری توبہ قبول کی اور مجھ پہ الزام لگانے والی نے خود اپنی زبان سے یہ الزام دھو بھی ڈالے۔ اب مجھے زینیا کے آگے بھی اپنا آپ کھول کے رکھ دینا تھا۔ سب کچھ بتا دینا تھا۔

"زینیا! بات اتنی سیدھی نہیں جتنی تم سمجھ رہی ہو۔" کتنی دیر خاموش رہنے کے بعد میں بولا تو مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

"شرمین نے تم سے سب کچھ جھوٹ بولا۔ لیکن کچھ سچ میں بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے درمیان نہ تو اس کی شادی سے پہلے کچھ تھا نہ بعد میں رہا۔ یہ بھی سچ ہے کہ فہد...... لیکن ایک سچ یہ بھی ہے کہ اس نے باقر بھائی جان سے طلاق میرے ورغلانے کے بعد ہی لی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس طلاق کے بعد میں اس سے شادی کر لوں گا۔"

میں رکا، وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ میرے ہاتھ پہ رکھا اس کا ہاتھ مجھے بولتے رہنے کی ہمت دلا رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ یہ ہاتھ پھر سے اُٹھا نہ لے۔

"لیکن اس کی ایک وجہ تھی ایک ٹھوس اور جائز وجہ۔ وہ جس ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری کا شکار تھی اس پہ اب میرا سمجھانا بجھانا بے اثر جاتا۔ میں نے اس کا علاج اسی کے طریقے سے کرنے کا سوچا۔

مجھے سب سے پہلے یہ احساس دلانے والی تم تھیں کہ شرمین مجھ میں دلچسپی رکھتی ہے۔ میں نے سوچا تو مجھے تمہارا اندازہ درست معلوم ہوا۔ میرے ایک ہی بار پوچھنے پہ شرمین نے اپنا آپ عیاں کر دیا۔ زینیا اب اس کا میرے بھائی کے ساتھ رہنا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ٹھیک نہیں تھا۔

جب تک اس نے خود پہ بند باندھ رکھے تھے تب بھی وہ خود کو اور اپنی ازدواجی زندگی کو سنبھالنے میں بری طرح ناکام رہی تھی اور بات کھل جانے کے بعد اظہار کو رستہ مل جانے کے بعد وہ کیسے خود پہ کنٹرول رکھتی۔ زخم جب ناسور بن جائے تو اس پہ مرہم نہیں لگاتے۔ کاٹ ڈالتے ہیں۔ میں نے اسے اپنی باتوں سے یہ یقین دلا دیا کہ اس کی طلاق کے بعد میں اس کی خواہش پوری کروں گا۔ اس نے طلاق لے لی، اب میرا بھائی ایک کمزور کردار کی عورت سے دور تھا اور میرا بھتیجا ایک نفس کی ماری ماں سے محروم، یہی میرا مقصد تھا۔ میں نے شرمین کے تقاضے پورے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے انتقام سے بھپر کے یہ قدم اٹھالیا۔''

''اور میں کتنی بے وقوف، آسانی سے اس کی باتوں میں آ گئی۔'' وہ بے چین ہو کے اٹھ بیٹھی۔

''اوہ! عاشر! یہ میں نے کیا کر دیا۔ تم مجھے معاف کر سکتے ہو نا۔ بولو کیا میں معافی کے قابل ہوں۔'' وہ پھر سے میرے قریب بیٹھ گئی۔ تاسف، بے قراری اور ملال نے اس پہ اکٹھا حملہ کر دیا تھا۔ معافی کے لفظ پہ میں مسکرا اٹھا۔

''غلطی تمہاری نہیں، یہ تو میرے اپنے اعمال تھے جو میرے آگے......''

کہتے کہتے میں رک سا گیا۔ مجھے اچانک یاد آ گیا کہ میرے اعمال میں صرف اتنا ہی درج نہیں، میں ابھی ابھی اور بھی بہت کچھ کر کے آ رہا ہوں۔ وہ تصویریں امی کے سامنے وہ زینیا کے بارے میں ہرزہ سرائی، سب مجھے یاد آنے لگا۔ میری ہڈیاں اندر سے تڑ تڑا کے ٹوٹنے لگیں۔

''میں نے اللہ سے معافی مانگی اور اس نے مجھے معاف کر دیا۔

لیکن انسان سے بڑا جابر اور کون ہے وہ ابھی ابھی جو کچھ میں کر کے آ رہا ہوں اس کا عمل تو نجانے کتنی صدیاں چلے گا۔ اور پتا نہیں زینیا کو مجھے معاف کرنے میں کتنی صدیاں لگیں گی۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ گلاب کھل رہے تھے۔ میں حیران سا ہو گیا۔

''عاشر......! تم نے میری اتنی بڑی غلطی کو کتنی آسانی سے بھلا دیا۔ تم سچ مچ بہت اچھے انسان ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید کبھی تمہیں معاف نہ کرتی۔ یہی دیکھ لو۔ ابھی ابھی صرف شرمین کی باتوں میں آ کے میں کیا فیصلہ کر بیٹھی تھی حالانکہ میں تو ہمیشہ تم سے......'' وہ پتا نہیں کیا کہنے جا رہی تھی۔ میرا دھیان تو اسی فقرے میں اٹک گیا۔

''اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو تمہیں کبھی معاف نہیں کرتی۔''

''میں نے ہمیشہ تمہیں چاہا ہے۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ کی تمنا کی ہے۔''

جھکی آنکھوں کے ساتھ اپنی مخصوص مسکراہٹ سے سہلاتے ہوئے اس نے ایک مہکتا سا اقرار کیا۔ وہ اقرار جسے سننے کی میں ضد باندھے بیٹھا تھا۔ اور آج یہ ہمت اس نے کر ڈالی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس ریشمی مسکراہٹ سے چھڑا لیا۔

''کیا ہوا عاشر......؟'' میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اور وہ ہراساں کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''عاشر......! کیا تم ابھی تک ناراض ہو میں مانتی ہوں کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے، کئی الزام لگائے، کیچڑ اچھالے، تو دکھ تو ہوتا ہے اور یہ دکھ تب ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جب یہ کیچڑ اس ہستی کی جانب سے پھینکا گیا ہو جس سے آپ سچ مچ محبت کرتے ہوں۔ عاشر اور مجھے

اعتراف ہے کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو مر جاتی لیکن تمہیں کبھی معاف نہ کرتی......لیکن تم مجھ جیسے عام سے انسان تو نہیں عاشر، تم تو مجھے معاف کر ہی سکتے ہو۔"

اس نے فریاد کی۔ میں پل بھر کو تھما۔

"دکھ تو ہوتا ہے اور یہ دکھ تب ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جب یہ کیچڑ اس ہستی کی جانب سے پھینکا گیا ہو جس سے آپ سچ مچ محبت کرتے ہوں۔" یہ فتویٰ ابھی اسی نے تو صادر کیا تھا۔ میں کیسے بھول جاتا۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں عاشر......!" اس کا یہ اقرار مجھے باور کرا رہا تھا کہ میرا دیا گیا یہ دکھ اسے کتنی ٹیس دے گا۔ میں کیسے رک جاتا۔

"اور میں تمہاری جگہ ہوتی تو مر جاتی لیکن تمہیں کبھی معاف نہ کرتی" فیصلہ تو اس نے سنا ہی دیا تھا۔ میں کیا معافی مانگتا، مجھے یہاں سے جانا ہی تھا اور میں چلا گیا۔

☆☆☆

''تم کہاں چلے گئے تھے عاشر؟''

میں جانتا تھا کسی نہ کسی دن مجھے اسی سوال کا سامنا تو کرنا پڑے گا اس کے باوجود میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں اس کا جواب کیا دوں گا۔ اور اب جب باقر بھائی جان مجھے گلے سے لگانے کے بعد یہ سوال کر رہے تھے تو مجھے اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ میں ایک بار پھر ان کے گلے لگ کے رونے لگا۔ انہوں نے بڑی حیرت سے میرے پژمردہ چہرے پہ پھیلتے آنسوؤں کو دیکھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے عاشر! میرے بھائی، میرے بچے، آخر تم بتاتے کیوں نہیں۔ ہم سب سے کیا غلطی ہوئی تھی جو تم ہمیں چھوڑ کے چلے گئے؟ میرے بچے، دل کی بات، دل میں رکھنے کی عادت کب چھوڑو گے۔'' میں تب بھی کچھ نہ بولا۔ بس آنسو بہاتا رہا۔

''تمہارے جانے کے بعد ہم لوگ کتنے پریشان ہوئے۔ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ ان تکلیف دہ دنوں کا ذکر بھی میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ میں نے ہر ہسپتال، تھانے کے چکر لگائے۔ مایوسی کی آخری حد تک جا کے میں نے یہاں تک سوچا کہ کہیں...... خدانخواستہ تم کسی حادثے کا...... لیکن امی جان نے مجھے ایسا نہ سوچنے دیا۔ انہیں یقین تھا کہ تم زندہ ہو مگر ناراض ہو۔ کسی نہ کسی بات پر روٹھ کے چھپ بیٹھے ہو۔ وہ آخری دن تک تمہیں یاد کرتی رہیں۔ پکارتی رہیں مگر تم نجانے کہاں چھپے بیٹھے تھے کہ ان کی صدا تم تک پہنچ ہی نہ سکی۔

میرے آنسوؤں میں پہلے سے بڑھ کے شدت آ گئی۔

''لیکن ان کے جانے کے بعد بھی میں نے تمہارا انتظار نہیں چھوڑا۔

پہلے امی جان نے میرے اندر کسی نہ کسی دن تمہارے لوٹ آنے کی امید زندہ رکھی۔ پھر ان کے جانے کے بعد زینیا نے میرے حوصلے نہ ٹوٹنے دیے۔ امی جان تمہیں منانے کی حسرت لیے اس دنیا سے چلی گئیں لیکن زینیا ابھی بھی......''

''زینیا...... زینیا عمر!'' میں ان کی بات کاٹ کر بے یقینی سے بولا۔

''ہاں زینیا عمر، امی کے آخری وقت میں اس نے ان کی بڑی خدمت کی اور بہت دعائیں لیں۔ اسے پورا یقین ہے کہ ایک روز یہ دعائیں رنگ لے آئیں گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگے۔ میں ہنوز الجھن کا شکار تھا۔

''وہ اب بھی...... اب بھی یہاں آتی ہے۔ اتنا سب ہونے کے بعد بھی......'' میں حیرت زدہ سا بیٹھا رہ گیا۔ گالوں پر بہتے میرے آنسو بھی حیران ہو کے تھم گئے۔

''عاشر...... ! یہ آنسو...... یہ ایک اور تبدیلی ہے جو میں تم میں دیکھ رہا ہوں تم تو کہتے تھے رونا بے بسی کی آخری حد کا اظہار ہوتا ہے اور عاشر ملک کبھی بے بس نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے کوئی حد آخری نہیں ہو سکتی۔''

''بھائی جان! میں جان گیا ہوں کہ بے بسی اور عاجزی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ آخری حد جسکے نہ ہونے کا مجھے بڑا زعم تھا، اندھا دھند، سرپٹ بھاگتے ہوئے اسی آخری حد سے ٹھوکر کھا کے میں نیچے گرا ہوں اور اب تک نیچے گرا ان آنسوؤں سے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے خدا سے دعا مانگ رہا ہوں کہ کب وہ مجھے معاف کر دے۔ میری خطائیں بخش دے۔ میری توبہ قبول فرما لے۔'' بھائی جان کچھ نہ سمجھے۔

''میرا خیال ہے تم آرام کرو، فہد نے تمہیں سونے تو نہیں دیا ہوگا۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور فہد کو بھی اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں مسکرا دیا۔ اور فہد کا ہاتھ تھام کے اسے روک لیا۔ بھائی جان کی حیرانی بجا تھی۔ لیکن وہ گزرے کل کی بات تھی۔ اس کل کی جس کل میں اس کے پاس بس ''میں'' ہی ''میں'' ہوتا تھا اور اب ان کے بھائی کی ''میں'' ہی تو ٹوٹ چکی تھی۔ اب تو بس ''تو ہی تو'' رہ گیا تھا۔ اس ایک لمحے کے انکشاف نے مجھے سراپا بدل دیا تھا۔

کتنی عجیب سی بات ہے کہ آنکھ کھلتے ہی میں نے خود پہ ہر طرح کی نعمتوں، آسائشوں کی برسات ہوتی دیکھی خدا کی ہر ہر نعمت کا مزا خوب لوٹا مگر اس سے انجان اور بے خبر رہ کے اور جب اس ذات واحد کو پہچانا تو خود سے ہی نفرت ہوگئی۔ اپنی اس خود ساختہ جلاوطنی میں میں نے اپنے نفس کو بھوکا پیاسا رکھ کے ملامت اور پچھتاوے کے ہزاروں کوڑے برسائے تھے۔ میں اپنے بھائی کے اس سوال کا کیا جواب دوں کہ میں کہاں رہا، میں نے کیا کیا۔ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ......

پہلا لفظ تھا اسم خدا کا، دوجا لفظ جدائی

بعد کی گھنول دار عبارت کچھ نہ سمجھ میں آئی

☆☆☆

زینیا کے گھر سے نکلنے کے بعد مجھ میں اتنی ہمت تک نہ تھی کہ میں اپنے گھر جا پاتا۔ میرا پاسپورٹ، سرٹیفکیٹس، چیک بکس، سب آفس میں تھا۔ وہ سب لے کر میں سیدھا اسلام آباد چلا گیا۔ میرا امریکہ کا ویزا پچھلے سال ہی پانچ برس کی معیاد کا لگا تھا۔ ٹکٹ لینے میں مجھے صرف دو دن لگے اور یہ دو دن میں نے ہوٹل کے بند کمرے میں خود کو یہ سمجھانے میں گزارے کہ معاف کر دینے والی ہستی صرف خداوند کریم کی ہے۔ اگر مجھے معافی مانگنا ہے تو اسی سے مانگنا ہے۔ زینیا تو کہہ ہی چکی تھی کہ میں تمہاری جگہ ہوتی تو تمہیں کبھی معاف نہ کرتی۔

یہی تو اللہ اور بندے کے درمیان رشتہ ہے کہ ہزار نافرمانیوں کے بعد بھی اس کا در بندے کے لیے کھلا ہی رہتا ہے جب کہ...... زینیا...... میں جب بھی یہ تصور کرتا کہ میرے جانے کے بعد کیا کیا ہوا ہو گا میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

جب امی جان اور باقر بھائی جان کو وہ تصاویر ملی ہوں گی جن میں زینیا کسی انجان شخص کے ساتھ حد درجہ بے تکلفی سے قریب ہے تو ان کا کیا حال ہوا ہو گا۔ امی جان تو فوراً یہ تصاویر زینیا کے منہ پہ مارنے چلی گئی ہوں گی۔

اور زینیا نے خود جب یہ تصاویر دیکھی ہوں گی تو اس کی اپنی حالت کیا ہو گی اور جب امی جان اسے بتائیں گی کہ عاشر اس کے کرتوتوں سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہے تو وہ فوراً سمجھ جائے گی کہ یہ حرکت بھی میری ہے۔ ویسے بھی اس کی یہ تصاویر میرے ہی آفس کے فنکشن میں لی گئی تھیں اور ان کے نیگیٹو بھی میرے ہی پاس تھے۔ میرے علاوہ اور کون ان نیگیٹوز کو غلط مقاصد سے استعمال کر سکتا ہے۔

اور میرا یہ راز کھل جانے کے بعد اس نے...... بس اس سے آگے میں اپنے تصور کو روک لیتا۔ سوچوں کے دروازے مضبوطی سے بند کر لیتا، ابھی اس جلاوطنی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ میرے دل کو اچانک ایک بے کلی نے آن گھیرا۔ وہ ہمک ہمک کے پاکستان کی طرف لپکنے لگا۔

بے تاب ہو کے میں نے چوری چھپے کچھ اور ذرائع سے وہاں کی خیر خبر لینا چاہی اور پہلی خبر جو ملی وہ یہ تھی کہ امی جان کی وفات کو پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اٹھارہ مہینوں کے بعد میں نے خود پہ اوڑھی چادر ذرا سی سرکا کے باہر دیکھنا چاہا تھا اور اسی ذرا سی اوٹ سے اتنی گرم لو کے تھپیڑے پڑے کہ میں نے گھبرا کے خود کو اوڑھ ڈھانپ لیا۔ اور کئی سال تک پھر دوبارہ کوئی خبر لینے کی کوشش نہ کی۔

اسی روپوشی کے عالم میں کئی سال گزر گئے کہ ایک دن اچانک نوید سے ملاقات ہوئی۔ اس نے شادی کر لی تھی۔ اس کی خوبصورت بیوی اور پیاری سی بچی بھی اس کے ہمراہ تھی اس لیے ایک حد میں رہتے ہوئے وہ مجھے گالیاں دے سکا۔ اس نے دیں...... میں ڈر رہا تھا کہ اس کے سوالوں کے جواب کیا دوں گا لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ البتہ زبردستی میرا ایڈریس ضرور لیا۔ میں نے اس کی منتیں کی۔

''تمہیں قسم ہے نوید بھائی جان کو میرا پتا مت دینا۔ میں امی جان کی وفات تک پر تو وہاں جا نہ سکا اب کس منہ سے۔''

اور اس نے وعدہ بھی کر لیا بلکہ شاید کسی حد تک نبھایا بھی۔ اس نے بھائی جان کو میرے امریکہ میں ہونے کی اطلاع نہیں دی تھی لیکن اس کے پاکستان جانے کے صرف ایک مہینے بعد ملنے والے زینیا کے خط نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اسے میرا ایڈریس کہاں سے ملا۔ اور اس خط نے مجھے کچھ ایسا الجھایا کہ میں پہلی فرصت میں پاکستان پہنچنے کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکا۔

''میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔'' اور ساتھ ہی مجھے اس کے وہ الفاظ بھی یاد آئے۔

''سرخ پھول تو دو ہی مواقع پہ جچتے ہیں، یا شادی پہ یا میت پہ......''

اور شاید وہ شادی ہی کر رہی تھی اور مجھے میرا عہد یاد دلانے کا بھی اس کا بھی یہی مقصد رہا ہو گا کہ وہ مجھے یہ جتا سکے کہ کسی کے لاکھ برا چاہنے سے برا ہو تو نہیں جاتا اور میں اس کے ساتھ کچھ اچھا ہونے کی دعائیں کرتا فوراً چلا آیا۔ کسی دوسرے موقع...... میں نے سر جھٹک دیا۔ ایسے کیا ہو سکتا ہے مجھے باقر بھائی جان کی بات بھی ڈسٹرب کر رہی تھی۔

''آخری وقت اس نے ان کی بڑی خدمت کی اور بہت دعائیں لیں۔''

فہد نے بھی اس کے بارے میں جتنی باتیں کیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ گزرے سالوں نے اسے زینیا کے اور قریب کر دیا تھا اور وہ تو اس پہ خاصی حد تک انحصار کرنے لگا تھا۔

اگلے روز جب میں نوید سے ملنے اس کے آفس گیا جو کبھی میرا بھی آفس تھا تو وہ مجھے دیکھ کے نہ چونکا نہ حیران ہوا۔

''آؤ عاشر! میں کئی روز سے تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے آگے بڑھ کے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ اس کی گرمجوشی نے مجھے گلہ کرنے پہ مجبور کیا۔

''نوید، زینیا کو میرا ایڈریس تم نے دیا؟''

''ہاں۔'' بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس نے اقرار کر لیا۔

''مگر کیوں......'' میں احتجاجاً چیخ اٹھا۔

''پہلے تم یہ بکو کہ تم کیوں چھپتے پھر رہے ہو......؟ کس بات کی سزا دے رہے ہو زینیا کو، اپنے بھائی کو......؟''

''تم نہیں جانتے نوید تم کچھ نہیں جانتے۔ اگر تم جان جاؤ تو میرے لیے اس سے کڑی سزا تجویز کرتے۔ ہاں یہ سزا میں خود ہی کو تو دے رہا ہوں۔''

''نہیں یہ سزا تم ان سب کو دے رہے ہو جو تم سے محبت کرتے ہیں۔ اور ہاں عاشر میں جانتا ہوں سب جانتا ہوں۔'' اس نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ میں پہلے حیران ہوا، پھر شرم سے زمین میں گڑ گیا۔

''تو کیا زینیا نے تمہیں بھی سب کچھ بتا دیا......''

''نہیں بلکہ اصل میں تو میں نے زینیا کو......'' وہ رکا پھر کی چین اٹھا کے مجھے بھی اشارہ کیا۔

''چلو اٹھو، باہر نکلتے ہیں، آفس میں ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔'' میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔

''جانتے ہو اس روز، اس روز جب تم جانے سے پہلے مجھ سے آخری بار ملے تھے۔'' اس نے اپنی کار ڈیوس روڈ سے نکال کر ریگل چوک پر ڈال دی۔

''ہاں لیکن تب تک میں نہیں جانتا تھا کہ میں کچھ گھنٹوں بعد کس طویل سفر پہ نکلنے والا ہوں۔''

''لیکن میں آدھ گھنٹے بعد ہی جان گیا تھا کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو۔'' اب کار چوبرجی سے ٹرن لے کر فیروز پور روڈ پہ آ گئی تھی۔

''کیا مطلب......؟''

''یاد ہے اس دن تم نے مجھے دو لفافے پکڑائے تھے اور کہا تھا کہ دو بجے کوریئر سروس کا نمائندہ آ کے یہ لفافے پک کرے گا۔ تم نے مجھے اس کی خاص حفاظت کی تاکید کی تھی۔ میں نے اُلٹ پلٹ کے دیکھا ایک پہ تمہارے گھر کا ایڈریس تھا۔ دوسرے پہ باقر بھائی جان کے آفس کا۔ لیکن دوسری طرف بھیجنے والے کا کوئی نام و پتہ نہیں تھا۔ میں نے بڑی حیرت سے تم سے اس رازداری کی وجہ دریافت کی اور تم نے بڑے پراسرار طریقے سے مسکراتے ہوئے کہا کہ تم انہیں کوئی سرپرائز دینا چاہتے ہو۔ میں نے بھی زیادہ نہ کریدا۔ تمہاری اوٹ پٹانگ سرپھری حرکتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔''

کار اب وحدت روڈ سے گزر رہی تھی۔ میری خالی خالی نظریں جانے پہچانے سائن بورڈز کو سرسری سا دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ منحوس دن پوری سفاکی کے ساتھ ذہن کے پردے پر میری تمام تر منحوس حرکات کے ساتھ ابھر رہا تھا۔

''اس دن تصاویر پیک کرنے کے بعد میں نے اپنی مخصوص کوریئر سروس کو فون کیا اسے دو بجے آنا تھا۔ جب کہ ابھی...... میں نے ٹائم دیکھا اور سوچا کہ کہیں اس کے انتظار میں دیر نہ ہو جائے۔ میں آج ہی زینیا سے آخری ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ آفس نہیں آئی تھی۔ کل تک بہت دیر ہو جاتی کچھ گھنٹوں بعد میں اسے ہرانے والا تھا اور مجھے تو اس کو ہارنے سے کچھ دیر پہلے دیکھنا تھا۔ میں نے تصاویر والا لفافہ نوید کے حوالے کیا اور خود زینیا کے گھر چلا گیا۔ نوید کی ذمہ دارانہ فطرت پر مجھے یقین تھا اور کوریئر سروس کی بروقت سروس پہ بھی بھروسا تھا۔

جس وقت میں شکستگی سے دوچار، شرم اور ذلت سمیٹے اس کے گھر سے نکلا اس وقت میرے اندازے کے مطابق وہ تصاویر اپنے مقام پہ پہنچ چکی تھیں اور میں چوروں کی طرح اپنا منہ چھپا کے وہاں سے بھاگ نکلا۔'' ''کیا وہ تصاویر......؟'' میں نے گردن موڑ کے نوید کو دیکھا۔ کار اب شیخ زید ہاسپٹل کے آگے سے گزر رہی تھی۔

''وہ لفافے میرے بالکل سامنے دھرے تھے اور میں نیوز پیپر کا مطالعہ کرتے ہوئے کافی پی رہا تھا کہ اچانک پتا نہیں کیسے کافی میرے ہاتھ کے بالکل قریب رکھے لفافے پہ چھلک گئی۔ یہ تمہارے گھر کے ایڈریس والا لفافہ تھا۔ کافی کچھ اس بری طرح چھلکی تھی کہ ایڈریس تقریباً چھپ ہی گیا تھا اور مشکل سے بھی پڑھا نہ جا رہا تھا میں نے وہ لفافہ تبدیل کرنے کا سوچتے ہوئے سائیڈ دراز سے ایک نیا لفافہ نکالا اور اس پہ تمہارے گھر کا ایڈریس لکھا، جیسے ہی اس لفافے کے اندر موجود تمہارا ''سرپرائز'' نکالنے کے لیے میں نے اسے چاک کیا، چند تصاویر پھسل کے میری گود میں آن گریں۔ ان چار تصاویر میں سے تین کی پشت میری جانب تھی جب کہ ایک تصویر میں زینیا ہاشمی گروپ آف انڈسٹریز کے بہروز کے گلے کا ہار بنی مجھے حیرت زدہ کر گئی۔

حیرت کی ایک وجہ تو زینیا عمر جیسی لڑکی کی ایسی تصویر کا ہونا تھا۔

حیرت کی دوسری وجہ ان تصاویر کا تمہارے پاس ہونا تھا۔

اور حیرت کی تیسری وجہ یہ تھی کہ ان تصویروں کو تم اپنے ہی گھر کیوں بھیج رہے تھے۔

میں نے تجسس کا شکار ہو کے دوسرا لفافہ بھی کھول لیا اس میں بھی یہی کچھ تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن میری سوچ کو کوئی سرا ہاتھ نہ لگ

رہا تھا۔ ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی جس کو بنیاد بنا کے تم ایسا کرتے۔ میں نے وہ تصاویر کوریئر سروس والے کے حوالے نہ کیں۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے تم کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو۔ تمہارے ذاتی معاملے کا بھید لینے پہ چاہے مجھے تمہاری کتنی ہی بری بھلی کیوں نہ سننی پڑیں میں تم سے اصل بات اگلوا کے رہوں گا۔ آخر یہ ایک لڑکی کی عزت کا معاملہ تھا۔

پہلے تو مجھے ان تصاویر کی حقیقت کے بارے میں ہی شک وشبہ تھا اور بالفرض اگر ایسا سچ بھی ہوتا تو تمہیں اس کو مشتہر کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ تمہاری کچھ نہ لگتی تھی۔ تمہارا اس کی اچھائی برائی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

میں تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں آئے نہ اس دن نہ اس سے اگلے دن میرا انتظار لمبا ہوتا چلا گیا۔ باقر بھائی اور چچی کئی بار مجھ سے پوچھنے آئے۔ میں کیا کہتا، میں خود لاعلم تھا۔ دوسری طرف زینیا کی عروج پہ پہنچی بے تابی مجھے اور حیران کر رہی تھی۔ اسے تمہارا انتظار کیوں تھا؟'' نوید نے اسٹیرنگ گھمایا۔ گاڑی کیمپس کی نہر کے کنارے سبک خرامی سے رواں دواں تھی۔

''کچھ روز بعد چچی سے بھی علم ہوا کہ وہ باقر بھائی کے لیے زینیا میں انٹرسٹڈ تھیں لیکن زینیا نے پہلے اقرار اور پھر انکار کر کے یہ باب ہی ختم کر دیا۔ یہ انکشاف مجھے کچھ اور تحقیق پہ مجبور کر گیا۔ زینیا نے ریزائن دے دیا تھا مگر وہ تواتر سے تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے مجھ سے مسلسل رابطے میں تھی۔ ایک روز میں نے اسے دھر لیا وہ بے حد کمزور ہو رہی تھی۔ جذباتی طور پر بھی اور نفسیاتی طور پر بھی، زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکی اور اس نے میرے سامنے اقرار کر لیا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور اسی سے کسی بات پر ناراض ہو کے تم نے خود کو لاپتا کر لیا ہے۔'' اتنا کہہ کر نوید نے میری طرف دیکھا۔

''کیا اب بھی میں نہ سمجھتا تم اسے چاہتے تھے اور وہ تمہیں اگر چچی کی وجہ سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو رہی تھی تو اسے طریقے سے بھی سلجھایا جا سکتا تھا۔ تم ان سے بات تو کر کے دیکھتے، کیا وہ تمہاری نہ مانتیں۔ آخر تم نے یہ کیوں کیا۔ کس لیے۔ اگر وہ تصاویر...... سوچو ذرا زینیا پہ کیا گزرتی آخر اتنی سیدھی سادی کہانی میں تم نے اتنی پیچیدگیاں کس لیے پیدا کیں۔''

''بات اتنی سادہ نہیں تھی۔'' میں نے کہا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ کچھ پیچیدگیاں میں نے خود پیدا کیں اور کچھ خود بخود پیدا ہوتی چلی گئیں۔

''کیوں نہیں تھی۔ تم اس سے محبت کرتے تھے۔ ہے نا۔ بس اتنا کہہ دیتے چچی سے۔ اس فضول حرکت کی کیا وجہ تھی۔ یہ محبت کا کون سا انداز ہے۔''

''محبت......! میں نے محبت کب کی نوید۔ میں تو پلاننگ کرتا رہا ایک نفع بخش سودے کے لیے دو اور دو چار کرنے کی سوچتا رہا۔ جب مجھے خسارے کا اندیشہ ہوا تو میں نے بے ایمانی کر کے منافع خوری کا سوچا۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''نہیں عاشر! یہ محبت ہی تھی۔ تمہیں پتا بعد میں چلا احمق انسان تمہیں اس سے محبت نہ ہوتی تو اس کے لیے ایک بار برا سوچ لینے کی غلطی تمہیں اتنا نہ ستاتی کہ تم یوں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ اب بھی وقت ہے لوٹ جاؤ اس کے پاس وہ تمہارے انتظار میں ہے۔''

''لوٹ جاؤں، اس کے پاس، وہ میرے انتظار میں ہے۔ اگر میں تمہارے اس دلاسے کو سچ بھی جان لوں تو نوید جب وہ میری سچائی جان لے گی تو تب۔ تب کیا اسے اپنے اس انتظار پہ افسوس نہ ہو گا۔''

’’کیسے جانے گی۔ کون بتائے گا اسے؟ چچی اور بھائی جان تک یہ سارا معاملہ کبھی پہنچا ہی نہیں۔ میں...... میں وہ تصاویر اسی دن جلا بیٹھا تھا جس دن زینیا کے اقرار پہ میں نے یہ ساری گتھی سلجھائی تھی۔ اور کون ہے۔ کیا تم۔ تم ہرگز اسے یہ نہیں بتاؤ گے ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ وہ پہلے ہی ٹوٹی ہوئی ہے۔ بکھری ہوئی ہے اسے یہ غلط فہمی ہے کہ تم اس کی غلطی معاف نہیں کر پائے۔ وہ تو خود پچھتاوؤں میں گھری ہوئی ہے۔‘‘

’’کیا واقعی اللہ نے میری توبہ قبول کر لی ہے۔ کیا واقعی...... مجھے اس نے معاف کر دیا ہے۔ نوید میں نے سوچا تھا جب میں اپنی زندگی میں کوئی خوش کن خبر سنوں گا تو جان جاؤں گا میرے سجدے رائیگاں نہیں گئے۔ میری دعائیں قبول ہو گئیں اور اس سے بڑی خوش خبری میرے لیے اور کیا ہو گی کہ وہ گناہ جس کے کرنے کے میں تمام ارادے سے آیا تھا، خدا نے وہ گناہ میرے نصیبوں میں ہونا لکھا ہی نہیں تھا۔‘‘

’’وہ اللہ ہے عاشر...... اللہ...... ستر ماؤں سے بڑھ کے پیار دینے والا، تم نے نجانے کس دل سے اسے یاد کیا کہ اس نے اپنی رحمت سے تمہارے دامن پہ گناہ کا یہ داغ لگنے ہی نہ دیا۔ اور اتنے سال...... درمیان کے یہ اتنے سال شاید تمہیں کندن بنانے کے لیے تھے پہلے بھی تم نے محبت کی تھی۔ اب بھی تم محبت کرتے ہو لیکن اب تم صرف محبت کر ہی نہیں سکتے۔ اسے نبھا بھی سکتے ہو تم نے خوب سزا بھگت لی۔ اور انجانے میں اس لڑکی کو بھی دے دی۔ اب لوٹ چلو...... اور اس کی سزا بھی ختم کر دو...... اس کے دل سے یہ پچھتاوا جاتا رہے کہ وہ تمہارا دل دکھانے کا سبب بنی۔‘‘

’’کتنی عجیب سی بات ہے نا نوید...... میں تو اپنے کیے کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس سے منہ چھپائے پھر رہا تھا۔ اس سے معافی نہ ملنے کا خوف مجھے بھگائے رکھا اور وہ...... وہ بھی اتنے ہی سال اسی آگ میں جلتی رہی۔ اسے بھی یہی پچھتاوے تھے۔ کتنی عجیب سی بات ہے ہم دور رہے، انجان رہے۔ لیکن ہمارے جذبات ہمارے احساسات ایک رہے۔‘‘

میں نے پرسکون ہو کے اپنا سر ٹیک لیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ نوید نے کیمپس سے اب کار ڈاکٹرز ہاسپٹل کی طرف موڑ لی تھی۔ یہ وہی ہاسپٹل تھا جہاں سے واک کرتے ہوئے میں زینیا کو پہلی بار اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ میں سمجھ گیا، نوید مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔

اداسی تم اسے کہنا

اکیلا تو نہیں دکھ میں

تیرا بچھڑا ہوا

اجڑے ہوئے شہروں میں اکثر بھاگتا پھرتا ہے

اکثر بھاگتا پھرتا ہے

اور اداسی

تم اسے کہنا

تمہی دکھ میں نہیں ہو

ہم بھی اپنی راکھ

ہاتھوں میں لیے
سسکیاں لیتی ہوئی
تنہائیوں کے بال کھولے بین کرتے ہیں

''بس اب.....بس کر یہ تنہائیوں کے نوحے، اداسیوں کی باتیں۔'' نوید نے میری خود کلامی پہ مجھے ٹوکا۔

''بوتھا درست کر لے اور جیسا میں نے کہا ہے ویسے ہی کر۔ جب اللہ کو تیرا پردہ منظور ہے تو کیوں اپنے ہاتھوں اپنے لیے گڑھے کھودتا ہے۔ وہ صرف رحیم و کریم ہی نہیں، ستار و غفار بھی ہے۔ تمام عیوب ڈھک دینے والا، خبردار جو تم نے کوئی حماقت کرنے کی کوشش کی۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے اسے روکا۔ ''ذرا یہاں سے ٹرن لینا۔'' وہ اس اسٹریٹ میں مڑنے ہی والا تھا جب میں نے اسے سامنے کی مارکیٹ تک جانے کا اشارہ دیا۔

''وہاں کیوں؟'' وہ چونک کے مجھے گھورنے لگا۔ میرے لبوں پہ عرصے بعد..... یا شاید پہلی بار ایک سچی مسکراہٹ کی دھوپ پھیلی۔

''وہاں.....فلاور شاپ پہ..... مجھے گلاب لینے ہیں۔ سرخ گلاب..... زینیا کے لیے۔ سارے کے سارے گلاب.....''

